سراج انور
نیلی
دُنیا

نیلی دُنیا

ایک ناول

سراج انور

کھلونا بُک ڈپو

آصف علی روڈ نئی دہلی

نوشتہ

انٹرنیٹ ایڈیشن

۲۰۲۵
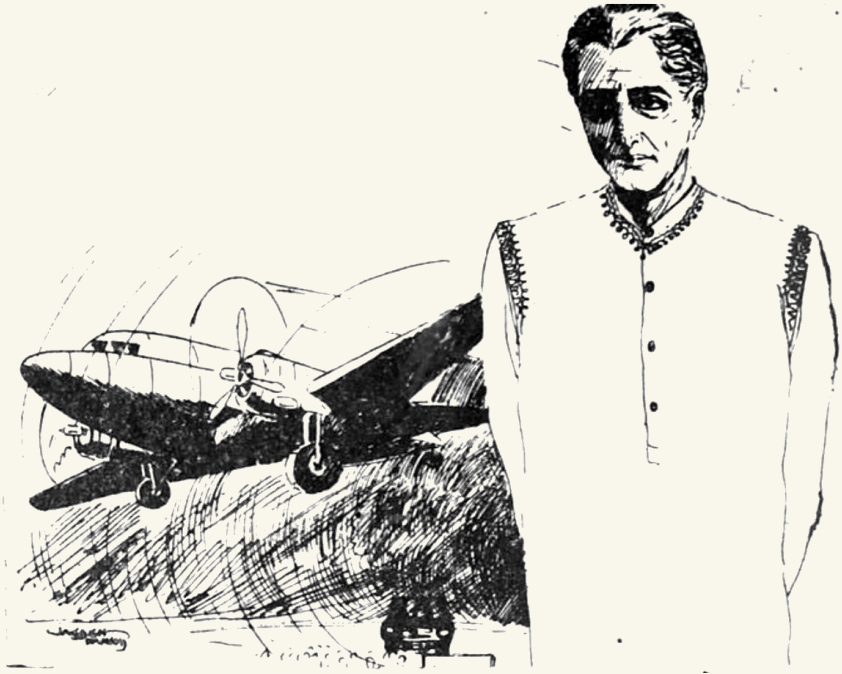
انسان سوچتا کُچھ ہے اور ہوتا کُچھ ہے۔ ہم اپنے دِل میں کُچھ بھی طے کر لیں لیکن اگر خُدا کو منظور نہیں ہے تو ہماری ہر بات اُلٹی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے انسان بے بس ہے اور اس قادرِ مُطلق کے آگے اپنا سر جھُکانے کے لیے مجبور ہے، میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تقریباً ایک سال پہلے میں نے بھی اپنے دِل میں تہیّہ کر لیا تھا کہ اب ہرگز کسی سفر پر نہ جاؤں گا۔

خواہ کتنا ہی اہم واقعہ کیوں پیش نہ آجائے۔ مگر تقدیر کے آگے کس کی چلی ہے، خُدا تعالیٰ کی مرضی یہی تھی کہ میں ایک بار پھر طویل اور خطرناک سفر کروں اور وہ ہزاروں آفتیں اور مصیبتیں جھیلوں جو حقیقت میں میری تقدیر بن کر رہ گئی ہیں۔

اپنے بارے میں میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں فیروز ہوں۔ میرے خیال میں میرا نام میرا سب سے بڑا تعارف ہے۔ جن لوگوں نے یہ نام سُن رکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ میرے پیروں میں بلّیاں بندھی ہوئی ہیں اور میں کسی بھی جگہ ٹِک کر نہیں بیٹھ سکتا۔ میری اس بات کا ثبوت میرے وہ پچھلے دو سفر نامے ہیں جنہیں میں کُچھ سال پہلے لکھ چکا ہوں، اور جن کا نام "خوف ناک جزیرہ" اور "کالی دُنیا" ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنے ان سفر ناموں میں کیا لکھا تھا اور میں کِن کِن مُشکلات اور تکلیفوں سے دوچار ہوا تھا؟ اُن لوگوں کے لیے جو پہلی بار میرا یہ نیا سفر "نیلی دُنیا" پڑھ رہے ہیں،

مختصراً پہلے دو سفر ناموں کے بارے میں جاننا بے حد ضروری ہے کیوں
کہ اس کے بغیر نہ تو وہ میری اس ہیبت ناک اور بھیانک داستان کا لُطف
اٹھا سکتے ہیں اور نہ اُن کرداروں سے تعارف حاصل کر سکتے ہیں جن کو آگے
چل کر میری اس پُراسرار داستان میں بہت کُچھ کرنا ہے۔

میں ایک معمولی سا لڑکا تھا، جب میں نے پہلی بار ایک پارٹی کے ساتھ سمندر
کا سفر کیا۔ اس سفر میں ہمیں ایک ڈوبنے اور اُبھرنے والے جزیرے کی
تلاش تھی جہاں ایک قیمتی دھات سونا بڑی مقدار میں پائی جاتی تھی،
ہماری پارٹی میں ایک امریکی شخص جان ولیم، ایک نیگرو جیک اور ایک
ہندوستانی کُبڑا چیتن شامل تھے، اس سفر میں مُجھے جو مُصیبتیں اور دِل دہلا
دینے والے واقعات پیش آئے۔۔۔ ان کی تفصیل تو آپ ناول "خوفناک
جزیرہ" میں پڑھ سکتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ہزاروں آفتیں جھیلنے کے بعد
میں ایک معمولی سے لڑکے سے ایک جہاز راں کمپنی کا مالک بن گیا۔ جان

کی میں اپنے باپ کی طرح عزّت کرتا تھا۔ میری زندگی ہنسی خُوشی بسر ہو رہی تھی، کہ ایک دِن مُجھے معلوم ہوا کہ جان کسی نامعلوم مقام پر موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میرے دو مددگار سوامی اور بلونت تھے۔ میں انہیں ساتھ لے کر دوسری بار پھر ایک سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ میرے دونوں بچّے اختر اور نجمہ بھی میرے ساتھ تھے۔ اس سفر میں میری ملاقات تین خطرناک دُشمنوں سے ہوئی۔ یہ دُشمن جیگا، جکاری اور زوک تھے۔ جیگا سیّارہ زہرہ کا ایک سائنس داں تھا جو اپنے غلاموں جکاری اور زوک کے ہمراہ ہماری اس حسین دُنیا کو تباہ کرنے آیا تھا۔ مگر انجام کار میرے بچّوں اختر اور نجمہ کے ہاتھوں ختم ہوا۔ اس سفر کی تفصیل آپ میرے دوسرے سفر نامے "کالی دُنیا" میں پڑھ سکتے ہیں۔

یہ تھا میرا اور میرے پچھلے دو سفر ناموں کا ہلکا سا تعارف۔ جب ہی میں نے یہ عہد کیا تھا کہ ان دو سفروں میں مجھے جو پریشانیاں اور آفتیں اٹھانی

پڑیں تھیں انہیں دیکھتے ہوئے اب میں سفر نہیں کروں گا۔ مگر جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ تقدیر میرے حال پر کھڑی ہنس رہی تھی۔ مُجھے کیا معلوم تھا کہ نجمہ کی شادی کے پورے ایک سال بعد میرا یہ عہد وقت کے دھارے میں اس طرح بہہ جائے گا جیسے ایک معمولی سا تنکا ندی کے پر شور پانی کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔

میں شاید دُنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہوں، ایسا شخص جسے کوئی غم نہیں، کوئی فکر نہیں، جو ہر وقت خوش و خرم رہتا ہے، یقین جانئے مُجھے اپنی زندگی پر رشک ہے۔ میری زندگی اس سے پہلے بھی دوسروں کے کام آئی ہے اور اب بھی آتی ہے۔ میرے ہلکے سے اشارے پر ملازموں کی پوری فوج سر خم کر کے میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ مُجھے سمندر کا بادشاہ کہا جاتا ہے، مشہور یہ ہے کہ ہوا میرے تابع ہے، میں جس طرف ہوا کو حُکم دوں گا، اُدھر ہی چلے گی، اور میرے جہاز سمندر کا وسیع

سینہ چیرتے ہوئے قطب شمالی سے قطب جنوبی تک جا سکیں گے۔ کوئی شخص میری بات نہیں ٹال سکتا، غرض میرے بارے میں اتنی غَلط فہمی لوگوں کو ہے کہ مجُھے خود حیرت ہوتی ہے۔

لیکن کیا درحقیقت مَیں ایسا ہی ہوں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ دُنیا جہان کے خزانے میرے قدموں تلے بکھرے رہتے ہیں مگر جسے دِل کا سکون کہتے ہیں وہ مجُھے بالکل میسّر نہیں ہے؟ یقین مانیے یہ بالکل سچ ہے۔ اتنا دولت مند ہوتے ہوئے بھی مجُھے اب ہر لمحہ ایک فکر دامن گیر رہتی ہے، یہی کہ کیا میں ہمیشہ اسی قسم کے بھیانک اور پُر خطر سفر کرتا رہوں گا؟ کیا میری زندگی ان ہی آفتوں میں بسر ہوگی؟ کیا مجُھے اپنی لڑکی نجمہ، اپنے داماد امجد اور اپنے ہونہار اور لائق فرزند اختر کا سُکھ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔۔۔!

آپ نے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ جب سے میں نے اپنی یہ لرزہ خیز، بھیانک اور ہیبت ناک داستان لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے، اس وقت سے لے کر

اس سطر تک جو آپ کی نظروں کے سامنے ہے، میں کوئی کام کی بات نہیں کہہ سکا۔ آپ حضرات داستان پڑھنے کے اشتیاق میں صفحے پلٹ رہے ہیں اور میں غیر ضروری باتوں سے یہ اوراق سیاہ کر رہا ہوں۔ مجُھے یقین ہے کہ آپ یہ جان کر مجُھے ضرور معاف کر دیں گے کہ دراصل میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ کس طرح وہ باتیں بیان کروں جنہیں یاد کر کے میرا کلیجہ مُونہہ کو آتا ہے، جن کا خیال کرتے ہی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دہشت کے باعث میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ خوف کی وجہ سے میرا چہرہ سفید ہو جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں، یقین جانئے میں خود میں وہ حوصلہ اور ہمّت ہی نہیں پاتا کہ قلم اٹھاؤں۔

لیکن قلم تو مجُھے اٹھانا ہے، میری عادت ہے کہ میں اپنی ڈائری لکھتا ہوں، اور اسی ڈائری سے مدد لے کر میں اپنے اس سفر نامے کی ابتدا کر رہا ہوں۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی کی یہ داستانیں ادھوری رہ جائیں۔ جو کُچھ بھی مُجھ پر بیتی ہے وہ سب کی سب بیان کر دینا چاہ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ لوگ مُجھے کم زور دِل کا سمجھیں اور سوچیں کہ شاید اسی ڈر کی وجہ سے میں کُچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے اور ان واقعات سے دوچار ہوئے ہوتے جِن سے میں ہوا ہوں تو معاف کیجیئے گا، آپ یہ سطریں لکھنے کے لیے خود کو زندہ ہی نہ پاتے۔

اب میں دِل کو تھام کر اس بھیانک کہانی کا آغاز کرتا ہوں، جسے ختم کرنے سے پہلے نہ جانے میں کتنی بار کانپوں گا، کتنی مرتبہ دہشت کی تھرتھری میرے جسم میں پیدا ہوگی اور کتنی ہی بار میں گھبرا کر قلم رکھ دوں گا اور کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھوں گا کہ کہیں کوئی بھیانک خطرہ، کوئی ہیبت ناک چیز آہستہ آہستہ میری طرف رینگ تو نہیں رہی ہے؟ ایسی حالت

میں اگر میرے قلم سے کوئی لغزش ہو جائے یا عبارت میں بے ربطی پیدا ہو جائے تو آپ مُجھے فراخ دلی سے معاف کر دیجئے گا۔

گلابی جاڑوں کا موسم تھا، ہلکی ہلکی سی ٹھنڈک بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ بارشیں ختم ہو چکی تھیں، اس لیے سبزے پر نکھار آ گیا تھا۔ خوبصورت اور دلکش پھول پودوں میں کھلتے ہوئے بڑے پیارے لگتے تھے۔ میں اپنے عالی شان محل کے باغ میں بیٹھا ہوا رنگ برنگی تتلیوں کو پھولوں پر منڈلاتے دیکھ رہا تھا۔ میرے باوردی ملازم مُجھ سے کافی دُور ہاتھ باندھے ہوئے ادب کے ساتھ کھڑے تھے اور میرے کسی بھی حُکم کو بجالانے کے لیے پوری طرح تیّار تھے۔ ایک تِتلی کا تعاقُب کرتے ہوئی میری نظر جیسے ہی اوپر اٹھی، اچانک پیچھے سے دو ہاتھ میری آنکھوں پر آ کر جم گئے اور پھر آواز آئی۔ ”بتائیے تو میں کون ہوں۔“

میں نے مسکرا کر وہ ہاتھ ہٹائے اور کہا۔ "تم میرے بہت ہی پیارے پیارے اور نالائق بیٹے اختر ہو۔"

اختر کِھلکھِلا کر ہنس پڑا اور پھر میرے سامنے آ کر بولا۔ "ابّا جی۔۔ آپ تتلیوں کو دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں بیٹے۔۔ مُجھے یہ رنگ برنگے اڑتے ہوئے پھول بڑے پیارے لگتے ہیں۔"

اختر میرے قریب آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے ننّھے سے کیمرے سے منظر کی تصویر اُتارنے لگا، لیکن اب وہ بات یاد آتی ہے تو دِل لرز جاتا ہے۔ کاش مُجھے معلوم ہوتا کہ اسی منظر کی ایک تصویر کُچھ عرصہ بعد اور لی جائے گی مگر اس کی نوعیت دوسری ہوگی۔

میں کرسی سے اٹھ کر اختر کے ساتھ باغ میں ٹہلتا ہوا محل کی طرف بڑھنے

لگا۔ اختر مُجھے بتا رہا تھا کہ آج نجمہ اور امجد بھی محل میں آئے ہوئے ہیں۔

اور زرینہ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نجمہ کو بہت چاہتا تھا اس

لیے اس سے ملاقات کرنے کی خاطر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم

میں پہنچا۔ امجد مُجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ مُجھے اپنا یہ داماد بڑا ہی پیارا تھا۔ کُچھ

تو اس لیے کہ وہ تھا ہی اچھّا اور کُچھ یوں بھی کہ اس نے میرے پچھلے سفر

میں میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ گھریلو باتوں کا تذکرہ کر کے میں خواہ مخواہ اپنی کہانی

کو لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ بڑی دیر تک آپس

میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے، گفتگو کے دوران ہی میں مُجھے یہ علم ہوا

کہ امجد چند ضروری کاموں کے باعث آسٹریلیا جا رہا ہے اور نجمہ بھی اس

کے ساتھ ہی جائے گی۔ ایک طرح سے امجد مُجھ سے اجازت لینے آیا تھا،

مگر جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں نجمہ اب امجد کی بیوی تھی اس لیے مُجھ سے

اجازت لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لیکن اسی ایک بات سے امجد کی

شرافت اور فرماں برداری کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں جان اور جیک کا تذکرہ بھی آ گیا۔ امجد نے کہا کہ راستہ بالکل الگ ہے، ورنہ وہ لازمی طور پر ان دونوں سے مل کر واپس آتا۔ جان اور جیک کا ذکر آتے ہی پچھلے واقعات میری نظروں کے سامنے فلم کی طرح گھوم گئے۔ مُجھے وہ وقت یاد آ گیا جب سیّارہ زہرہ کے قد آور سائنس داں شاگو نے ہمیں زہرہ کی طرف آنے کی دعوت دی تھی اور کہا تھا کہ ہم سب زہرہ میں اس کے مہمان ہوں گے اور اس کے خاص راکٹ ہمیں لینے آئیں گے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اب ہم لوگوں کو فرصت ہی کہاں تھی؟ ہم بہت سے خطرناک سفر کر چکے تھے، پھر اس کے علاوہ ایک دوسرے سے کافی دور بھی تھے۔ جان اور جیک امریکہ میں تھے، میں اور سوامی بمبئی میں اور اب امجد اور نجمہ آسٹریلیا جا رہے تھے اس صورت میں کوئی کس طرح سیّارہ زہرہ کا سفر کر سکتا تھا؟

اَن ہونی سی بات تھی۔ بھلا کسی انسان نے اتنی آسانی سے اب تک خلاء کا سفر کیا ہے؟ غرض اسی موضوع پر باتیں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ صُبح سے شام ہو گئی، ہم لوگ شام کی چائے اپنے محل کے اوپر ایک خوبصورت سے بُرج میں بیٹھے ہوئے پی رہے تھے۔ دور بہت دور سمندر میں سورج آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا دِل بھی اندر ہی اندر ڈوبتا جا رہا تھا۔ مُجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اندھیرا ہوتے ہی کُچھ نہ کُچھ ہو جائے گا۔ جیسے ایک اَن دیکھا خطرہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھنے میں مصروف ہے۔ میں بڑی بے تابی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، میرے ہاتھوں کی مُٹّھیاں بار بار کھُل اور بند ہو رہی تھی میری اس بے چینی کو میری بیوی زرینہ نے نوٹ کر لیا، اور وہ کہنے لگی۔

"آپ کی طبیعت کُچھ خراب ہے، کیا بات ہے؟"

"نہ جانے کیا بات ہے۔ دِل پر ایک عجیب سا بوجھ حاوی ہوتا جا رہا ہے۔"

"آئیے پھر نیچے چلیں۔" امجد اتنا کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

اور پھر ہم سب نیچے ہال میں آ کر بیٹھ گئے، مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ میں ابھی تک فکر مند تھا۔ اچانک مُجھے احساس ہوا کہ نجمہ مُجھ سے کافی دور جا رہی ہے۔ شاید اسی لیے میں اداس اور پریشان ہوں، مگر اس میں پریشانی کی کیا بات؟ نجمہ تو اپنے شوہر امجد کے ساتھ جا رہی ہے، پھر یہ کیا ہے؟ میرا دِل۔۔ یہ دِل اس قدر گھبرایا ہوا کیوں ہے؟ اور میرے اس سوال کا جواب مُجھے جلد ہی ملنے والا تھا، نہایت ہی خوفناک اور بھیانک طریقے سے ملنے والا تھا۔

امجد کا جہاز رات کے آٹھ بجے پرواز کرنے والا تھا، اس لیے شام کے چھ بجے وہ نجمہ کو اپنے ساتھ لے کر میرے محل سے چلا گیا۔ اسے سفر کی تیاری بھی کرنی تھی۔ اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے اس سے کہا کہ میں زرینہ کے ساتھ پونے آٹھ بجے ہوائی اڈّے پر ان دونوں کو الوداع

کہنے آجاؤں گا۔ ان کے جانے کے بعد میں مُضمحل انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ زرینہ اور اختر نے مُجھے دلاسے دینے کی کوشش کی، وہ دونوں یہی سمجھ رہے تھے کہ مُجھے اپنی بیٹی سے بچھڑنے کا غم ہے، اسی لیے وہ برابر میری دِل جوئی کیے جا رہے تھے، مگر میری حالت وہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی طوفان آنے والا ہے اور اس کی سرسراہٹ مُجھے ابھی سے سُنائی دے رہی ہے۔

میں پریشانی کے عالم میں ہال سے نکل کر اپنے کمرے میں آگیا۔ گلابی جاڑوں کے موسم میں بھی مُجھے پسینہ آرہا تھا، میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور خواہ مخواہ عجیب عجیب باتیں سوچنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مُجھے کیا کرنا چاہیئے، میرے دِل میں ہول اٹھ رہا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا کہ اچانک مُجھے کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی، میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔

وہ سوامی تھا۔۔۔

سوامی وہ شخص تھا جس پر میں جان کے بعد سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ میرے دونوں بچّے اسی کی گود میں چھوٹے سے بڑے ہوئے تھے۔ سوامی کا اپنا کوئی بھی رشتہ دار نہیں تھا، اس لیے ایک طرح سے وہ ہمارے گھر کا ایک فرد بن کر رہ گیا تھا۔ میں نے بھی کبھی اسے ملازم نہیں سمجھا۔ بہت سی باتوں میں وہ مُجھے بہت سی عمدہ اور درست مشورہ دیا کرتا تھا۔ میرے پاس آنے کے لیے اسے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے پچھلے سفر میں بھی وہ میرا سب سے بڑا مددگار اور معاون تھا۔ وہ مُجھ سے ایسی ہی محبّت کرتا تھا جیسے کوئی شفیق باپ اپنے بچّے سے کرتا ہے، اور خود میری بھی یہی حالت تھی، میں نے بھی بارہا آزمایا تھا کہ جب کبھی میں پریشان ہوتا یا مُجھ پر کوئی آفت آنے والی ہوتی، سوامی کو کسی نہ کسی طرح اس کی خبر ہو جاتی تھی اور وہ فوراً میرے پاس میری دِل جوئی کے

لیے پہنچ جاتا تھا۔

"میں ہال میں سے آ رہا ہوں مالک۔ بابا نے بتایا تھا کہ آپ بہت پریشان ہیں۔" اس نے دریافت کیا۔

"ہاں سوامی۔۔ نہ جانے کیا بات ہے، میرا دِل بیٹھا جا رہا ہے۔"

"آپ کو تو پریشان رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔" سوامی نے آہستہ سے کہا۔ "بابا نے یہ بھی بتایا ہے کہ آپ بے بی کے جانے سے پریشان ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہی بات ہو، مگر میں کہہ نہیں سکتا۔"

"ارے سات بج رہے ہیں، آپ کی پسند کا پروگرام ہو رہا ہو گا۔" سوامی نے اتنا کہہ کر ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔

میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ اس طرح وہ میرے دِل پر چھائی ہوئی اداسی کو دور

کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ مُجھے ریڈیو کا بجنا اچھّا نہیں لگ رہا تھا، مگر سوامی کی خاطر میں چُپ رہا۔

"بے بی کا جہاز آٹھ بجے اڑے گا مالک۔" سوامی نے کہا۔ "کیا آپ ہوائی اڈّے نہیں چلیں گے؟"

سوامی میرا خیال بٹا رہا تھا، واقعی یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ مُجھے نجمہ اور امجد کو خُدا حافظ کہنے کے لیے ہوائی اڈّے پر جانا ہے۔ میں نے فوراً اندرونی فون کے ذریعے زرینہ کو ہدایت کی کہ وہ جلدی سے تیّار ہو کر محل کے دروازے پر پہنچ جائے اور پھر سوامی سے کہا کہ وہ ڈرائیور سے کار نکالنے کے لیے کہے، سوامی کے چلے جانے کے بعد میں جلدی جلدی تیّار ہو کر باہر آگیا۔ زرینہ، اختر اور سوامی میرے انتظار میں باہر کھڑے ہوئے تھے۔

میری پریشانی کا اندازہ لگانے کے بعد زرینہ کا مُونہہ بھی اترا ہوا تھا۔ میں نے اب یہی مناسب سمجھا کہ زبردستی خوش رہنے کی کوشش کروں، ورنہ

یہ اداسی کی بیماری چھوت کی طرح سب کو لگ جائے گی۔ آٹھ بجنے میں پندرہ منٹ تھے جب ہم لوگ ہوائی اڈّے پہنچے۔ میں چونکہ اب معمولی آدمی نہیں تھا اس لیے وہاں میری بڑی آؤ بھگت ہوئی، پورا ہوائی عملہ میرے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے پوچھتا، ان کے ایک افسر نے نہایت ادب کے ساتھ مُجھ سے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے سر۔۔ آپ کے ساتھ آپ کی صاحبزادی اور مسٹر امجد تشریف نہیں لائے۔"

"کیا کہتے ہیں آپ؟" مُجھے اچانک یہ سن کر بڑا تعجّب ہوا۔ "وہ دونوں تو میرے محل سے شام کے چھ بجے ہی روانہ ہو گئے تھے۔"

"ہو سکتا ہے کہ راستے میں کہیں رُک گئے ہوں۔" افسر نے خندہ پیشانی سے کہا۔

"مُمکن ہے، ایسا ہی ہو۔ مگر اب تک انہیں آ جانا چاہیئے تھا۔" سوامی نے

کہا۔

ہم سب کی نظریں صدر دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں، مگر امجد اور نجمہ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ آٹھ بجنے میں اب صرف پانچ منٹ تھے، لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ مسافروں کو جہاز میں سوار ہونے کے لیے کہا جا رہا تھا، رن وے پر جہاز پرواز کے لیے بالکل تیّار کھڑا تھا۔ اس کے انجن زبردست شور پیدا کر رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا، مگر نجمہ اور امجد کا سایہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ہم سب کی پریشانی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، جہاز کی پرواز صرف ہماری خاطر دس منٹ کے لیے روک دی گئی، مگر ان دونوں کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ مجبوراً جہاز ان کے بغیر ہی پرواز کر گیا۔

میری اور زرینہ کی بے تابی اور پریشانی اس وقت کوئی دیکھتا۔ مُجھے رہ رہ کر نجمہ پر غصّہ بھی آ رہا تھا، مگر یہ غصّہ بہت جلد حیرت اور خوف میں تبدیل ہو گیا۔ نجمہ وقت کی بے حد پابند تھی، پھر آخر وہ کہاں رہ گئی؟ ہوائی اڈّے کا

عملہ ہم لوگوں کے چاروں طرف کھڑا چہ میگوئیاں کر رہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو یہ موقع نہ دیتے ہوئے کہ وہ ہمارے بارے میں مزید کُچھ سوچیں، ڈرائیور سے واپس چلنے کو کہا، خیال یہ تھا کہ امجد کی کوٹھی پر دریافت کروں گا، لیکن جب وہاں سے پتہ کیا تو بڑا اچنبھا ہوا۔

معلوم ہوا کہ وہ دونوں تو وہاں سے شام کے چار بجے کے چلے ہوئے ہیں، انہوں نے کہا تھا کہ وہ میرے محل سے سیدھے ائیر پورٹ چلے جائیں گے۔

یہ سُنتے ہی میری تشویش بڑھ گئی، میں نے اپنے محل پہنچنے کے بعد جگہ جگہ آدمی دوڑائے۔ ٹیلی فون کیے، تار دیے، مگر نہ جانے ان دونوں کو زمین کھا گئی یا آسمان۔ ان کا ذرا سا بھی سُراغ نہ مل سکا۔ زرینہ تو اپنے کمرے میں بند ہونے کے بعد دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سوامی بھی پریشان تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ رات بھر جاگتا رہا، اختر محل میں آتے ہی سو گیا تھا،

اس لیے ہم نے اسے حقیقت کی ذرا بھی ہوا نہ لگنے دی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ بھی روتے روتے پورا گھر سر پر اٹھا لیتا۔

جب پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی اور نجمہ اور امجد کا ذرا سا بھی پتہ نہ چلا، تو میں نے بھی ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ سوامی کا خیال تھا کہ پولیس کو خبر کر دی جائے تاکہ وہ لوگ کچھ اتہ پتہ نکالیں۔ لیکن میں اس کے خلاف تھا، مُجھے اُمّید تھی کہ صُبح ہو ہی چکی ہے اس لیے نجمہ اور امجد خود ہی واپس آ جائیں گے۔ اچانک سوامی کو ایک بات سوجھی، اس نے مُجھ سے کہا کہ چونکہ نجمہ اور امجد اپنی کار میں محل کے دوسرے دروازے سے گئے تھے، اس لیے ان کی کار کے نشان سڑک پر ضرور ہوں گے، ان نشانوں کی مدد سے سُراغ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرف اور کہاں گئے ہیں۔۔۔

بات چوں کہ معقول تھی اس لیے ایسا ہی کیا گیا، ہم دونوں ٹائروں کے نشان دیکھتے ہوئے سڑک پر آ گئے، نشان صاف اور واضح تھے، مگر

اچانک یہ دیکھ کر میرے ہوش گُم ہو گئے کہ ایک مقام پر آ کر وہ نشان بالکل غائب ہو گئے تھے جہاں وہ نشان غائب ہوئے تھے اس مقام پر ہلکے سبز رنگ کا پاؤڈر سا چھڑکا ہوا تھا، یوں لگتا تھا جیسے کسی نے چلتی ہوئی کار کو اچانک روک دیا ہو اور پھر کسی طاقت ور مشین یا کرین کی مدد سے ہوا میں اٹھا لیا ہو۔

چمکیلے غبارے میں دو دُھندلے خاکے اُبھرے

بڑی حیرت انگیز بات تھی، نشانات سڑک کے بالکل بیچوں بیچ تھے۔ اگر نجمہ کی کار سڑک کے برابر والے میدان میں گئی ہوتی تو اس میدان میں ٹائروں کے نشانات نظر آتے، لیکن ایسا بالکل نہیں تھا، نشان تو دائیں طرف گئے تھے اور نہ بائیں طرف، بس وہ تو اس طرح ختم ہو گئے تھے جیسے کاغذ پر کوئی پنسل سے لکیر کھینچتے کھینچتے ایک دم رُک جائے اور پھر پنسل کو کاغذ سے اوپر اٹھا لے۔ اگر پنسل کو ہم نجمہ کی کار سمجھ لیں تو یہ مثال آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

پھر وہ سبز رنگ کا پاؤڈر کیسا تھا؟ میں نے وہ پاؤڈر ہاتھ میں لے کر انگلیوں سے مسل کر دیکھا تو برق کی طرح وہ میری انگلیوں پر چمکنے لگا۔ آخر یہ کیا چیز تھی؟ پریشانی، حیرت اور خوف کے باعث میں دیوانہ سا ہو گیا، اور بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا کہ شاید کہیں کار نظر آ جائے۔ سوامی نے میری حالت دیکھی تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"مالک، اس طرح کُچھ نہ ہوگا، ہمیں ہمّت اور عقل سے کام لینا چاہیئے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ چکّر کیا ہے؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیا۔

"ایک ہلکا سا اندازہ لگا سکا ہوں، مگر بھگوان کرے وہ غَلط ہو۔" سوامی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسا اندازہ۔۔بتاؤ، مُجھے جلدی بتاؤ۔"

"مالک جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، بے بی اور امجد صاحب کا اغوا ہو گیا ہے۔"

اغوا کیا گیا ہے؟ ہاں سوامی ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے، اتنی دیر سے یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟ مگر، مگر کن لوگوں نے اسے اغوا کیا ہے، کون لوگ ہیں وہ؟ میرا تو یہاں کوئی دُشمن نہیں! جو سوالات میرے

دِل میں پیدا ہوئے تھے، وہی میں نے سوامی سے پوچھ لیے، وہ کُچھ دیر تک خاموش رہا، اور پھر بولا۔

"مالک میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کیا بات ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ گھبرائیے نہیں، اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز باتیں مُجھے اور آپ کو اپنے پچھلے سفر میں پیش آ چکی ہیں۔ ہم لوگ اس وقت نہیں گھبرائے تو اب بھی ہمیں باہمّت بننا پڑے گا۔ میرا دِل کہتا ہے کہ بے بی کو کوئی نقصان نہیں پُہنچے گا، اور وہ جلدی واپس آ جائے گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ سوامی کی یہ بات معقول تھی، اس کے ڈھارس بندھانے سے کم ازکم اتنا تو ہوا کہ میری پریشانی کسی حد تک کم ہو گئی۔ میں واپس محل میں آ گیا اور پھر میں نے سب سے پہلے پولیس کو فون کر دیا، اتنی دیر میں کہ پولیس آتی، میں سوامی کو فون پر چھوڑ کر زرینہ کے کمرے پہنچا۔ وہ رات بھر نہیں سو سکی تھی، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اختر بھی وہیں

ایک کرسی پر بیٹھا ہوا رو رہا تھا، میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس وقت میں نے بزدلی دکھائی اور خود بھی اپنی بے قراری اور پریشانی ظاہر کر دی تو پھر وہ دونوں اور رونے لگیں گے۔ اس لیے میں نے انہیں سمجھانا شروع کیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ نجمہ اب بچی تو ہے نہیں جو کہیں کھو جائے گی۔ وہ امجد کے ساتھ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے عین وقت پر ان کا ارادہ بدل گیا ہو، اور وہ آسٹریلیا جانے کی بجائے کسی اور جہاز سے کہیں اور چلے گئے ہوں۔

میری ان باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا، زرینہ اور اختر اپنا رونا بھول گئے، اور میں نے اندازہ لگایا کہ میری باتیں سن کر انہیں کُچھ اطمینان ضرور ہوا ہے عقلمندی میں نے یہ کی کہ انہیں یہ نہیں بتایا کہ نجمہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اس کی کار کے ٹائروں کے نشان اچانک بیچ سڑک میں سے غائب ہو گئے ہیں۔

زرینہ اور اختر کو ساتھ لے کر دوبارہ میں ہال آ گیا۔ پولیس انسپکٹر رانا وہاں

کھڑا سوامی سے باتیں کر رہا تھا۔ مُجھے دیکھتے ہی وہ ادب سے جھک گیا اور پھر پوچھنے لگا کہ اسے کس لیے طلب کیا گیا ہے؟ مُصیبت یہ تھی کہ میں زرینہ کی موجودگی میں اسے کُچھ نہیں بتا سکتا تھا، مگر بتانا بھی ضروری تھا۔ اس لیے میں نے ایک ذاتی کام کا بہانہ کیا اور انسپکٹر رانا کو لے کر باہر آ گیا۔ سوامی بھی میرے پیچھے پیچھے آیا، زرینہ سے میں نے کہہ دیا کہ نجمہ کے بارے میں معلومات کرنے کے لیے میں انسپکٹر کے ساتھ ہوائی اڈّے جا رہا ہوں، اس لیے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، زرینہ بے چاری مطمئن ہو گئی اور ہم تینوں کو خاموشی سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

ہم اس مقام پر پُہنچے جہاں ٹائروں کے نشان تھے، یہ نشان انسپکٹر کو دکھانے کے بعد ہم نے اسے پوری کہانی سنائی، نشانات دیکھ کر اس جیسا تجربہ کار آدمی بھی ایک لمحہ کے لیے چکرا گیا۔ بڑی دیر تک وہ وہاں کھڑا ہوا

غور کرتا رہا، اور پھر جب اس کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا تو اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ہیڈ آفس فون کر کے کسی سُراغ رساں کو بلائے۔ لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے ہم لوگ پھر وہاں سے واپس آ گئے، فون کرنے کے لیے اس نے نمبر گھمائے، وہ بات کر ہی رہا تھا کہ یکایک سِلسِلہ منقطع ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟ شاید کرنٹ نہیں ہے؟" اس نے کریڈل کو بار بار دباتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں بجلی فیل ہو گئی ہے شاید۔ کمرے کی لائٹ بھی چلی گئی ہے۔" سوامی نے جواب دیا۔

"مگر ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ ٹیلی فون تو بجلی سے نہیں بلکہ بیٹری سے چلتا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اگر بجلی فیل ہو بھی گئی ہے تو کم از کم فون کو تو کام کرنا چاہیے۔"

میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اچانک اختر بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا۔۔۔

"ابّا جی میرے کمرے کا ریڈیو اپنے آپ ہی بند ہو گیا ہے۔ ذرا بجلی والوں کو فون کر دیجیے۔ شاید لائٹ چلی گئی ہے۔"

میں نے اسے تسلّی دی اور انسپکٹر کے ساتھ ہال سے باہر آ گیا۔ انسپکٹر کہہ رہا تھا کہ چوں کہ فون خراب ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنی موٹر سائیکل پر جا کر خود ہی سُراغ رساں کو بلا لاتا ہے۔ میں نے جب آمادگی ظاہر کی تو وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔ مگر ہزار کوششوں کے باوجود انجن اسٹارٹ ہی نہ ہوا۔ بے چارہ انسپکٹر پسینہ میں ڈوب گیا، مُجھے بڑی حیرت ہوئی کہ آخر اس کی موٹر سائیکل اسٹارٹ کیوں نہیں ہوتی؟ پولیس والوں کی موٹر سائیکلیں بڑی اچھّی حالت میں ہوا کرتی ہیں۔ جہاں کِک ماری اور اسٹارٹ، پھر آخر یہ کیا چکّر ہے؟

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مُجھے محل کے صدر دروازے سے اپنا ڈرائیور

ایک وکٹوریا میں آتا ہوا نظر آیا۔ اس کی شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بے حد گھبرایا ہوا ہے، وکٹوریا والا اپنے تانگے پر برابر چابک برسا رہا تھا تاکہ گاڑی جلد سے جلد مُجھ تک پہنچ جائے، میں نے اندازہ لگایا کہ ڈرائیور کے ساتھ کوچوان بھی پریشان ہے، ڈرائیور جلدی سے وکٹوریا سے اتر کر میرے پاس آیا اور مودب کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے یوسف؟ تم آج صُبح کار لے کر بندرگاہ کیوں نہیں گئے؟"

یوسف کے ذمّہ یہ کام تھا کہ وہ صُبح سویرے اٹھتا تھا اور موٹر گیراج سے کار نکال کر میری جہاز راں کمپنی کے دفتر میں جاتا تھا اور پھر چند ضروری کاغذات جو پوری رات مختلف جگہوں سے دفتر میں آتے تھے، میرے پاس محل میں لے آیا کرتا تھا۔ اس لیے آج اسے خالی ہاتھ وکٹوریا میں آتے ہوئے دیکھ کر میرا حیران ہونا قدرتی تھا۔

"سرکار سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟"

"گھبراؤ نہیں اطمینان سے بتاؤ کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"حضور کار نکال کر جب میں بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا تو اچانک سوا آٹھ بجے کار اپنے آپ رُک گئی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ اسٹارٹ ہی نہیں ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ شاید بیٹری میں یا پلگ میں کوئی خرابی ہو گئی ہے، خود ہی ٹھیک ہو جائے گی، مگر سرکار میرا یہ خیال غَلط ثابت ہوا، کیوں کہ میں نے دیکھا۔۔۔"

یوسف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا، یوں لگتا تھا جیسے وہ بے حد خوفزدہ ہے اور الفاظ اس کے مُونہہ تک آ کر رہ جاتے ہیں۔

"ہاں ہاں کہو، رُک کیوں گئے؟" اس بار انسپکٹر نے بھی دلچسپی دکھائی۔

"سرکار کیا بتاؤں، میں نے دیکھا کہ صرف میری ہی موٹر نہیں سڑک پر چلتی ہوئی لاتعداد کاریں بھی اچانک رُک گئی ہیں۔"

"کیا کہتے ہو؟"

"جی ہاں سرکار، اور کاروں کے ساتھ ہی مکانوں اور دفتروں کی بجلی بھی چلی گئی ہے، میں نے آپ کو ٹیلی فون کرنا چاہا مگر اس نے بھی کام نہیں کیا۔" یوسف نے جلدی جلدی ہاتھ ہلا کر یہ بات کہی۔

"تم کہتے ہو سوا آٹھ بجے ایسا ہوا تھا۔" انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت ہال کی بجلی اور فون خراب ہوا تھا، اسی وقت ایسا ہوا ہو گا۔"

"مگر یہ بات کیا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اگر شہر کی بجلی فیل ہو گئی تو بیٹری سے کام کرنے والی چیزوں کو تو چلنا چاہیئے تھا۔"

"مالک۔۔۔" سوامی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ایسا تو نہیں کہ بے بی کی کار کے غائب ہونے اور شہر کی بجلی فیل ہو جانے میں آپس میں کوئی تعلّق

ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سوامی۔" میری پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور پھر میں نے بے تابی کے ساتھ انسپکٹر کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر صاحب، خُدا کے لیے آپ جائیے اور پتہ لگائیے کہ یہ کیا چکّر ہے؟"

چکّر درحقیقت کیا تھا؟ یہ تو انسپکٹر بھی نہیں جانتا تھا، لیکن اسے ہیڈ آفس جانا ضروری تھا، اس لیے وہ وکٹوریا میں بیٹھ کر کوچوان سے جلد سے جلد ہیڈ آفس پہنچنے کے لیے کہا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ محل کے سب ہی ملازم حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ شاید انہوں نے ہماری گفتگو سُن لی تھی، اگر دیکھا جائے تو بجلی کا یوں اچانک چلا جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے سوامی کی زبان سے نجمہ کی کار کی گمشدگی کے بارے میں سن لیا تھا اور اب وہ آپس میں چہ میگوئیاں

کر رہے تھے۔

ملازموں کی بھیڑ کے پیچھے زرینہ ایک ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح زرد اور ستا ہوا لگتا تھا۔ اس کی دو خادمائیں اسے تسلّی دے رہی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ اسے بھی وہ اِطّلاع مل چکی تھی جسے میں اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ میں سب کو وہیں چھوڑ کر زرینہ کی طرف بڑھا، اختر بھی افسردگی سے ساتھ ہو لیا۔ زرینہ کو میں نے تسلّی دینی شروع کی اور اُمّید کے خلاف اختر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ زرینہ نے بہ مُشکل اپنے آنسو پونچھے۔ پھر میں نے اس کو بتایا کہ پہلے بھی اختر اور نجمہ اس سے جُدا ہو چکے تھے۔ لیکن خُدا تعالیٰ نے سب کو آپس میں ملا دیا، اس لیے اسے اب بھی خُدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ اسے منظور ہوا تو پھر نجمہ ہم سے آ ملے گی اور اس کا ذرا بھی بال بیکا نہ ہو سکے گا۔ میری ان باتوں سے زرینہ کی بڑی ڈھارس بندھی اور وہ خاموشی سے میرے ساتھ

چلتی ہوئی اس جگہ آ گئی جہاں میں پہلے کھڑا ہوا تھا۔ اختر چلتے ہوئے کُچھ سوچ رہا تھا۔ آخر اس نے مُجھ سے کہا۔

"ابّا جی میرے خیال میں ہمارے پچھلے دُشمن ابھی تک دُنیا میں موجود ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میرا مطلب جیگا سے ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو اختر۔ جیگا تو خود تمہارے ہاتھوں ختم ہوا تھا بھول گئے کیا؟"

"لیکن معاف کیجئے، آپ بھی اس کی ایک صِفت بھول رہے ہیں، وہ جس طرح شکل بدلنے میں ماہر ہے، ہو سکتا ہے اسی طرح موت پر بھی اس کا بس چلتا ہو۔"

"نہیں بیٹے، یہ نا مُمکن ہے، جیگا زہرہ کا ایک بدنام سائنس داں تھا اور وہ کبھی کا مر چکا۔"

"میں مان لیتا ہوں۔" اختر نے کہا۔ "مگر کیا یہ مُمکن نہیں کہ زہرہ کے ہی دوسرے بدنام سائنس داں یعنی جیگا کے ساتھی ہماری دُنیا میں آ جائیں اور ہم سے انتقام لیں، کیوں کہ ہم ہی ان کے لیڈر کی موت کا باعث بنے تھے۔"

بجلی جیسی ایک چمک میرے ذہن میں پیدا ہوئی، حیرت کی بات ہے کہ جو بات میں اب تک نہیں سوچ سکا تھا اختر نے سوچ لی تھی۔ شاید وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا، کیوں کہ پورے شہر کی بجلی غائب کر دینا، اس حد تک کہ بیٹری اور ڈرائی سیل کا کرنٹ بھی غائب ہو جائے، کسی انسان کی حرکت نہیں ہو سکتی، یقیناً یہ کام سیّارہ زہرہ کے لوگوں کا ہی ہو سکتا ہے۔

سوامی بھی اختر کی باتیں سُن رہا تھا، اور اس نے بھی اختر کی تائید کی۔ میرا

ذہن تو یہ بات قبول کرتا تھا، لیکن دِل نہیں مانتا تھا، یا پھر یہ بات تھی کہ میں جان بوجھ کر یہ بات نہیں مان رہا تھا، وجہ محض یہ تھی کہ اگر میں مان لیتا تو پھر مُجھے یقین کرنا پڑتا کہ نجمہ کو وہی لوگ لے گئے ہیں، اور یہ خیال یقیناً میرے لیے تکلیف کا باعث ہوتا۔

میں نے ملازموں کو واپس جانے کے لیے کہا اور پھر ہم چاروں محل کے خوبصورت اور نفیس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس عرصہ میں ملازموں نے سب کمروں میں شمعیں روشن کر دی تھیں۔ زرینہ اپنا سر پکڑے ہوئے بیٹھی تھی، اختر اور سوامی بھی لگاتار کسی سوچ میں غرق تھے، اور میں بھی حالات کے اس نئے موڑ سے پریشان تھا۔ جیسا کہ مُجھے اس واقعہ کے دو دِن بعد معلوم ہوا، بجلی جانے کا یہ حادثہ صرف بمبئی ہی میں نہیں ہوا تھا، پورے ہندوستان کی یہی حالت تھی، سب مقامات اور شہروں کی بجلی فیل تھی۔ البتّہ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں پر اس

حادثے کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا، لیکن ہندوستان بیرونی دُنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ نہ کوئی خبر یہاں سے باہر جا سکتی تھی اور نہ باہر کی یہاں آ سکتی تھی۔ بجلی فیل ہونے کا اثر ریل گاڑیوں، پانی کے جہازوں اور ہوائی جہازوں پر بھی پڑا تھا۔ سوا آٹھ بجے پرواز کرنے والے جہاز پرواز نہیں کر سکے تھے اور جو پرواز کر رہے تھے ان کے انجنوں نے اسپارک پیدا کرنے بند کر دیے تھے ڈائنمو نے جب کرنٹ بنانا ہی بند کر دیا تھا تو انجن بھلا کس طرح چلتا؟ نتیجے کے طور پر پورے ہندوستان میں چھبیس جہاز نیچے گر پڑے تھے اور لاتعداد مسافر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اگر اختر کا خیال درست تھا اور یہ کام سیّارہ زہرہ کے ظالم لوگوں کا ہی تھا تو ان کی حرکت بہت بُری تھی، یوں لگتا تھا کہ ان کی نظروں میں انسانی زندگی کی کوئی وُقعت ہی نہیں تھی۔

بجلی کو فیل ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں ابھی تک ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھا ہوا تھا، میرے ملازمین اور دوسرے ملاقاتی بار بار میرے پاس آ رہے تھے اور شہر کی افراتفری کے بارے میں بتا رہے تھے کہ کس طرح پورے شہر کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ حکومت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آفت کس طرح دور ہو گی؟ اتنے سے عرصے میں پڑوسی ملکوں کے بیشتر نمائندے دارالحکومت میں آ چکے تھے اور سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کس طرح معلوم کر سکیں کہ بجلی فیل ہونے کی اصل وجہ کیا ہے؟ ان سب باتوں کے ساتھ ہی ایک شخص نے مُجھے بتایا کہ اس نے آدھ گھنٹہ پہلے آسمان پر ایک گہری سبز رنگ کی لکیر دائیں طرف سے بائیں طرف جاتے ہوئے دیکھی تھی، یوں لگتا تھا جیسے کوئی چیز زنّاٹے کے ساتھ شُوں کر کے گزر گئی ہو۔ اس چیز کے گزرنے کی آواز ایسی تھی جیسے ہزاروں جیٹ جہاز ایک ساتھ گزرتے وقت پیدا کرتے ہیں۔

یہ بات سُن کر میرا ماتھا کُچھ ٹھنکا، مگر میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا کہ میں کُچھ جانتا ہوں۔ نجمہ اور امجد کی پُراسرار گمشدگی کی خبر چوں کہ پورے شہر میں پھیل چکی تھی، اس لیے مُجھ سے ملاقات کرنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا۔ تنگ آکر میں نے دربان سے کہلوادیا کہ وہ صدر دروازے کا پھاٹک بند کر دے اور کسی کو بھی اندر نہ آنے دے۔ البتّہ انسپکٹر رانا اور اس کے ساتھی کو نہ روکے۔ یہ حُکم دینے کے بعد میں اپنے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا رہا۔ اختر اور زرینہ مُجھے اس انداز سے تک رہے تھے گویا میں ابھی کوئی حل اس پریشانی کا ڈھونڈ نکالوں گا۔

اس حالت میں بیٹھے بیٹھے آدھ گھنٹا گزر گیا، لیکن سچ پوچھئے تو میں کُچھ بھی نہ سوچ سکا کہ اب مُجھے کیا کرنا چاہئے۔ اختر اور سوامی مُجھے تسلّی دے رہے تھے، اور مناسب مشورے بھی دیتے جارہے تھے، اور ان مشوروں میں چند منٹ بعد انسپکٹر رانا سُراغ رساں ذکی بھی شامل ہو گئے۔ بڑی دیر تک

میں اور وہ دونوں اپنا دماغ خرچ کرتے رہے، مگر کام کی بات کسی نے بھی نہیں کی۔ تھک ہار کر ہم لوگ آرام کرسیوں پر نیم دراز ہو گئے۔ انسپکٹر رانا کاغذ پر کسی قسم کا نقشہ بنانے لگا اور سراغ رساں ذکی اپنا پائپ سلگا کر دھوئیں کے بادل چھت کی طرف چھوڑنے لگا۔

ایک بار جیسے ہی اس نے دھواں چھت کی سمت چھوڑنے کے لیے اپنا مُونہہ اونچا کیا، حیرت اور خوف کے باعث وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا، اور کہنے لگا۔ "فیروز صاحب، یہ کیا ہے؟"

اس کی نظروں کے سہارے جب میں نے اوپر دیکھا تو دہشت کی ایک تھرتھری میرے جسم میں پھر پیدا ہو گئی۔ زرینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اختر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سوامی دو قدم آگے بڑھ کر میرے بالکل برابر کھڑا ہو گیا۔ ہم سب بھیانک اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے چھت میں بنے ہوئے اس روشن کو دیکھ رہے تھے۔ جس کے راستے ایک گہرے سبز

رنگ کا چمکتا ہوا دھواں آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا، ایک عجیب سی سیلی ہوئی بُو کمرے میں پھیلنے لگی۔ ایک خاص بُو، جسے اب میں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ سُراغ رساں ذکی کا مُونہہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا، اور پائپ ان کے دانتوں سے پھسل کر فرش پر نیچے جا گرا۔ سبز چمکیلا دھواں دھیرے دھیرے اس سمت بڑھ رہا تھا جہاں دیوار کا کونا تھا۔ اس کونے میں کوئی سامان بھی نہیں رکھا ہوا تھا، یہ دھواں اس جگہ جا کر پھیلنے لگا اور اس کی چمک بڑھنے لگی۔ دیوار کے کونے میں یہ چمکیلا غُبار ایک خاص حُجم میں تبدیل ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے دیوار میں دس فٹ مربّع کوئی شیشے کا کمرہ ہو اور اس میں یہ دھواں بھرنے لگا ہو، انسپکٹر رانا نے فوراً اپنا پستول نکال لیا اور پھر وہ آگے بڑھ کر کونے میں گولی مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک سُراغ رساں نے اسے روک لیا اور کہا۔ "کیا کرتے ہیں آپ، پہلے دیکھتے رہیئے کہ یہ شُعبدہ کیا ہے؟"

"میں اِس شُعبدہ کو اچھّی طرح سمجھ چکا ہوں انسپکٹر۔" میں نے کہا۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ ایسا ہی پاؤڈر اس مقام پر بھی پڑا ہوا تھا جہاں سے نجمہ اور امجد کی کار اچانک غائب ہوگئی تھی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں فیروز صاحب۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

زرینہ نے پہلی بار عجیب سی نظروں سے مُجھے دیکھا، اس کی نظروں میں یہ شکایت تھی کہ آپ نے پوری بات مُجھے کیوں نہیں بتائی؟ مگر یہ وقت زرینہ کو مکمل بات بتانے کا نہیں تھا، کیوں کہ میرے سامنے ایک عجیب و غریب تماشا ہو رہا تھا۔ میں، سوامی اور اختر چوں کہ ایسے تماشے بہت دیکھ چکے تھے، اس لیے ہم کم حیرت زدہ تھے، البتّہ بے چارے انسپکٹر اور سُراغ رساں حیرت، خوف اور پریشانی کے ملے جلے انداز میں دیوار کی طرف تک رہے تھے۔

سبز رنگ کا دھواں دیوار کے قریب اسی طرح پھیل چکا تھا کہ ہم لوگوں کو

یہی محسوس ہوا تھا گویا شیشے کی ایک چوکور الماری میں کسی نے یہ دھواں بھر دیا ہو۔ ایک مکروہ بُو کمرے کی فضا کو مکدّر کر رہی تھی۔ یہ بُو کس جاندار کی تھی، اب میں اچھّی طرح جان چکا تھا اور یہ حقیقت معلوم ہوتے ہی مُجھے یوں لگا جیسے میرا جسم سُن ہو گیا ہے اور اس کا تمام خُون کسی نے نچوڑ لیا ہے۔ سوامی بھی میری ہی طرح سب کُچھ جان گیا تھا، اس لیے اس کی حالت بھی غیر تھی، بے شک وہ بہادر تھا مگر میں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے سیاہ رنگ پر زردی غالب آتی جا رہی تھی!

ہم سب سانس روکے ہوئے سبز چمکیلے غُبار کو دیکھ رہے تھے، جس میں سے اب ہلکا سا سراٹا بُلند ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو دُھندلے دُھندلے خاکے اُبھر رہے تھے۔ مٹیالے رنگ کے خاکے، پھر ان خاکوں میں زندگی پیدا ہونے لگی اور یہ گہرے ہونے لگے۔ آگے والا خاکہ عجیب مضحکہ خیز صورت اختیار کرنے لگا۔ تین فٹ لمبا قد، جسم پر گوریلے جیسے

لمبے لمبے بال، پھولا ہوا پیٹ، ایک فٹ لمبی ٹانگیں مگر ڈیڑھ فٹ لمبے پیر اور ان پیروں میں صرف دو انگلیاں، کندھوں کے ساتھ بے گردن کا جڑا ہوا گوریلے کے سر سے بھی بڑا ایک سر۔ بے حد خوفناک چہرہ اور چہرہ کی پیشانی پر صرف ایک آنکھ، یہ آنکھ آہستہ آہستہ سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ ناک کی جگہ ایک سوراخ اور بے حد چوڑا مُونہہ، جو ہاتھی جیسے کانوں کے ساتھ جا کر مل گیا تھا۔ مُونہہ کے باہر دو نوکیلے دانت لٹک رہے تھے۔ جب اس ہیبت ناک جسم نے حرکت کی تو اس کی موٹی سی دم بھی نظر آئی، اس جسم کے پیچھے ایک جسم اور ابھرا۔

یہ زوک تھا اور زوک کے آگے کھڑا ہوا بد نما جسم جکاری۔ (زوک اور جکاری کی تفصیل کے لیے پچھلا ناول "کالی دُنیا" پڑھیے۔)

جکاری جسبے ہنستے دیکھ کر میری روح فنا ہونے لگی، اور میں دہشت کے باعث دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ مُجھے پریشان دیکھ کر جکاری پہلے تو ہنسا اور

پھر ایک اچانک غُصّیلی نظر سے گھور کر دیکھنے لگا۔

یہ جو کُچھ بھی ہوا تھا، نئے لوگوں کے لیے بے حد حیرت انگیز تھا۔ میں سوامی اور اختر تو اچھّی طرح جانتے تھے کہ جکاری کیا بلا ہے۔ مگر زرینہ، انسپکٹر اور سُراغ رساں ذکی کی اس وقت بُری حالت تھی۔ انہوں نے اپنی

زندگی میں آج تک یہ عجوبہ نہیں دیکھا تھا کہ سبز دھوئیں کے اندر سے ایک ہیبت ناک جسم جنم لے لے۔ انسپکٹر نے کسی مسمریزم کے معمول کی طرح پستول واپس ہولسٹر میں رکھ لیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے جکاری کو دیکھنے لگا۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، جکاری اور زوک سیّارہ زہرہ کی عجیب و غریب مخلوق تھے، زوک تو محض جکاری کا مددگار تھا، مگر یہ جکاری

بہت ہی خطرناک مخلوق تھی، ان کے جسم کو چھونے سے بجلی کا ایک زبردست جھٹکا محسوس ہوتا تھا۔ اپنی ایک بھیانک آنکھ سے نظر آنے والے منظر کو یہ جکاری اپنے مالک تک سیّارہ زہرہ میں پہنچا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بڑے طاقتور بھی تھے، ان سے مُقابلہ کرنا دراصل اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ صرف سوبیا دھات ہی انہیں تباہ کر سکتی تھی۔ اور اس دھات کی معمولی سی مقدار بھی جان کے سوا کسی کے پاس نہ تھی اور جان ہم لوگوں کے حال سے بے خبر اس وقت امریکہ میں موجود تھا۔

جکاری کنگرو کی طرح اپنی دم زمین پر ٹکا کر اور اس کی کرسی بنا کر بیٹھ گیا، اور وہ صرف میری طرف دیکھ رہا تھا، اور اس کی ایک آنکھ سے شُعلے نکل رہے تھے۔ میں جانتا تھا اس آنکھ میں میرے لیے صرف نفرت ہی نفرت بھری ہوئی ہے۔ سراٹا بڑھنے لگا اور جکاری کے سر کے اوپر چمکتا ہوا روشنی کا ہالا اور تیز ہونے لگا، روشنی کبھی نارنجی، کبھی اودی، کبھی سبز

اور کبھی پیلی ہونے لگی۔ مُجھے یاد آیا کہ ایسی ہی روشنی میں نے اس وقت بھی دیکھی تھی جب میں "کالی دُنیا" میں گیا تھا، اور جکاریوں کا قیدی بنا ہوا تھا۔ اب میں اچھّی طرح جان چکا تھا کہ یہ سیّارہ زہرہ کے لوگوں کا آلۂ گفتگو ہے۔

کمرے میں اس وقت جتنے بھی لوگ تھے، سب میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ انسپکٹر، زرینہ اور سُراغ رساں پر خوف طاری ہے۔ خوف زدہ تو خیر میں بھی تھا لیکن اتنا نہیں جتنا وہ سب تھے۔ سراٹا اب کم ہونے لگا اور پھر آہستہ آہستہ ایک کھردری اور سپاٹ آواز اس بلب میں سے نکل کر کمرے میں گونجنے لگی۔ آواز ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے لاتعداد پتھّر لڑھک رہے ہوں، آواز اب صاف ہوتی جا رہی تھی، اور پھر عمدہ انگریزی میں کوئی مُجھ سے مخاطب ہوا۔

"گُڈ مارننگ مسٹر فیروز! کہئے میری آواز سُن کر آپ کو حیرت تو نہیں

ہوئی؟"

آواز میرے لیے بالکل نئی تھی، خُدا جانے وہ کس کی آواز تھی، میرا دِل بُری طرح دھڑک رہا تھا، مگر میں نے مناسب یہی تھا کہ جواب دلیری اور بے خوفی سے دیا جائے۔ اگر میرے لہجے میں ذرا سا بھی ڈر ثابت ہو گیا تو ہو سکتا ہے کہ ہم سب کے حق میں مُفید نہ ہو اس لیے میں نے نڈر ہو کر جواب دیا۔

"حیرت کی کیا بات ہے؟ مُجھے یقین تھا کہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آئے گا۔"

"ہم لوگ آپ کی بہادری کی قدر کرتے ہیں، یہ آپ کی بہادری ہی تھی کہ جس کے باعث ہمارا مشن ناکام ہو گیا اور ہمارا عظیم لیڈر جیگا موت کی میٹھی نیند سو گیا، وہ آپ ہی تھے اور آپ کا یہ ذہین لڑکا تھا جس کی بدولت ہمارا لیڈر ہم سے چھین لیا گیا۔"

"میں اسے طنز سمجھوں یا اپنی عزّت افزائی؟" میں نے تلخ لہجہ میں کہا۔

"آپ کا دِل کیا کہتا ہے؟" بلب میں سے غُصّیلی آواز آئی۔ "بہر حال آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا مقصد کیا ہے، آپ نے ہماری راہ میں جس طرح روڑے اٹکائے ہیں اس کی سزا تو آپ کو ملنی ہی چاہیئے۔"

"اور یہ سزا تم نے اس طرح دی ہے کہ پورے ہندوستان کی برقی قوّت ختم کردی! کیوں؟"

چمکیلے غبارے میں سے ایک بھیانک ہنسی سُنائی دی۔ جکاری کی ایک آنکھ مُجھے لگاتار گھورے جا رہی تھی۔ میں یہ جانتا تھا کہ یہ آنکھ ایک قسم کا ٹیلی وژن لینس ہے جو میری تصویر کروڑوں میل دور سیّارہ زہرہ میں پہنچا رہا ہے، جہاں ایک بدنما انسان اپنی سائنسی لیبارٹری میں بیٹھا ہوا مُجھے تمسّخرانہ انداز سے دیکھ رہا ہوگا۔ سوامی اور اختر دونوں گُم صُم کھڑے تھے، شاید وہ دونوں سوچ رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟ مگر انسپکٹر اور سُراغ

رساں کی حالت بہت بُری تھی۔ وہ میرے قریب ہی کھڑے ہوئے تھے اور کبھی مُجھے اور کبھی جکاری کو دیکھنے لگے تھے۔ جکاری کے سر کے اوپر معلق بلب میں سے جب قہقہے کی آواز آئی تو وہ چونکّنے ہو کر اس سمت دیکھنے لگے۔

آواز کہہ رہی تھی۔

"یہ سزا نہیں ہے فیروز صاحب، سزا تو ہم آپ کو دیں گے، ایسی سزا دیں گے کہ آپ کبھی نہ بھول سکیں گے۔"

"تو پھر یہ برقی قوّت کس لیے ختم کی گئی ہے؟" میں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"برقی قوّت کو ختم کیے بغیر ہمارے ٹیلی ویژن اسکرین کی لہریں آپ تک نہیں پہنچ سکی تھیں، اپنی لہروں کو وہاں تک پہنچانے کے لیے آپ کے

ملک کی بجلی کو عارضی طور پر ختم کرنا ضروری تھا، ہماری سائنس کی داد دیجئے کہ آپ کے سامنے ہمارے دو وفادار موجود ہیں، مگر ان کے جسم نہیں ہیں بلکہ ایک قسم کی تصویر ہیں، لیکن اس تصویر میں بھی آپ کو ختم کرنے کی قوّت موجود ہے۔ آپ بے شک ان کے سامنے سوبیا رکھ دیجئے مگر یہ سوبیا کی زہریلی کرنوں سے نہیں مر سکیں گے، کیوں کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ محض ایک تصویر ہیں۔"

"فیروز صاحب۔ براہ کرم بتلائیے یہ کون لوگ ہیں؟" انسپکٹر نے بڑی دیر بعد خود میں ہمّت کر کے پوچھا۔ "ہاں۔ اگر یہی ہمارے دُشمن ہیں اور انہوں نے ہی بجلی ختم کی ہے تو میں فوراً فوجی ہیڈ کواٹر سے رابطہ کرتا ہوں۔"

"زیادہ ڈینگیں نہ مارو مسٹر۔" بلب میں سے ہنسی کے بعد کہا گیا۔ "کرنٹ کے بغیر نہ تو فوجی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر سکتے ہو اور نہ تمہارے وہ کھلونے جنہیں تم ہوائی جہاز کہتے ہو، کرنٹ کے بغیر یہاں تک آ سکتے ہیں۔

اس لیے بہتر یہ ہے کہ میری باتیں توجّہ سے سُنو اور اپنی عقل کا ماتم کرو۔"

"مگر میں کہتا ہوں۔" انسپکٹر نے پھر بولنے کی کوشش کی۔

"خاموش۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، کہ تمہارے بکواس سُنیں۔" بلب میں سے ہیبت ناک طریقے سے ڈانٹنے کی آواز آئی۔

میں نے اشارے سے انسپکٹر کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور بلب کی طرف اپنا مُونہہ کر کے بولا۔ "مجھے بتایا جائے کہ پورے ہندوستان میں صرف مُجھ سے بات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"پھر کس سے بات کی جائے، ہمیں نقصان آپ ہی نے پہنچایا تھا اور اب ہم اس نقصان کا بدلہ لیں گے۔ آپ کا عزیز دوست شاگو جس نے آپ کی مدد کی تھی اور اس نے آپ کو بے انتہا دولت بھی دی ہے، اس وقت ہماری قید میں ہے، میں ابھی اس کا حشر آپ کو دکھاتا ہوں۔ وفادار جکاری

کی آنکھ سے نکلتی ہوئی روشنی کو دیکھئے جو آپ کے کمرے کے سامنے والی دیوار پر سنیما فلم کی طرح پڑے گی۔ یہ ہمارے ہاں کا وژن سنیما ہے۔ دیوار پر آپ شاگو کو بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں، اسے گرفتار ہوئے آپ کی گھڑیوں کے حساب سے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے۔۔۔"

دیوار پر بالکل سنیما کے پردے کی طرح ایک تصویر نظر آرہی تھی، اور یہ تصویر واقعی جکاری کی آنکھ سے نکلتی ہوئی روشنی نے بنائی تھی، یوں لگتا تھا جیسے جکاری کی آنکھ ایک سنیما مشین تھی اور دیوار سنیما کا پردہ۔ اس تصویر میں ہمارا رحم دِل دوست شاگو صاف نظر آرہا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے، شاگو سیّارہ زہرہ میں جیگا کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو پسند نہیں کرتا تھا۔ جیگا کے مرنے کے بعد شاگو کی مخالف پارٹی نے یقیناً اسے گرفتار کرنے کا ارادہ کیا ہوگا اور جس وقت ہم لوگ شاگو کو دیکھ رہے تھے، اس سے پانچ منٹ پہلے وہ گرفتار ہو چکا تھا اس کی شکل و صورت میں ذرا سی بھی

تبدیلی نہیں ہوئی تھی، وہ یقیناً اتنا ہی قدر آور تھا۔ البتّہ صورت اس کی ویسی ہی تھی جیسی ہم لوگ "کالی دُنیا" والے سفر میں دیکھ چکے تھے۔

"کہئے دیکھ لیا آپ نے؟" بلب میں سے آواز آئی۔

"دیکھ لیا۔ مگر میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ "میں نے کہا۔

"وجہ؟"

"تمہارا مقصد اپنے ملک میں خونی انقلاب لانا ہے اور شاگو کا مقصد امن کے سوا کُچھ نہیں ہے۔"

"امن کی خواہش تو تمہاری زمین کے رہنے والوں کو ہے، ہمارے ہاں اس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

بلب میں سے ہنسی کی آواز آئی، اچانک مُجھے ایک بات یاد آئی، میں نجمہ

کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا اور جب میں نے اس کا جواب چاہا تو چمکیلے غبارے میں سے آواز آئی۔

"میں ٹھیک ٹھیک وجہ تو نہیں بتا سکتا، صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کے جسم کو آفاقی ہار کے دانے چھُو چکے ہیں اور وہ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔"

آفاقی ہار کو شاید میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا، مُجھے اچھّی طرح یاد تھا کہ اس ہار نے کالی دُنیا والے سفر میں کیا کام دکھایا تھا۔ یہ ہار شاگو نے ایک خاص مشین کے ذریعے مُجھے بھیجا تھا اور بتایا تھا کہ وہ ہار نجمہ کو پہنا دوں نجمہ کے جسم سے لگتے ہی آفاقی ہار کے دانوں کی قوّت بڑھ جائے گی۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا اور اسی ہار کی بدولت برف کے قدِ آور دیو اور بدنام سائنس داں جیگا کا خاتمہ ہوا تھا۔ نہ دکھائی دینے والی لہریں اِن دانوں سے نکلی تھیں اور جیگا ختم ہو گیا تھا۔ مُجھے ایک ایک بات اچھّی طرح یاد تھی، اس لیے میں نے

جب جکاری کی طرف مُونہہ کر کے یہ پوچھنا چاہا کہ بھلا زہرہ سے اتنی دور یہاں زمین پر رہتے ہوئے نجمہ ان لوگوں کے لیے کس طرح خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ تو بلب میں سے پھر سے ہنسی کی آواز آئی اور کسی اور نے کہا۔

"میں آپ کی باتوں میں نہیں آ سکتا۔ اور نہ اس کے علاوہ مزید کُچھ بتا سکتا ہوں، ویسے اس کا اطمینان دلا سکتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی اور وہ ہمارے پاس محفوظ رہے گی۔ البتّہ آپ لوگوں کے بارے میں میں کُچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟ مُجھے کیا خطرہ ہے؟"

"ابھی پتہ لگ جائے گا، آپ نے اگر اس خطرے کا مُقابلہ کر لیا تو آپ یقیناً محفوظ رہیں گے۔ میرا مشن تو یہی تھا کہ آپ کو آگاہ کر دوں کہ جلد ہی آپ پر حملہ ہونے والا ہے۔ حملہ کون کرے گا؟ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ مگر مُجھے

اس کا یقین ہے کہ آپ کے شہر والے اس قدر پریشان ہوں گے کہ آپ کا دِل چاہے گا کہ ان کی پریشانی دیکھ کر خودکشی کرلیں۔"

"مگر وہ حملہ کیسا ہوگا؟" انسپکٹر رانا نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"عنقریب پتہ لگ جائے گا، اچھّا اب شاکا کو اجازت دیجئے، فیروز صاحب اور حملہ کا انتظار کیجئے۔"

تصویر غائب ہوگئی اور جکاری کی آنکھ سے وہ روشنی نکلنی بند ہوگئی اس کے ساتھ ہی اس کے سر پر ہوا میں لٹکا ہوا بلب مدھم ہونا شروع ہوا، جب اس کی روشنی کم ہوگئی تو جکاری اور زوک کا جسم بھی ہوا میں تحلیل ہونے لگا، آہستہ آہستہ یہ جسم بالکل غائب ہو گئے اور پھر وہ چمک دار غبار بھی تیزی کے ساتھ روشن دان کی طرف بڑھنے لگا۔

چند لمحوں بعد وہاں کُچھ نہ تھا، وہی دیوار تھی اور وہی سازوسامان تھا۔ انسپکٹر

اور سُراغ رساں دوڑتے ہوئے اس مقام پر گئے، مگر اب وہاں کیا تھا، کُچھ بھی نہیں۔ بڑی دیر تک وہ دونوں بیٹھے مُجھ سے باتیں کرتے رہے، وہ بے حد ڈرے اور سہمے ہوئے تھے، اور ان کی سمجھ میں کُچھ بھی نہیں آتا تھا کہ وہ حملہ کیسے ہوگا؟ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی لاعلم تھا۔ زرینہ، سوامی، اور اختر خاموش کھڑے ہوئے ہماری باتیں سُن رہے تھے۔ ابھی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک بجلی واپس آ گئی۔ انسپکٹر مُجھ سے یہ کہہ کر وہ جلد ہی واپس آئے گا، سُراغ رساں کے ساتھ واپس چلا گیا۔

نجمہ کے بارے میں یہ سن کر کہ وہ زہرہ کے لوگوں کی قید میں ہے، زرینہ بہت پریشان تھی، مگر میں اب یہ تہیّہ کر چکا تھا کہ ان آفتوں اور پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مُقابلہ کروں گا۔ نہ جانے مُجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ میں نے زرینہ کی ڈھارس بندھائی۔ میں نے اسے بتایا کہ نجمہ کے ساتھ امجد بھی ہے اور امجد بزدل ہرگز نہیں ہے۔ زہرہ کے جکاری اور

زوک کو زرینہ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے مُجھے بتایا کہ نہ جانے کس طرح وہ اپنے دِل کو قابو میں کیے کھڑی رہی ورنہ اس پر تو اتنی دہشت سوار تھی کہ وہ یقیناً چیخ کر باہر بھاگ جاتی۔

دوسرے دِن ایک اور واقعہ ہوا۔

میری عادت ہے کہ میں صُبح سویرے اُٹھ جاتا ہوں، خُدا تعالیٰ کے حضور توبہ کرتا ہوں، اس کی عبادت کرنے کے بعد دوسرے کاموں میں لگ جاتا ہوں۔ اختر بھی اس موقع پر میرے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس دِن بھی وہ میرے ساتھ موجود تھا، آج اس نے اپنے گلے میں پولارائیڈ کیمرہ ڈال رکھا تھا۔ یہ کیمرہ فوراً ہی تصویر کھینچ کر دکھا دیا کرتا ہے، ابھی ایک سیکنڈ میں تصویر کھینچو اور فوراً ہی دوسرے سیکنڈ میں تصویر دیکھ لو۔ یہی کیمرہ اختر کے گلے میں پڑا ہوا تھا، میں نے جب اس کی وجہ پوچھی تو بولا۔

"ابّا جی۔ اگر اتّفاق سے جکاری اور زوک دوبارہ آ گئے تو میں ان کی تصویر کھینچ لوں گا۔"

"مگر اس سے فائدہ بیٹے۔"

"اخباروں میں میری اور آپ کی تصویریں تو چھپی ہیں، مگر عوام نہیں جانتے کہ جکاری کیا بلا ہے اور وہ کیسے ہوتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ باغ میں چلا گیا اور میں نجمہ کے بارے میں سوچتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ اسے آزاد کرانے کے طریقے سوچ رہا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جان کو ٹرنک کال کر دوں اور یہ سب باتیں اسے بھی بتا دوں، یہ تہیّہ کر کے میں ٹیلی فون کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک اختر خُوشی خُوشی اندر آیا۔ اور مُجھے ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"ابّا جی، یہ دیکھئے، باغ میں آج ایک بہت بڑی تتلی آئی ہے، پھول اس

کے مقابلے میں کتنا چھوٹا نظر آ رہا ہے۔"

تصویر دیکھ کر مُجھے بڑا اچنبھا ہوا، میں اس کے ساتھ باہر جا کر وہ تتلی دیکھنے کے ارادے سے جیسے ہی کھڑا ہوا، اچانک ٹھٹھک کر رہ گیا۔

دروازے میں سے چند مکھّیاں اندر آ رہی تھیں، یہ مکھّیاں غیر معمولی طور پر بڑی تھیں، دور سے بھونرا نظر آتی تھیں، لیکن تھیں مکھّیاں۔ یہ مکھّیاں دیوار پر آ کر بیٹھ گئیں، مگر یکایک یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ وہ مکھّیاں آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ کُچھ دِن پہلے اختر جب ایک منظر کی تصویر کھینچ رہا تھا تو میں اسے کیمرے سے تصویر کھینچتے ہوئے دیکھ کر مُسکرا رہا تھا، لیکن آج جب سے اختر نے یہ تصویر اتار کر مُجھے دکھائی تھی، تب ہی سے میری مُصیبتوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ منظر کی تصویر کو تو میں نے اشتیاق سے دیکھا تھا مگر اس تتلی والی تصویر کو دیکھ کر میرے دِل میں دہشت اور تھر تھری پیدا

ہو گئی تھی۔

میں ان مکھّیوں کو حیرت اور تعجّب سے کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میں آپ سے کُچھ چھپانا نہیں چاہتا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ مُجھے اپنے پچھلے سفریاد آنے لگے تھے۔ اور میرا دِل ایک خاموش دُعا کر رہا تھا۔۔۔ یا خُدا کیا اس پوری دُنیا میں میری ہی قسمت میں اس قسم کے حادثات سے دوچار ہونا لکھا ہے؟ خدایا جیسے تو نے مُجھے پہلے ان آفتوں سے بچایا ہے اس نئی مُصیبت سے بھی بچا۔۔۔

جو کُچھ میں نے دیکھا تھا وہ اختر بھی دیکھ چکا تھا۔ حیرت اور خوف کے باعث اس کی بھی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ سانس روکے ہوئے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں مکھّیاں بڑھتے بڑھتے چھوٹے سے مینڈک کے برابر ہو گئی تھیں اور بے حد گھناؤنی لگ رہی تھیں۔ ان کے پروں کی بھنبھناہٹ بھی تیز ہو گئی تھی اور کمرہ ایک مہیب سنسناہٹ سے گونجنے لگا

تھا۔ میں ٹکٹکی لگائے ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ اچانک سوامی اندر داخل ہوا۔ شاید اس نے مکھّیوں کو نہیں دیکھا تھا، اسی لیے اس نے کہا۔

"مالک! میں مچھرّ مار دوا کی بوتل تلاش کر رہا ہوں، نوکروں نے نہ جانے کہاں رکھ دی ہے۔" مُجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔ "اُدھر بی بی کے کمرے میں بہت بڑے بڑے مچھرّ آ گئے ہیں، شاید یہاں کی نئی نسل ہے۔ سچ مالک، میں نے اتنے بڑے مچھرّ آج تک نہیں دیکھے۔ میں اسی لیے تو مچھرّ مار دوا ڈھونڈتا پھر۔۔۔ مالک! کیا بات ہے، آپ کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا ہے اور بابا بھی نہ جانے۔۔۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے جواب دیتا، اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میری نظریں کس طرف تھیں۔ اور جب اس نے بھی مکھّیوں کی غیر معمولی جسامت کو دیکھ لیا تو تعجّب اور دہشت کے باعث گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"م۔۔م۔۔ مالک یہ کیا ہے؟"

مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا، اس لیے جواب کیا دیتا، سوامی جواب نہ پا کر پھر پوچھنے لگا۔ "اتنی بڑی مکھّیاں! مالک وہ مچھرّ بھی کافی بڑے تھے کیا یہ کوئی نئی مُصیبت ہے؟"

"کلو سوامی۔۔۔" اختر نے کپکپاتی آواز میں بڑی دیر کے بعد کہا۔ "میرے فوٹو کو دیکھو اس میں تتلی بھی بہت بڑی ہے۔"

"پھر تو آسمان پر وہ چڑیاں ہی اُڑ رہی ہوں گی جنہیں میں گِدھ سمجھا تھا۔"

سوامی کی یہ بات سن کر میں اچانک چونک گیا اور اسے سراسیمگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا کہتے ہو؟ کیا چڑیاں بھی بڑی ہو گئی ہیں؟"

"ہاں مالک، آسمان پر اور درختوں پر میں نے بہت بڑی بڑی چڑیوں کو اڑتے اور بیٹھتے دیکھا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ آج ہمارے باغ میں گِدھ یا

چیلیں آ کر بیٹھ گئی ہیں، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ تو چڑیاں ہیں اور نہ جانے کس طرح اتنی بڑی ہو گئی ہیں؟"

"آج کا دِن اچنبھوں کا دِن ہے، سوامی خُدا سے دُعا کرو کہ وہ ہماری مدد کرے۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

"ابّا جی۔۔ آپ کہیں تو میں ان مکھّیوں کو مار ڈالوں؟"

اس میں شک نہیں کہ میرا بیٹا اختر بہت بہادر تھا۔ مگر میں اسے اب نئی آفتوں میں دھکیلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اچھّی طرح سمجھ چکا تھا کہ زہرہ کی مخالف پارٹی کے لیڈر رشا کا کے اس جملے کا مطلب دراصل کیا تھا جو اس نے ایک دِن پہلے مُجھ سے کہا تھا۔ یعنی یہی کہ ہم پر حملہ ہونے والا ہے اور وہ حملہ اس قسم کا ہو گا کہ میں پریشانی کے عالم میں خود کشی کر لوں گا، تو کیا یہی تھا وہ حملہ؟ کیا زہرہ کے سائنس دانوں نے ہمارے ہندوستان پر دیو زاد جانوروں کی فوج سے حملہ کرانے کا منصوبہ بنایا تھا؟ میرے خُدا! اگر یہی

حقیقت ہے تو پھر اب کیا ہو گا؟ جب وہ لوگ مُجھے اور میرے ساتھیوں کو کُچھ ماہ پہلے پاتال کے ایک قید خانے میں صرف چند انچ کا بنا سکتے ہیں (تفصیل کے لیے ناول "کالی دُنیا" پڑھیے) تو معمولی سے قد والے جانوروں کو دیوؤں کا ساقد بھی دے سکتے ہیں۔

میری سمجھ میں کُچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور اس نئی آفت سے بچنے کے لیے کون سی تدبیر اور کون سا ذریعہ اختیار کروں؟ سوامی بھی احمقوں کی طرح کھڑا کبھی مُجھے اور کبھی دیوار پر بیٹھی ہوئی اِن مکّھیوں کو دیکھ رہا تھا جو اب کم ازکم چار انچ کے قریب بڑی ہو چکی تھیں۔ اُن کی بھِنبھِناہٹ اب ناگوار ہونے لگی تھی۔ اس بھِنبھِناہٹ میں وہ شور دب گیا تھا جو محل کے چاروں کونوں سے مُجھے بڑھتا ہوا سُنائی دے رہا تھا۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ محل کے ملازموں میں بھی بھگدڑ مچ گئی ہے اور وہ چلّا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مُجھے مختلف جانوروں کی تیز آوازیں بھی سُنائی دے رہی تھیں۔

اچانک مُجھے زرینہ کا خیال آیا۔۔۔ زرینہ کیا کر رہی ہے اپنے کمرے میں؟ کہیں وہ ان چیزوں سے زیادہ خوف زدہ نہ ہو جائے؟ میں نے سوچا کہ جلدی سے اس کے کمرے میں جاؤں اور اسے یہیں بلا لوں، میں یہ ارادہ کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ سوامی نے مُجھے روک کر ایک طرف اشارہ کیا اور پھر جو میں نے دیکھا وہ مُجھے حواس باختہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک چھپکلی رینگتی ہوئی مکھّیوں کی طرف بڑھ رہی تھی، اور یہ چھپکلی معمولی سی نہیں بلکہ ایک گز لمبی تھی۔ وہ بے حد خوفناک لگ رہی تھی۔ اس کی سفید سفید آنکھیں بجلی کے قمقموں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنی لمبی زبان نکال کر ایک مکھّی کو لپک کر اپنے حلق میں گھسیٹ لیا۔ اختر کراہت اور دہشت کے باعث ایک دم دیوار سے دور ہٹ گیا۔ سوامی نے دروازے پر لٹکانے والے پردے کا ڈنڈا نکال کر ہاتھ میں لے لیا، کیوں کہ اس کے علاوہ کمرے میں اور کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے تھے۔ میں زرینہ کی طرف بڑھ بھی نہ سکا جو بھیانک چیخیں مارتی ہوئی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی کمرے کے دروازے کی طرف آرہی تھی۔ میں نے جو کچھ دیکھا اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اف خدا۔۔۔ ایک معمولی سی بلّی، اُس کی پالتو بلّی، اب ایک خونخوار شیرنی بن کر اُس پر حملہ کرنے کے لیے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

زرینہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی، سوامی نے بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے فوراً دروازہ بند کر دیا اور اندر سے اسے بولٹ کر دیا۔ شیرنی نما

بلّی دروازے کو دھکیلنے لگی اور خوف ناک آواز میں غُرّانے لگی۔

ابھی میں کُچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک اختر نے چیخ ماری۔۔۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔ آہ کیا بتاؤں کیا دیکھا۔۔۔ دیوزاد چھپکلی مکھّیوں کو چٹ کر چکی تھی اور اب خونخوار نظروں سے اختر کو دیکھتی ہوئی اور دبے دبے پاؤں رکھتی ہوئی اس کی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کی زرد آنکھوں میں انسانوں کے خلاف نفرت صاف نظر آتی تھی۔ بار بار وہ اپنی پتلی سی زبان باہر نکالتی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اندر کر لیتی، اُس کی لمبی دُم بے قراری سے ہل رہی تھی۔ بالکل وہی سماں تھا جو ہم سب ایک بار پاتال میں ایک دیوزاد گرگٹ کے حملے کے وقت دیکھ چکے تھے۔ (ناول "کالی دُنیا" پڑھیے) اس وقت تو امجد کی بہادری کی وجہ سے ہماری جان بچ گئی تھی، مگر اس وقت صرف خُدا کی ہی ذات تھی جو

جانور بڑے ہو گئے تھے اور انہوں نے
شہر پر حملہ کر دیا تھا۔

ہمیں اس مُصیبت سے نجات دلا سکتی تھی۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، اختر بھی اب نَو عمر لڑکا نہیں رہا تھا، بلکہ اب اس کا قد اچھّا خاصا بڑھ چکا تھا۔ اس میں اتنی طاقت ضرور تھی کہ مُصیبت کے وقت اپنی حفاظت خود کر سکے۔ چھپکلی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گیا، لیکن پھر اچانک خطرے کا مُقابلہ کرنے کے لیے تیّار ہو گیا۔ میں اور زرینہ دروازے کے قریب کھڑے تھے اور سوامی اختر کی مدد کے خیال سے لپک کر اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔ سوامی میرے بچّوں کو کس قدر چاہتا تھا، اس کا اندازہ مُجھے اس وقت ہوا جب سوامی نے اختر کو کندھے سے پکڑ کر اپنے پیچھے کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

اختر نے اپنے کندھے جھٹک کر سوامی کو پیچھے دھکیل دیا اور پھر جلدی سے برابر ہی رکھی ہوئی ایک کرسی اٹھائی۔ بس یہ لکڑی کی کرسی ہی وہ ہتھیار تھی جس کے بھروسے پر اختر اس دیوزاد چھپکلی سے ٹکّر لینے کے لیے تیّار ہو گیا

تھا۔ چھپکلی نے اب اپنے مقام سے ایک جِست لگائی تھی، اُس کے جِست لگاتے ہی زرینہ زور کی ایک چیخ مار کر اختر کو بچانے کی خاطر اس کی طرف لپکی۔ لیکن میں نے فوراً اسے پیچھے گھسیٹ لیا۔

شاید آپ لوگ مُجھے بزدل سمجھیں گے کہ میں اپنے عزیز بیٹے کو موت کے مُونہہ میں جاتے دیکھتا رہا اور خود ایک کونے میں اپنی بیوی کو سہارا دیئے کھڑا رہا۔ لیکن درحقیقت یہ بات نہیں ہے میں خطروں کی چکّی میں پِس کر اب کُندن بن چُکا تھا۔ بہت کُچھ کھو کر میں نے ایک چیز حاصل کی تھی اور وہ چیز تھی اوسان! میں جانتا تھا کہ ایسے موقعوں پر اوسان کتنے کام آتے ہیں۔ آدمی سے ذرا بھی چُوک ہو جائے تو وہ نقصان اٹھا سکتا ہے، اس لیے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اوسان ہارنے سے بہتر یہی ہے کہ اختر اور سوامی کو اکیلے اِس بلا کا مُقابلہ کرنے دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عرصے میں مُجھے کوئی طریقہ سوجھ جائے اور میں ان دونوں کی مدد کر سکوں۔

چھپکلی ہوا میں چھلانگ لگا کر اختر کے اوپر آئی اور اختر نے کرسی کی ڈھال بنا کر اُسے روکا۔ چھپکلی فرش پر گِرتے ہی پھر سنبھلی اور اِس بار اُس نے اُچھل کر اختر کی ٹانگ مُونہہ میں دبانے کی کوشش کی۔ مگر اختر چونکہ پہلے ہی سے ہوشیار تھا، اس لیے اس نے جلدی سے اپنی ٹانگ پیچھے کھینچ لی، اور پھر فوراً ہی کرسی چھپکلی پر دے ماری۔ لیکن شاید ہماری قسمت خراب تھی، کرسی چھپکلی کی کمر پر گِرنے کی بجائے پختہ فرش پر گری، کیوں کہ اتنے سے وقفے میں چھپکلی کروٹ لے کر کرسی کی زد سے باہر نکل چکی تھی۔

مکھّیوں کی تیز اور گونجتی ہوئی بھنبھناہٹ اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ویسے بھی عام حالات میں ہم ننّھی سی مکھّی کا بوجھ اپنے جسم پر برداشت نہیں کرتے اور جب بھی کوئی مکھّی ہمارے جسم کے کسی حصّے پر بیٹھتی ہے تو ہم اسے فوراً اُڑانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس وقت کمرہ جن مکھّیوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا، وہ کوئی معمولی مکھّیاں نہیں تھیں

بلکہ بڑھتے بڑھتے وہ اب مرغی کے انڈے سے بھی بڑی ہو چکی تھیں۔ اور ستم یہ تھا کہ یہ مکّھیاں بھی اب ہم پر حملہ کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک مکّھی نے جب زرینہ کے منہ پر بیٹھنے کی کوشش کی تو خوف زدہ ہو کر اس نے جلدی سے دروازے پر پڑے ہوئے پردے سے اپنا منہ چھپا لیا۔ مکّھی نے اپنے شکار کو بھاگتے دیکھ کر رُخ پلٹا اور میری طرف متوجّہ ہوئی، جیسے ہی وہ بھن بھن کرتی ہوئی میرے قریب آئی میں نے صوفے پر پڑا گدا اٹھا لیا اور تاک کر اسے مارا نتیجہ ظاہر تھا۔ مکّھی دیوار سے جا کر ٹکرائی اور فوراً مر گئی۔

لیکن کمرے میں صرف ایک ہی مکّھی تو نہیں تھی اور بھی بہت سی مکّھیاں اِدھر سے اُدھر چکّر لگا رہی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ مکّھیوں سے نمٹنا کُچھ زیادہ مُشکل نہیں ہے میں اختر کی طرف متوجّہ ہوا۔ ساتھ ہی میں نے زرینہ کو ہدایت دی کہ وہ اِسی طرح پردے میں لپٹی رہے۔ دروازے پر خوفناک بلّی

کی غرّاہٹ اور کھسیا کر دروازہ نوچنے کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔
ساتھ ہی بلّی دروازے کو بار بار دھکا بھی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے
دروازہ اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا! زرینہ ان آوازوں کو سُن کر سہم گئی تھی اور
بدستور پردے کے اندر لپٹی ہوئی تھی۔

چھپکلی ابھی تک اپنی خوفناک زبان نکال کر بار بار اختر کو ندیدے انداز سے
دیکھ رہی تھی۔ سوامی نے بھی اختر کی دیکھا دیکھی ایک کرسی اٹھا لی تھی اور
موقع دیکھ رہا تھا کہ کب چھپکلی اس کی زد میں آتی ہے، چھپکلی تو اس کی زد
میں جب آتی، تب آتی، اتفاقاً میں ہی ایک دوسری چھپکلی کی زد میں آچکا
تھا۔ مُجھے خبر بھی نہ ہوئی اور چھت پر سے ایک منحوس چھپکلی اچانک
میرے اوپر کُودی، جیسے ہی ایک بوجھ سا مُجھ پر آیا، میں نے گھبرا کر اپنے
کندھے جھٹکے اور بے اختیار اپنے ہاتھوں سے اس بھیانک عفریت کو اٹھا
کر دور پھینک دیا۔ میرے خُدا کتنی بدبُو تھی اس میں اور کس قدر گھناؤنی تھی

وہ!

کچھ ہی دیر بعد مُجھے یہ احساس ہوا کہ کمرے کی تینوں چھپکلیاں اب ہماری دُشمن بن چکی ہیں۔ اور شاید انہوں نے سازش کر کے ایک ساتھ حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ کیوں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اب وہ تینوں ایک مقام پر جمع ہو چکی تھیں اور اپنی لمبی لمبی زبانیں ایک دوسرے کی طرف بڑھا کر یہ مشورہ کر رہی ہیں کہ حملہ کس طرح کیا جائے؟ ہم سب کے لیے یہ صورت حال بہت نازک تھی۔ میری عقل حیران تھی کہ کیا کروں، اگر مُجھے علم ہوتا تو اپنی رائفل ہی اپنے کمرے میں سے لیتا آتا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ ایسا وقت آنے والا ہے۔ جب مُجھے مگر مچھ سے بھی بڑی چھپکلیوں کا مُقابلہ کرنا ہوگا اور میں ان کے آگے خود کو بے بس و لاچار سمجھوں گا۔

زرینہ نے بھی شاید بُزدلوں کی طرح خود کو پردے کے پیچھے چھپانا اچھّا نہیں سمجھا۔ وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ سوامی کے ہاتھ میں پہلے ایک

ڈنڈا تھا، جسے چھوڑ کر اس نے اختر کی طرح کرسی ہاتھوں میں اٹھا لی تھی۔

وہی ڈنڈا اب زرینہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خوفزدہ نظروں سے کبھی کمرے میں چاروں سمت گھومتی ہوئی مکھیوں کو دیکھنے لگتی اور کبھی چھپکلیوں کو۔ چھپکلیاں آہستہ آہستہ اپنے پنجے بڑھا رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے ایک زبردست جست لگائی اور ہم پر ایک ساتھ حملہ آور ہوئیں۔ ہم تینوں ان بلاؤں کو اپنے جسم سے دور پھینک دینے کی کوشش کرنے لگے اور بے چاری زرینہ باری باری ہر ایک چھپکلی کی کمر پر ڈنڈے بجانے لگی۔ ایسا مکروہ اور دم گھونٹ دینے والا سانس ان چھپکلیوں کے منہ سے نکل رہا تھا کہ میں کیا بتاؤں، میں کوشش کر رہا تھا کہ جلد سے جلد اس منحوس بلا کو اپنے جسم سے علیحدہ کر دوں اور آخر کار میں اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر پھر یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ ایک چھپکلی نے اختر کو زمین پر گرا لیا ہے اور اب وہ بھیانک جبڑوں میں اختر کے سر کو دبوچ لینے کی

کوشش کر رہی ہے، یہ دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا، یقیناً وہ خُدا کی ہی مدد تھی جس کے باعث میرے ذہن میں اچانک وہ خیال آیا جو بعد میں ہم سب کی جانیں بچانے کا باعث بنا۔

اختر کو اس حالت میں دیکھتے ہی دُنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی، میں نے گھبرا کر اوپر دیکھا کہ کہیں بجلی پھر تو نہیں چلی گئی۔ لیکن میرے محل میں بجلی موجود تھی۔ ایسے ہی موقعوں کے لیے میں بجلی بنانے کا جنریٹر محل میں لگا رکھا تھا۔ جب کبھی شہر کی بجلی فیل ہوتی تو ملازم اسے چلا دیا کرتے تھے، پہلے شاید وہ بھول گئے تھے مگر اب جنریٹر چل رہا تھا اور میرے محل میں بجلی برابر آ رہی تھی۔ بجلی کا لفظ ذہن میں آنا تھا کہ یکایک مُجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ کونے میں ایک بڑا ٹیبل لیمپ رکھا تھا، میں نے جلدی سے بڑھ کر لیمپ سے تار نوچ لیا، بڑی تیزی کے ساتھ دانتوں سے اس کے دونوں تار چھیلے اور تار کے دونوں سروں کو الگ الگ کر کے دیوار

میں لگا ہوا سوئچ کھول دیا۔ اب تار کے ننگے سروں پر کرنٹ موجود تھا۔

میں نے بڑی پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر یہ دونوں ننگے تار چھپکلی کی کمر سے لگا دیے۔ ۲۲۰ وولٹ کا ایک زبردست جھٹکا اُسے لگا اور اس نے گھبرا کو اختر کو چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک کریہہ آواز اُس کے مُنہ سے نکلی اور پھر وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ اپنی ایک ساتھی کا حشر دیکھ کر باقی دونوں چھپکلیوں نے اپنے بد ہیبت پنجے سوامی کی گردن میں گاڑنے شروع کر دیے۔ میں بجلی کے ننگے تار سے ان دونوں کی تواضع کرنی بھی ضروری سمجھی اور پھر ان کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی چھپکلی کا ہوا تھا۔

اختر نے خُوشی کا نعرہ لگایا اور زرینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اب سوامی کی طرف متوجّہ ہوا۔ وہ اپنی گردن دبا رہا تھا۔ چھپکلی کے نوکیلے پنجوں نے اُس کی گردن کو نوچ لیا تھا اور کئی جگہ سے خون رِس رہا تھا۔ میں نے اپنے رومال سے اس کا خون پونچھا اور پھر اختر

سے کہا۔

"مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ ایسا ہی ایک بہت لمبا تار ہال کے دوسرے کونے میں رکھا ہے۔ تم فوراً اسے نکال کر کھول لو اور اس کے دونوں سِرے چھیل لو، ہم اب اس کمرے سے باہر چلیں گے۔"

"مگر ابّا جی باہر تو قیامت آئی ہوئی ہوگی۔"

"تو پھر ہم کب تک یہاں بُزدلوں کی طرح بیٹھے رہیں گے۔ محل میں اور بھی لوگ ہیں، نہ جانے ان کا کیا حشر ہو رہا ہے، ہمیں ان کی بھی مدد کرنی ہے۔"

"مالک ٹھیک کہہ رہے ہیں، بابا۔" سوامی نے گردن سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس بجلی کے ہتھیار سے ہم دیو زاد جانوروں کو روک سکتے ہیں۔ موقع ملتے ہی میں مالک کی رائفل لے آؤں گا۔ اور پھر جب تک دم میں دم ہے اِن بلاؤں سے ٹکّر لی جا سکتی ہے۔"

اختر نے اثبات میں گردن ہلائی، اور پھر فوراً ہی تار نکال لیا۔ لمبے سے ڈنڈے کے ساتھ ہم نے یہ تار باندھ دیا اور اس کے دونوں سرے ننگے کر دیے۔ بورڈ سے تار لگانے کے بعد سوئچ آن کر کے میں نے یہ ڈنڈا اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پھر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے سوامی سے کہا کہ وہ دروازہ کھول دے۔ زرینہ اور اختر میرے پیچھے تھے اور اختر نے احتیاطاً کرسی پھر اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی بلّی نے غرّا کر اپنا سیدھا پنجہ مُجھے پکڑنے کے لیے بڑھایا۔ مگر ایسا کرنے سے بجلی کے تار اس کے پنجے سے چھو گئے، اس کے منہ سے بڑی بھیانک میاؤں کی آواز نکلی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت وہ معمولی سی پالتو بلّی گدھے کے برابر اونچی اور ببّر شیر جتنی بڑی ہو گئی تھی، قد کے لحاظ سے اس کی آواز بھی بہت بڑی نکلی۔ اس نے دوبارہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر کرنٹ لگتے ہی اچھل

کر دور ہٹ گئی۔ کُچھ دیر تک وہ ہمیں کھڑی ہوئی گھورتی رہی اور پھر وہی زوردار میاؤں کی آواز نکال کر بھاگتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔

اب ہمیں کم ازکم اتنا موقع مل چکا تھا کہ ہم باہر کے حالات کا جائزہ لے سکیں۔ یوں لگتا تھا گویا قیامت آگئی ہے۔ شہر کے ہر طرف سے زبردست شور اٹھ رہا تھا۔ آسمان پر ہزاروں پرندے اُڑ رہے تھے۔ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ پرندے بہت بڑے تھے۔ میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ مختلف پرندے ایک دوسرے پر جھپٹ بھی رہے تھے۔ ان پرندوں کے درمیان مُجھے بمبار جہاز بھی نظر آئے جو ان دیو زاد پرندوں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ مُجھے یہ دیکھ کر کافی اطمینان ہوا، ہماری ہوائی فوج اب حرکت میں آچکی تھی۔ اور چُن چُن کر ان پرندوں کو ختم کر رہی تھی جو انسانوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ عقاب اور شکرے جیسے جانوروں کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

آپ میری اس داستان کو آگے پڑھنے کے آرزومند ہوں گے لیکن میں فی الحال رُک کر آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت شہر کی کیا حالت تھی؟ یہ باتیں گو مُجھے بعد میں معلوم ہوئیں لیکن میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ یہاں میں ان باتوں کو بیان کروں۔

شہر میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر جانور بھی بے حد خطرناک ہو چکے تھے۔ مچھرّ اور چیونٹیاں بڑھ کر مُرغی کے برابر ہو گئی تھیں۔ اور ان چیونٹیوں نے دکانوں اور مکانوں پر ہلّہ بول دیا تھا۔ شکر کے گودام منٹوں اور سیکنڈوں میں صاف ہو گئے تھے۔ مچھرّوں کی سونڈ ایک لمبے سے خنجر کی طرح ہر ایک کو صاف نظر آتی تھی۔ مچھروں کے ڈسنے سے بہت سے آدمی مر گئے اور چیونٹیوں کے کاٹنے سے لوگوں کے جسم سوج کر سُرخ ہو گئے۔ سانپ بڑھتے بڑھتے اژدہے بن گئے تھے۔ جس چیز کو بھی یہ اژدہے اپنے شکنجے میں کس لیتے تھے۔ وہ فنا ہو جاتی

تھی۔ چوہے، کُتّے اور چڑیاں بھی خونخوار بن گئی تھیں۔ کُتّے بالکل شیر نظر آتے تھے۔ بھیڑیا بھی کیا خطرناک ہوگا جو یہ کُتّے ہو گئے تھے۔ انہوں نے راہ چلتے آدمیوں کو مار ڈالا تھا، اور لمبی لمبی زبانیں نکال کر وہ لگاتار اپنے شکار پر حملے کر رہے تھے۔

یہ حال تو چھوٹے جانوروں کا تھا مگر بڑے جانوروں نے تو جیسے زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ بیل، گھوڑے، گدھے جیسے پالتو جانور اتنے اُونچے ہو گئے تھے کہ ان کے قد اونچی اونچی عمارتوں سے بھی بڑھ گئے تھے۔ ان جانوروں کی صرف آواز سے ہی بہت سی عمارتیں گر پڑی تھیں اور جب انہوں نے دولتّیاں جھاڑی تھیں تو ہزاروں مکانوں کو زمین کے برابر کر دیا تھا۔ گھوڑے عمارتوں کے اوپر سے جِست لگا کر اِدھر سے اُدھر چلے جاتے تھے۔ اور جب وہ بھاگتے تو مکانوں کی اینٹ سے اینٹ بن جاتی تھی۔

پورے شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ فوج شہر میں گشت کر رہی تھی۔

اور جانوروں کا مُقابلہ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے کیا جا رہا تھا۔ جہاں بھی کوئی قدِ آور جانور نظر آتا تھا، توپوں کے لپکتے ہوئے شعلے اسے موت کی میٹھی نیند سلا دیتے تھے۔

پورے ہندوستان کی یہی حالت تھی، کئی شہروں میں تو بر وقت مدد بھی نہیں پہنچ سکی تھی، اور چھوٹے موٹے شہر بالکل نیست و نابود ہو گئے تھے۔ فوج بہت سی جگہوں پر قابو پانے میں ناکام رہی۔ دریاؤں اور سمندر میں بھی افراتفری مچ گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں وھیل مچھلی کے برابر ہو گئی تھیں۔ اور انھوں نے گودی میں کھڑے ہوئے جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔ غلّے سے لدے ہوئے کُچھ جہاز باہر کے ملکوں سے ہندوستان آ رہے تھے، ان جہازوں کا پھر پتہ ہی نہ چل سکا اور اس طرح لاکھوں من غلّہ سمندر کے بھوکے پیٹ کی نذر ہو گیا۔ ٹیلی فون اور بجلی کا سِلسِلہ ختم ہو گیا تھا، جانوروں نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کو توڑ مروڑ

کر رکھ دیا تھا اور بجلی گھروں پر دھاوا بول کر ان کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔

غرض ہندوستان کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ شاید کبھی نہ ہوئی ہو گی۔ پولیس اور فوج نے ہر شہر کا نظام سنبھال لیا تھا۔ مگر بربادی کا طوفان تھا کہ بڑی تیزی سے بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا۔

اتنی باتیں بتانے کے بعد اب میں اپنی اس بھیانک کہانی کو پھر شروع کرتا ہوں۔

بجلی کا تار ہاتھ میں لیے ہوئے میں تو وہیں کھڑا رہا، لیکن سوامی کو یہ ہدایت کی کہ وہ جلد سے جلد میرے کمرے میں سے رائفل نکال کر لائے۔ سوامی بھاگتا ہوا میری خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ مگر اس کے جاتے ہی ایک موٹے سے چوہے نے جواب بکری کے برابر ہو گیا تھا چھلانگ لگا کر زرینہ کی گردن دبوچ لی، زرینہ نے ایک بھیانک چیخ ماری اور وہ چوہے کے وزن

سے دب کر زمین پر گر پڑی۔ میں نے اس کی چیخ سن کر جلدی سے بجلی کا ننگا تار جو ہے کے بدن سے لگا دیا اور پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو چھپکلیوں اور بلّی کا ہو چکا تھا۔

آسمان توپ کے گولوں اور شعلوں کے دھوئیں سے کالا ہو گیا تھا۔ سورج کی روشنی بڑی مدھم ہو گئی تھی۔ پورے شہر سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں، میں یہ اندازہ اچھّی طرح لگا چکا تھا کہ جس طرح میں اپنے محل کے اندر ان جانوروں سے لڑ رہا ہوں، اسی طرح شہر کے دوسرے لوگ بھی اپنی جانیں بچانے میں مصروف ہوں گے۔ ایسے وقت میں اپنی مدد آپ والی کہاوت پر عمل ہو رہا ہو گا۔ یہ جو معمولی سی چیلیں آسمان پر اڑا کرتی ہیں اب اپنی جسامت سے پچاس گنا بڑی ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہاتھیوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ آسمان پر اڑنے لگے ہوں۔

زرینہ اور اختر میرے پیچھے کھڑے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

انہیں ڈر تھا کہ کہیں پھر کوئی اچانک حملہ نہ ہو جائے۔ سچ پوچھئے تو میری بھی یہی حالت تھی، بجلی کا تار ہاتھ میں لیے ہوئے میں بھی دیوانوں کی طرح دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں، یا شاید نہ بتایا ہو تو اب بتائے دیتا ہوں۔ میرا محل ایک اُونچے مقام پر تھا اور اس کی پشت پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، دائیں طرف پام کے قدِآور درختوں کے جھُنڈ تھے اور بائیں طرف کھلا ہوا میدان، جس میں ایک خوب صورت بل کھاتی ہوئی سڑک شہر کی سمت جا رہی تھی، اس لحاظ سے میرے پاس کسی بھی مدد کا پہنچنا بہت مُشکل تھا، مدد کے لیے اگر کوئی آنا بھی چاہتا تو شہر سے محل تک آتے آتے اسے ایک گھنٹہ لگتا۔ میں اس لیے بھی ڈر رہا تھا کہ بے دست و پا والی حالت میں کیا کر سکوں گا۔ بہر حال میں کُچھ نہ کُچھ کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آسمان پر اڑتی ہوئی دیو زاد چیلیں میرے محل کے اوپر منڈلا رہی ہیں، شاید ان کا ارادہ محل کے میدان

میں کھڑے ہوئے لوگوں پر حملہ کرنے کا تھا سچ پوچھئے تو میں سوچ رہا تھا کہ اگر ان دیو زاد چیلوں نے ہم پر حملہ کر دیا تو اس اچانک حملے سے بچنے کے لیے میرے پاس کوئی طریقہ ہی نہ تھا۔

سوامی رائفل ہاتھ میں لیے ہوئے بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا، اسے دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ مگر پھر اچانک ہی یہ خُوشی خاک میں مل گئی کیوں کہ میں نے دیکھا کہ یکایک ایک بہت بڑی چیل نے تیر کی طرح نیچے اتر کر سوامی پر حملہ کر دیا۔ سوامی نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے رائفل والے ہاتھ اُونچے کر دیے۔ چیل نے رائفل کو شاید ایک معمولی سا تنکا سمجھا اور اسے اپنے پنجوں میں دبوچ کر واپس آسمان کی سمت پرواز کر گئی۔ سوامی صرف دیوانوں کی طرح ہاتھ ہلا کر رہ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ اختر نے ایک چیخ ماری، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے، میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا کچھوا، گائے سے بھی بڑا کچھوا۔ اختر

کی ٹانگ اپنے منہ سے پکڑ کر اسے سمندر کی طرف گھسیٹ رہا ہے اور ویسا ہی ایک دوسرا کچھوا زرینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے بجلی کا ننگا تار اس کچھوے کی کمر سے لگا دیا جو اختر کو گھسیٹ رہا تھا مگر اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ میں نے پاگلوں کی طرح اس پر ڈنڈا بجانا شروع کر دیا مگر سب بے کار۔ کچھوے نے اختر کو نہیں چھوڑا۔ سوامی نے تھوڑی سی ہمّت کی اور وہ دوسرے کچھوے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، تاکہ کچھوا زرینہ کی بجائے اسے پکڑ لے۔ سوامی کی جاں نثاری دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا اور میں نے چلّا کر اس سے کہا کہ وہ زرینہ کو لے کر دور ہٹ جائے۔ زرینہ خود ہی کچھوے سے بچ رہی تھی اور اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بجلی کا ننگا تار کچھوے کی آنکھوں میں لگا دوں تو شاید وہ اختر کو چھوڑ دے۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک آسمان سے چند چیلیں اُڑ کر آئیں اور میرے سامنے اپنے پَر پھیلا کر

چیخنے لگیں۔ وہ کسی بھی لمحہ مُجھ پر حملہ کرنے والی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ میں نے دیکھا کہ میدان کی سمت سے پچاس فٹ اونچی گایوں کا ایک ریوڑ بڑی تیزی سے اس طرف آ رہا ہے۔ اگر یہ ریوڑ محل تک پہنچ جاتا تو محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ یہ ریوڑ دھول اڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ گایوں کے پیچھے کُچھ گھوڑے بھی تھے اور وہ بھی اتنے ہی اُونچے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک زبردست زلزلہ آ رہا ہو۔

محل کی زمین پر چند بڑے بڑے چیونٹے بھی رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ چیونٹے گدھے کے برابر اُونچے تھے۔ میرے خُدا! اب میں کیا کروں گا؟ خوف کے مارے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سوائے خُدا کے اب مُجھے اور میرے ملازموں کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ چیلیں بس حملہ کرنے ہی والی تھیں، پہلا کچھوا اختر کو منہ میں دبائے سمندر کے قریب پہنچ چکا تھا اور دوسرا زرینہ کو دبوچنے ہی والا تھا، گایوں کا ریوڑ محل کی حدوں میں

داخل ہو چکا تھا اور دیو زاد چیونٹے اپنا منہ کھولے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ بس ایک لمحہ کے اندر ہی میری تباہی یقینی تھی۔

چیلیں محتاط انداز سے میری طرف پھُدکتی ہوئی بڑھ رہی تھیں۔ جب وہ اپنی جگہ سے اچھل کر کُچھ آگے آئیں تھیں تو ان کی چھلانگ کم از کم پانچ میٹر کی ضرور ہوتی تھی، میرے دیکھتے دیکھتے دو بڑے چیونٹوں نے اپنی لمبی ٹانگوں سے میرے پیروں کو جکڑ لیا، خوف کے مارے میری گھِگھّی بندھ گئی۔ چیونٹوں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ مُجھ پلٹ کر گِرا دینا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں سے ایک نے اپنا ہیبت ناک مُونہہ پھاڑ کر میری ران منہ میں دبا لی۔ مُجھے یوں لگا جیسے ہزاروں تلواریں ایک ساتھ میرے جسم میں پیوست ہو گئی ہیں۔

درد کے باعث میری چیخ نکل گئی اور میں نے اس خیال سے کہ شاید سوامی یا اختر میری مدد کر سکیں ان دونوں کی طرف دیکھا، لیکن پھر یہ دیکھ کر

چیونٹے بھی بڑے ہو گئے تھے

ناامیدی کی وجہ سے میری روح تک لرز گئی کہ سوامی کو ایک بہت بڑی چیل اپنے پنجوں میں دبوچ کر اوپر ہوا میں اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ رہے زرینہ اور اختر، تو ان دونوں کا بھی اللہ حافظ تھا، کیوں کہ زرینہ کو ایک بہت بڑا کچھوا اپنے منہ میں دبائے سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس بیچ میں پہلا والا کچھوا اختر کو لے کر شاید سمندر میں نیچے بیٹھ چکا تھا۔

اپنی آنکھوں سے میں اپنی یہ بربادی دیکھ رہا تھا، لیکن بے بس تھا۔ پچاس فٹ لمبی گائیں محل کی کیاریوں کو روند رہی تھیں۔ اور اب کسی بھی لمحے میں محل زمین بوس ہونے والا تھا، دیوزاد چیونٹے میری ران کی تِکّا بوٹی کرنے میں مصروف تھے۔ میں تکلیف کے باعث بے ہوش ہونے ہی والا تھا کہ اچانک مُجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ مُجھے یوں لگا جیسے سوامی اپنے وزن کی وجہ سے آہستہ آہستہ زمین کی طرف واپس آ رہا ہے اور جس چیل نے اپنے نوکیلے پنجوں سے اسے دبوچ رکھا تھا وہ شاید چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔

موت کے وقت انسان کو ایک آس یہ بھی ہوتی ہے کہ شاید وہ کسی طرح بچ جائے! اور غالباً میں بھی اس قسم کی باتیں سوچنے لگا تھا، پہلے تو میں سمجھا کہ یقیناً یہ میرا وہم ہے لیکن جب مُجھے اپنی ران کی تکلیف بھی کم محسوس ہونے لگی تو میں نے شدید درد کے باعث بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو رہی سہی قوّت صرف کر کے کھولا اور پھر اپنی ٹانگوں میں لپٹے ہوئے چیونٹوں کو دیکھا۔ ۔ وہ چیونٹے آہستہ آہستہ بہت ہی چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ ۔ یقین جانیے گا بڑی تیزی سے چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔

جو چیل مُجھ پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہی تھی اور جو کُچھ دیر پہلے غیر معمولی بڑی نظر آتی تھی اب اپنی اصلی جسامت پر واپس آتی جا رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مُجھ پر حملہ کرنے سے کترانے لگی ہے۔ چیونٹے بھی بہت چھوٹے ہونے لگے تھے اور چند سیکنڈ بعد وہ بالکل ہی چھوٹے، یعنی اصل میں جتنے لمبے ہوتے ہیں بس اتنے ہی ہو گئے۔ میں نے جلدی

سے جھک کر انہیں پیر سے مسل دیا اور پھر تیزی سے زرینہ کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے مُجھے تکلیف تو بے شک ہوئی، مگر زیادہ نہیں بس یوں لگ رہا تھا جیسے ران میں ایک چھوٹا سا زخم ہو گیا ہے اور تکلیف دے رہا ہے۔

میرے دیکھتے دیکھتے زرینہ نے اپنے پیر کو بڑے زور سے جھٹکا اور اس جھٹکے کی وجہ سے وہ پچھوا جو پہلے بہت بڑا تھا اور اب عام سائز کا ہو چکا تھا زرینہ کے انگوٹھے کو چھوڑ کر دور جا گرا تھا اور اپنی جان بچانے کی خاطر سمندر کی طرف جلدی جلدی کھسک رہا تھا۔ سوامی کی ٹانگوں میں البتّہ چوٹ آئی تھی کیوں کہ دیوزاد چیل اسے دبوچنے کے بعد زمین سے تقریباً سو فٹ بلند ہو چکی تھی اور جب وہ چھوٹی ہونی شروع ہوئی تو سوامی کے وزن کی وجہ سے تیزی سے نیچے کی طرف آنے لگی۔ اِس عرصہ میں اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ ایک معمولی سی چیل ہے۔ اس لیے اس نے سوامی کو چھوڑ دیا

تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوامی تقریباً پچاس فٹ کی بلندی سے زمین پر ِگرا تھا اور یوں اُس کے پیر میں موچ آگئی تھی۔ گایوں کا ریوڑ بھی اب چھوٹا ہو گیا تھا اس لیے وہ بھی گھوڑوں کے ساتھ گھبرا کر واپس میدان کی سمت بھاگ رہی تھیں۔

خُدا جانے یہ کیا ہوا تھا؟ مُجھے یقین تھا کہ یہ مدد ضرور خُدا کی طرف سے آئی تھی ورنہ کسی انسان میں تو یہ قوّت تھی نہیں کہ ان آسمانی بلاؤں سے ہمیں نجات دِلا سکتا!

جب تک میں زندہ ہوں، سوامی کی ہمّت اور محبّت کی قدر کرتا رہوں گا کیوں کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے پاؤں میں موچ آگئی ہے، وہ لنگڑاتا ہوا سمندر کی طرف بھاگا، وہ اختر کا حشر دیکھ چکا تھا اور ہر ممکن طریقے سے اسے بچانا چاہتا تھا، زرینہ کو اپنے ساتھ لے کر میں بھی سمندر کی طرف دوڑنے لگا۔ زرینہ کے پاؤں کے انگوٹھے میں کافی درد تھا کیونکہ دیو زاد

کچھوے نے اس کا انگوٹھا ہی دبوچا تھا زرینہ کی حالت دیکھ کر میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ آہستہ آہستہ کنارے تک آئے، میں اتنے جلد سے جلد وہاں پہنچتا ہوں۔

سوامی کی مدد سے میں نے ساحل کا کونا کونا چھان مارا مگر اختر کا کُچھ پتہ نہ چل سکا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ سوامی ملّاح تھا اور ملّاح بڑے عمدہ تیراک اور غوطہ خور ہوتے ہیں۔ اس لیے سوامی نے میری اجازت کے بغیر ہی سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ میں احمقوں کی طرح اس مقام کو دیکھتا رہا، جہاں سوامی غائب ہوا تھا۔ میرا دِل اندر ہی اندر رو رہا تھا، بھلا اتنے بڑے سمندر میں اختر کا پتہ کس طرح لگایا جا سکتا ہے؟ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ سوامی نے اسے ڈھونڈ بھی نکالا تو کیا وہ اب تک زندہ ہو گا!

میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ آسمان پر لاتعداد بمبار جہاز پرواز کر رہے تھے اور انھوں نے جانوروں پر جو گولے برسائے تھے ان کے دھوئیں سے

دور کی چیزیں بالکل نظر نہ آتی تھیں۔ سمندر پر بھی یہ دُھند پھیل چکی تھی اور اِس دُھند کے باعث میں دور کی چیزیں صاف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے کُچھ دیر بعد سوامی کا بھی پتہ نہ چل سکا۔ اچانک مُجھے اپنے سر پر ہیلی کاپٹر کی آواز سُنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ کُچھ لوگ ہیلی کاپٹر کو نیچے اتار رہے ہیں اور بار بار مُجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ دُھند کی وجہ سے میں ان کی شکلیں صاف طور سے نہیں دیکھ سکا۔ ان کے استقبال کے لیے میں سمندر کے کنارے سے ہٹ کر میدان کی سمت آ گیا۔

میں بچپن سے لے کر اب تک اتنے خطروں اور آفتوں سے دوچار ہوا ہوں کہ ہر نئے خطرے کو ہنستے مسکراتے قبول کر لیتا ہوں، کسی بھی آفت سے پریشان ہونے والی کیفیت عارضی ہوتی ہے اور پھر نہ جانے کیا بات ہوتی ہے کہ دِل آپ ہی آپ قابو میں آ جاتا ہے۔ سوامی اور اختر کے سمندر میں غائب ہو جانے کے بعد بھی میری یہی کیفیت ہوئی۔ میں خُدا پر شاکر رہنے

کے بعد اس ہیلی کاپٹر کو دیکھنے لگا، جواب زمین پر اُتر چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں سے دو قد آور آدمی اُتر رہے تھے، ایک شخص جو کافی بُوڑھا معلوم ہوتا تھا دوڑتا ہوا زرینہ کی طرف لپکا۔ میں نے دیکھا کہ زرینہ بھی آگے بڑھ کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں سما گئی۔ دوسرا شخص مُسکراتا ہوا اب میری طرف آ رہا تھا۔

میں ان دونوں کو پہچان چکا تھا، انہیں دیکھتے ہی میری باچھیں کھل گئی تھیں، وہ دونوں میرے بزرگ جان اور افریقی جیک کے علاوہ اور کوئی نہ تھے!

جان زرینہ کو ساتھ لیے ہوئے میری طرف آ رہا تھا اور پھر میں بھی بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ گیا۔ اس سے پہلے میں جیک سے بغل گیر ہوتے وقت تقریباً رونے لگا تھا۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، اس شخص نے بھی میرے پچھلے سفروں میں میری بڑی مدد کی تھی۔ جان مُجھے

تسلّی دے رہا، جب میں نے اسے سمندر کی طرف اشارہ کر کے اختر اور سوامی کے بارے میں بتلایا تو وہ بے چین ہوگیا۔ پھر اس نے جلدی سے جیک کو حُکم دیا کہ وائرلیس کے ذریعہ نیوی سے رابطہ قائم کرے اور سمندر کا ایک ایک حصّہ چھان مارے۔ جیک نے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سے اس سِلسلے میں جا کر بات کی اور پائلٹ نے فوراً ہیڈ کوارٹر تک یہ خبر پہنچا دی۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم لوگ محل کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زرینہ بری طرح رو رہی تھی کیونکہ اس کے دونوں بچّے اختر اور نجمہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں زرینہ کو تسلّی بھی دیتا جاتا تھا اور جان کو کُچھ دیر پہلے پیش آئے ہوئے واقعات بھی بتاتا جا رہا تھا۔ جان بڑی توجّہ اور انہماک سے میری باتیں سُن رہا تھا۔ ابھی تک نہ میں نے پوچھا تھا اور نہ اس نے بتایا تھا کہ وہ اچانک میری امداد کے لیے اتنی دور، یعنی امریکہ سے

کس طرح آ گیا تھا۔ بات یہ ہے کہ پچھلے حادثوں کی وجہ سے میرا دماغ بھی جواب دے چکا تھا، زرینہ کے ساتھ میرا دِل بھی اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ میرا ہونہار بیٹا اختر سمندر میں غرق ہو چکا تھا اور اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود میرے مددگار سوامی کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ یہ حادثے کسی کو کُچھ دیر کے لیے پاگل کر دینے کو کافی ہیں!

شام تک ہم لوگ وہیں بیٹھے رہے، لاتعداد غوطہ خوروں اور سمندری افواج کی اَن تھک کوششوں کے باوجود اختر اور سوامی کا کُچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔ میرا محل ماتم کدہ بن گیا۔ تمام رات لوگوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ سُراغ رساں ذکی اور انسپکٹر رانا کے کہنے کے بموجب صُبح ہونے پر میں نے یہ اعلان بھی کرا دیا جو شخص سوامی اور اختر کو ڈھونڈ نکالے گا اسے انعام دیا جائے گا۔۔۔ مگر توبہ کیجئے۔ اتنے بڑے سمندر میں سے دو آدمیوں کو تلاش کر کے نکالنا بے حد مُشکل کام تھا اور فرض کر لیجئے کہ اگر

وہ دونوں مل بھی جائیں تو یقیناً ہمیں زندہ حالت میں نہیں مل سکتے تھے۔

زرینہ بری طرح رو رہی تھی، جان اور جیک نے اسے تسلّی دی اور کہا کہ اسے خُدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ اختر واپس آ جائے۔ درحقیقت وہ مرا نہ ہو بلکہ کسی دور دراز ساحل پر اتر گیا ہو اور ممکن ہے وہ آج کل میں لوٹ آئے۔ جان نے زرینہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مزید کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹی۔ دو باتیں اس حادثے میں ایسی ہیں جن کی وجہ سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ اختر مرا نہیں ہے، ایک تو یہ کہ سمندری فوج پندرہ پندرہ میل دور تک کے سمندر کو چھان چکی ہے، اگر اختر خدانخواستہ مر گیا ہوتا تو اس کی لاش فوج کو ضرور ملتی۔"

زرینہ کے ساتھ ہی میں نے بھی چونک کر جان کو دیکھا، جان نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دوسری بات یہ ہے کہ سوامی ایک ماہر تیراک ہے، اگر اختر

اسے نہیں ملا تو کم از کم اسے تو واپس آ جانا چاہیئے تھا۔ لہٰذا میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ دونوں زندہ ہیں۔ البتّہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ یہ ہم نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے، مگر خُدا ضرور جانتا ہے اور یقیناً وہی ہمیں ان دونوں سے ملائے گا۔“

زرینہ یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ شاید اس نے بھی یہ سوچ لیا تھا کہ خواہ مخواہ رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ جو مقدر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ زرینہ کی وجہ سے ہم لوگ اپنی بات چیت کے سِلسلے کو جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ میں جان اور جیک کو پوری باتیں شروع سے آخر تک سناؤں اور ان دونوں سے بروقت امداد کرنے اور اچانک یہاں پہنچنے کا راز معلوم کروں۔ انسپکٹر رانا اور سُراغ رساں ذکی بھی ڈرائنگ روم میں موجود تھے اور میں نے مناسب سمجھا تھا کہ ان دونوں کے سامنے ہی پورا واقعہ جان کو سنا دوں۔

الغرض میں نے اپنی داستان الف سے یے تک جان کو سُنا دی۔ اختر اور سوامی کا تذکرہ کرتے وقت چند لمحوں کے لیے میرا دِل کانپا مگر پھر دِل پر جبر کر کے میں نے جان کو ساری باتیں سنا دیں۔ یہ ہیبت ناک کہانی سن کر جان بڑی دیر تک فکر مند انداز میں دیوار کو گھورتا رہا اور پھر بولا۔ "وہی ہوا جس کا مُجھے ڈر تھا اور جس کی اِطّلاع مُجھے بر وقت مل گئی تھی۔"

"واقعی اگر ہم کُچھ دیر بعد آتے تو آپ اور آپ کے محل کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔" جیک نے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔" سُراغ رساں ذکی نے کہا۔ "اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی یہ بتائیں کہ آپ کو کس چیز کا ڈر تھا اور آپ کو کس بات کی اِطّلاع بر وقت مل گئی تھی؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو سب کُچھ بتانے کے لیے مُجھے بہت شروع سے اپنی کہانی بیان کرنی ہوگی۔" جان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بتا دیجیئے انکل۔ ان کے سامنے ہی کل کے حادثات رونما ہوئے تھے۔" میں نے جان سے کہا۔

جان نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "بہت اچھّا، میں آپ کو ایک نہایت حیرت انگیز داستان سنا رہا ہوں۔"

"میں نوّاب زادہ فیروز کے ساتھ برسوں پہلے ایک سمندری سفر کر چکا تھا۔ ہمیں ایک ابھرنے اور ڈوبنے والے جزیرے کی تلاش تھی جس میں ایک بے حد قیمتی دھات سوبیا پائی جاتی تھی۔ ہمارے اس سفر میں فیروز کے علاوہ مسٹر جیک اور دو درندہ صفت انسان عبدل اور چیتن بھی شامل تھے۔ مختصراً یوں سمجھیئے کہ ہمیں وہ جزیرہ مل گیا اور پھر اسی جزیرے میں ہماری ملاقات سیّارہ زہرہ کے ایک سائنس داں سے ہوئی جس کی شکل بہت خوفناک تھی۔ وہ سائنس دان اپنے بچّوں کے ساتھ سوبیا دھات کی تلاش میں ہماری زمین پر آیا تھا۔ وہ خود بھی بہت لمبا تھا اور اس کے دونوں بچّے

بھی بے حد لمبے تھے۔ یوں سمجھئے کہ بچّوں کے قد اتنے بڑے تھے کہ ہم لوگ بچّوں کی ہتھیلی پر اس طرح آ گئے تھے جیسے ہم اپنی ہتھیلی پر ایک مونگ پھلی رکھ لیں۔ براہ کرم بیچ میں بولنے کی کوشش نہ کریں انسپکٹر صاحب۔ میں جانتا ہوں، کہ آپ کو مُشکل سے اعتبار آئے گا، مگر فی الحال میں آپ کو کسی بات کا یقین دلانے کی بحث میں نہیں پڑوں گا۔ مُجھے یہ داستان سُنانی ہے اور آپ کو سننی ہے۔ اس لیے خاموشی سے سنتے جائیے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ان دیوزاد بچّوں نے جب ہمیں پریشان کرنا شروع کیا تو سائنس دان نے انہیں منع کیا اور پھر اپنے راکٹ میں بیٹھ کر سیّارہ زہرہ کی طرف پرواز کر گیا۔ اُڑتے اُڑتے ایک خاص ذریعہ سے اس نے مُجھے بتایا کہ اس کا نام شاگو ہے۔ یہی شخص شاگو مُجھ سے پھر اس وقت ملا جب زہرہ کا ایک بدنام سائنس داں جیگا ہماری اس دُنیا کو ختم کرنے کے لیے

اور سوبیا دھات پر قبضہ کرنے کی خاطر یہاں زمین پر انسانی بھیس میں آیا تھا۔ شاگو نے مُجھ سے کہا کہ اگر میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے جیگا کو ختم کر دوں تو دُنیا بھی تباہی سے بچ جائے گی اور زہرہ کے لوگ بھی ایک بُرے انسان سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے۔ خیر میں اپنی یہ کہانی جلد ختم کرنا چاہتا ہوں، اس لیے مختصر کرتے ہوئے اتنا کہوں گا کہ کُچھ عرصے کے بعد ہزاروں مشکلوں اور آفتوں کے بعد ہم لوگ زمین سے ہزاروں فٹ نیچے پاتال میں جیگا کی چھپی ہوئی لیبارٹری کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور میرے دونوں بچّوں اختر اور نجمہ نے سوبیا دھات کی بدولت اور شاگو کے بھیجے ہوئے آفاقی ہار کی مدد سے جیگا کو ختم کر دیا۔ شاگو ہمیں مبارک باد دینے خود دُنیا میں آیا اور وعدے کے مطابق ہمارے گھر اس نے سونے سے بھر دیے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں سیّارہ زہرہ میں آنے کی دعوت دی اور بتایا کہ اس کے خاص راکٹ ہمیں وہاں سے لینے کے لیے

آسکتے ہیں۔

یہ تو گزرے ہوئے دنوں کی کہانی تھی۔ اب حال کی سنئے، فیروز، تم یہ سب کُچھ تو جانتے ہی ہو۔ لیکن اب جو میں کہوں گا وہ ذرا توجّہ سے سننا۔ دو دِن پہلے کی بات ہے، میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک میرے ٹیلی ویژن سیٹ پر ہونے والا پروگرام منقطع ہو گیا، اس کے بعد سیٹ میں سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں۔ کبھی ایک ہلکی سی روشنی تصویر کی جگہ چمک جاتی اور کبھی اندھیرا چھا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی اسپیکر میں سے حیرت انگیز سگنل سُنائی دینے لگے، یہ سگنل کبھی مدھم سُنائی دیتے اور کبھی صاف، ٹیلی ویژن سیٹ جب خراب ہوتا ہے تو کُچھ اور ہی طرح کی لہریں اس کے اسکرین پر کپکپاتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن اب جو لہریں رہ رہ کر نظر آتی تھیں وہ متوازی ہونے کی بجائے کھڑی تھیں۔ یہ اوپر سے نیچے کی طرف لپکنے والی لہریں ٹیلی ویژن میں کبھی پیدا ہی نہیں

ہوتیں، یہی وجہ تھی کہ میں سگنلوں اور لہروں کو توجّہ اور دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ تک یہی ہوتا رہا اور پھر اچانک میرے کمرے کی روشنی خود بخود ختم ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ٹیلی ویژن کی لہریں ایک بار تیزی سے تھرتھرا کر تصویر میں تبدیل ہو گئیں۔ تصویر کے ساتھ ہی سگنل آواز میں بدل گئے، تصویر اور آواز کو میں نے فوراً پہچان لیا۔۔ وہ تصویر شاگو کی تھی۔"

میں نے یکایک چونک کر جان کو دیکھا، وہ اپنا پائپ جیبوں میں ٹٹول رہا تھا۔ پائپ نکال کر اس نے سلگایا اور پھر میری حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"شاگو نے مُجھے بتایا کہ وہ بے حد جلدی میں ہے اور زیادہ دیر تک بات نہیں کر سکتا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا، اور اس پر جگہ جگہ چوٹوں کے نشان تھے اس نے مُجھ سے کہا کہ زہرہ میں انقلاب برپا ہو گیا ہے۔

ایک دوسری پارٹی جس کا پہلا لیڈر جیگا تھا، اب برسر اقتدار آنے والی ہے۔ یہ پارٹی دہشت پسند ہے، اور ملک میں خونی انقلاب لانا چاہتی ہے۔ شاگو معزول حکومت کا سربراہ تھا اور بے حد نیک انسان تھا جب کہ جیگا والی پارٹی کا موجود لیڈر شاکا ہے اور بہت ظالم آدمی ہے۔ جیگا کی موت کے بعد شاکا اب سیّارہ زہرہ کی انقلابی حکومت کا سربراہ ہے۔"

"شاکا!" میں نے چونک کر جان کو دیکھا۔

"کیوں، تم چونکے کیوں؟" جان نے پوچھا۔

"اس لیے کہ جکاری کی آنکھ نے ہمیں جو تصویر دکھائی تھی وہ شاگو کی تھی اور جس آواز نے ہمیں مخاطب کیا تھا اس نے اپنا نام شاکا بتایا تھا۔"

"بس تو اِس طرح شاگو کی بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔"

جان نے پھر کہنا شروع کیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شاگو نے مُجھے بتایا کہ کُچھ

ہی دیر کے اندر زہرہ پر شاکا کی حکومت قائم ہونے والی ہے، کیونکہ زہرہ پر اس پارٹی کا قبضہ ہو گیا ہے جس کا پہلا لیڈر جیگا تھا۔ یہ پارٹی اب اسے یعنی شاگو کو قید کر لے گی، بلکہ جس وقت ٹیلی ویژن پر اس کی تصویر دکھائی جا رہی ہے، شاید اس وقت سے پہلے وہ قید بھی ہو چکا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زہرہ سے ٹیلی ویژن کی یہ تصویر اس وقت سے کافی دیر بعد نیچے پہنچ رہی ہے۔ جب شاگو بول رہا ہے۔ بہر حال میرے یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ شاگو میرا ہمدرد اور محسن ہے، یہ تم بھی اچھّی طرح جانتے ہو، اس لیے جب شاگو نے مُجھ سے التجا کی کہ میں اس کو اس مُصیبت سے نجات دلا کر آزاد کراؤں تو میں کسی بھی طرح انکار نہ کر سکا۔"

"لیکن آپ اسے آزاد کس طرح کرائیں گے؟" میں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"سُنتے جاؤ۔ بیچ میں ٹوک دینے سے میں بھول جاتا ہوں۔" جان نے فوراً

ہاتھ اٹھا کر مُجھے آگے بات کہنے سے روک دیا اور پھر اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"شاگو نے مُجھ سے کہا کہ اصولاً تو اِسے ہی وعدے کے مطابق زہرہ سے راکٹ بھیجنے چاہئیں تھے۔ تم جانتے ہی ہو کہ یہ وعدہ اس نے اس وقت کیا تھا جب ہمارا سفر 'کالی دنیا' والا ختم ہو چکا تھا!"

"جی ہاں میں جانتا ہوں۔"

"اس نے کہا کہ اب وہ اپنے وعدہ کا پابند نہیں رہ سکتا، کیوں کہ حکومت اب اس کے ہاتھ میں نہیں رہی ہے۔ البتّہ اس نے یہ ضرور کہا کہ راکٹ بنانے کا فارمولا مُجھے بتا سکتا ہے۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے مُجھے ٹیلی ویژن کے اسکرین پر دو فارمولے دکھائے اور مُجھ سے کہا کہ میں جلد سے جلد ان کو نقل کر لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور وہ فارمولے نقل کر لیے۔ پہلا فارمولا تو راکٹ کا تھا، اس فارمولے میں راکٹ کا ڈیزائن، اس میں کام

آنے والے کل پرزے اور ایندھن کے بارے میں تفصیل تھی۔ دوسرا فارمولا ایک خاص قسم کے سفید پاؤڈر کا تھا۔ شاگو نے یہ دوسرا فارمولا لکھوانے کے بعد مُجھے بتایا کہ ظالم شا کا دُنیا والوں پر ظلم ڈھانا چاہتا ہے۔ چونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کے لیڈر جیگا کو ختم کرنے والے، یعنی تم، اختر اور نجمہ وغیرہ یہاں بمبئی میں مقیم ہیں۔ اس لیے اس کا ارادہ تم لوگوں پر حملہ کرنے کا ہے۔ اور شاید یہ حملہ اگلے دو دِن کے اندر اندر ہو جائے۔ جب میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ حملہ کس قسم کا ہو گا تو اس نے جواب دیا۔ غالباً پورے علاقے کی بجلی یا تو ختم ہو جائے گی یا عارضی طور پر روک دی جائے گی اور ژان وان شعاعوں کے ذریعے وہاں کے جانوروں کو بہت بڑا کر دیا جائے گا۔ اور پھر یہ جانور لوگوں پر حملہ کریں گے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا بھی تھا۔" پہلی بار انسپکٹر نے درمیان میں بولنے کی جرأت کی۔ "اِن شعاعوں کا نام ژان وان ہے کیا جنھوں نے جانوروں کو بڑا

کر دیا تھا؟"

"ہاں شاگو نے یہی نام بتایا تھا؟ اور پھر اس نے کہا تھا کہ وہ دوسرا فارمولا دراصل ایک پاؤڈر ہے۔ جو اگر ہوائی جہاز کی مدد سے اس علاقے پر چھڑک دیا جائے جہاں جانوروں نے تباہی مچا رکھی ہے۔ تو وہ جانور اچانک چھوٹے اور پھر بالکل بے ضرر ہو جائیں گے۔ خُدا کا شکر ہے کہ میں نے اس فارمولے کی مدد سے وہ پاؤڈر تیّار کر لیا تھا اسی لیے عین وقت پر تم لوگوں کی مدد کرنے یہاں آگیا۔۔۔"

"آسمان پر مُجھے جو دُھند سی نظر آتی تھی، شاید وہ یہی پاؤڈر تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً یہی تھا۔" جان نے جواب دیا۔ "میں اب یہ سوچ کر بہت خوش ہوں۔ فیروزکہ میں تم سب کی جانیں بچانے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"لیکن کاش اگر ہم پہلے آ جاتے تو اختر اور سوامی کو بھی بچا سکتے تھے۔"
جیک نے کہا۔

"ہاں یہ بات ضرور تکلیف دہ ہے۔" سُراغ رساں ذکی نے زرینہ کو دیکھتے
ہوئے کہا۔ "زرینہ صاحبہ پر اس حادثے کا بہت اثر ہے۔"

زرینہ یہ سُن کر رونے لگی اور جان اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے
تسلّی دینے لگا۔ نیوی اور برّی فوج کے لاتعداد جوان سمندر میں اور ساحل
کے چپّے چپّے کو تلاش کر رہے تھے۔ جان نے کہا۔ "خُدا ہی اس آڑے
وقت میں ہم سب کی مدد کر سکتا ہے، اس لیے اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔
اسے منظور ہو گا تو اختر اور سوامی نجمہ اور امجد ضرور ہم لوگوں سے ملیں
گے۔"

ابھی جان یہ الفاظ ادا کر ہی رہا تھا کہ اچانک میدان سے ایک غیر معمولی شور
اُٹھا۔ لوگ بُری طرح چلّا رہے تھے۔ یہ شور لگاتار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

ڈرائنگ روم میں جتنے بھی لوگ تھے سب کے سب اٹھ کر باہر بھاگے۔ میں نے دیکھا کہ ساحل پر لاتعداد لوگ جمع ہیں اور سمندر کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ وہ جوش میں بھرے ہوئے تھے، اور بار بار ہمیں پکار رہے تھے۔

جب میں ساحل کے قریب پہنچا تو مُجھے وہ مقام دکھایا گیا جس کی طرف لوگ اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سمندر کے اس حصّے پر لہریں بُری طرح تڑپ رہی ہیں اور لاتعداد جھاگ اُن لہروں کے تڑپنے سے وہاں پیدا ہو رہے ہیں۔

اور پھر ایک عجیب چیز میں نے دیکھی، میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اس چیز کو دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی، دہشت کے باعث میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور سانس رکنے سا لگا۔ میں نے دیکھا کہ سمندر میں سے کوئی کالی سی چیز آہستہ آہستہ اوپر ابھر رہی ہے۔

یہ کالی سی چیز دراصل کسی کا سر تھا۔ لوگ اچانک خاموش ہو کر حیرت سے اس سر کو دیکھنے لگے تھے جواب کافی اوپر آ چکا تھا۔ دھند کی وجہ سے صاف صاف نظر نہ آتا تھا کہ وہ سر کس کا ہے؟ چند لمحوں بعد ہی مُجھے یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا کہ وہ تو کوئی آدمی ہے۔ یہ آدمی آہستہ آہستہ ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر فوراً ہی میرا دِل کنول کی طرح کِھل اُٹھا۔ کیوں کہ میں اب اسے پہچان چکا تھا یہ شخص سوامی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

سوامی نے کوئی وزنی چیز اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھی تھی۔ اور پھر جلد ہی میں نے اس چیز کو بھی پہچان لیا، وہ اختر تھا۔ اور شاید بے ہوش تھا جب ہی اس نے اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ رکھے تھے۔ انہیں پہچانتے ہی اور میری آواز سُن کر فوج کا امدادی دستہ جلدی سے آگے بڑھا ان کے پاس اسٹریچر بھی تھا۔ دو آدمیوں نے جلدی سے اختر کو سوامی کے ہاتھوں پر سے اٹھا کر اسٹریچر پر لٹا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سوامی کو بھی مدد کے لیے سہارا دیتے،

وہ

نڈھال ہو کر نم ریت پر گر پڑا۔

ایک گھنٹے بعد ہم سب اختر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس عرصے میں ڈاکٹر اختر اور سوامی کے انجکشن لگا چکا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، وہ دونوں جلد ہی ہوش میں آ جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ تعجّب بھی ظاہر کیا تھا کہ اتنی دیر تک پانی میں رہنے کے باوجود ان دونوں کے جسموں میں پانی کیوں نہ بھرا؟ مگر اس بات کا جواب تو اسی وقت مل سکتا تھا جب سوامی کو ہوش آتا۔

کمرے میں اس وقت اختر اور سوامی کے علاوہ انسپکٹر، سُراغ رساں، جان جیک اور زرینہ موجود تھے۔ میں خاموش کھڑا تھا، زرینہ اختر کے پاس ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اسے ہوش آ جائے تاکہ وہ اپنے بارے میں بتا سکے۔ وہ کیا ہم سب یہی چاہتے تھے، مگر اختر ابھی تک بے ہوش تھا اور زرینہ اسے اس حالت میں دیکھ

کر اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اسے روتے دیکھ کر جان نے مُسکرا کر کہا۔

"کیوں میں نہ کہتا تھا کہ وقت سے پہلے کوئی فیصلہ کر لینا غلَط ہوتا ہے؟ تم سمجھتی کُچھ تھیں مگر ہو کُچھ گیا۔ دیکھ لو یہ دونوں تمہارے سامنے زندہ موجود ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے تھے، مگر۔۔۔۔ مگر اسے ہوش کیوں نہیں آتا۔" زرینہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"آ جائے گا۔۔ آ جائے گا۔۔ خُدا پر بھروسہ رکھو۔۔۔" جان نے تسلّی دی۔

"ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا کہ خطرہ نہیں ہے اور ہوش بھی تقریباً دو تین گھنٹے بعد آئے گا۔" جیک نے آہستہ سے کہا۔

"بس تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟" اس بار میں نے کہا۔ "تم بے فکر رہو اور خُدا کے لیے یہ رونا دھونا بند کرو۔"

"ہاں بیٹی۔۔ یہ بات ٹھیک ہے، دِل پر قابو رکھنا چاہیئے۔" جان نے کہا اور پھر کرسی کھینچ کر سوامی کے قریب بیٹھ گیا۔

سوامی کو اب شاید ہوش آرہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے پپوٹے ہلنے لگے تھے اور ہاتھوں کی انگلیاں بھی بستر پر سِر کنے لگی تھیں۔ اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ نظروں سے ہماری شکلیں دیکھنے لگا۔ ہمیں دیکھنے کے بعد اس کی نگاہ اختر کی سمت گئی اور اسے آرام سے لیٹے دیکھ کر وہ مسکرایا اور پھر آہستہ سے بولا۔ "میں۔۔۔ میں کہاں ہوں؟"

"گھبراؤ نہیں، تم اختر کے کمرے میں ہو۔ اختر ٹھیک ہے، ذرا بے ہوش ہوگیا ہے۔" جان نے اس کا ہاتھ محبّت سے تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"اسے ہوش آ جائے گا نا؟"

"ہاں ہاں۔۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ایک دو گھنٹے کے اندر وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بھگوان کا شکر ہے۔" سوامی نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں پھر کھولیں اور اس بار ہمّت کر کے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے وہ اٹھ کر اختر کے بستر تک گیا۔ اسے ایک دو منٹ تک دیکھتا رہا اور پھر واپس اپنے بستر پر بیٹھ گیا، اس کے چہرے پر پریشانی صاف نظر آ رہی تھی، چند لمحے تک وہ خاموش بیٹھا اختر کو گھورتا رہا اور پھر بولا۔

"مالک۔۔ میری مانئے تو بابا کو کڑی نگرانی میں رکھئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"سنو جی۔۔ تم پہلے اپنا بیان لکھواؤ۔" انسپکٹر رانا نے اپنی ڈائری کھولتے ہوئے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں انسپکٹر صاحب۔" جان نے خشک لہجے میں کہا۔ "ہم اِن باتوں کو راز رکھنا چاہتے ہیں اور آپ پوری دُنیا میں یہ بیان چھپوا دینے کے خواہش مند ہیں۔ معاف کیجئے گا، کوئی بیان نہیں لکھا جائے گا۔"

وہ لہجہ ہی ایسا تھا کہ انسپکٹر نے گھبرا کر ڈائری بند کر لی اور بیوقوفوں کی طرح جان کو تکنے لگا۔

"ہاں سوامی تم بتاؤ کیا بات ہے؟" جان کی پیشانی پر ابھی تک برہمی کی لکیریں موجود تھیں۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔" سوامی نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ "آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جتنے

عرصے تک میں غائب رہا ہوں، وہ عرصہ میں نے پانی میں نہیں گزارا۔"

"ہاں، ہاں۔۔ یقیناً کسی ساحل پر گزارا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں۔" سُراغ رساں نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑائی۔

"جی نہیں۔۔ ساحل پر بھی نہیں، بلکہ ایک بڑی مچھلی کے پیٹ میں۔"

"مچھلی کے پیٹ میں۔۔۔؟" ایک عجیب سا شور یہ سُن کر کمرے میں گونج اٹھا۔

سوامی کُچھ دیر تک ہماری صورتوں کو تکتا رہا، شاید اسے یہ گمان ہوا کہ ہم لوگوں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ لیکن جب میں نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور اشارہ کیا کہ وہ آگے کہے تو اس نے چونک کر مُجھے دیکھا اور پھر اپنی حیرت انگیز داستان جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"سرکار یقین مانیے گا، میں اتنے عرصے تک مچھلی کے پیٹ میں قید رہا،

آپ کو سمجھانے کی خاطر میں اپنی داستان وہاں سے شروع کرتا ہوں جب میں نے ایک بہت بڑے کچھوے کو دیکھا جو بابا کو دبوچے ہوئے سمندر میں گھُس رہا تھا۔ میرے پاؤں میں موچ آئی ہوئی تھی، مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی، اور تیزی سے دوڑتا ہوا سمندر کی طرف بڑھا۔ شاید وہ پہلا موقع تھا جب میں نے مالک فیروز سے پوچھے بغیر سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔۔ مگر بابا کا حشر دیکھ کر دُنیا میری نظروں میں اندھیری ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے ایسا کیا تھا۔ جیسے ہی میں سمندر کی گہرائی تک پہنچا، میرا سر اچانک کسی چیز سے ٹکرایا، مُجھے بڑا تعجّب ہوا کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے مُجھے آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مُجھے ایک بہت بڑی صاف شفّاف مچھلی نظر آئی، شیشے کی طرح چمکیلی، یہ مچھلی اتنی بڑی تھی کہ شاید وہیل مچھلی بھی اتنی بڑی نہ ہوگی۔ پہلی نظر میں مُجھے وہ مچھلی ہی نظر آئی اور پھر توجّہ سے دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ وہ تو شیشے کا ایک

بہت بڑا کیبن ہے۔ شیشہ مُجھے محسوس نہیں ہوتا تھا۔ صرف میں نے اپنی عقل سے سوچا کہ وہ شیشہ ہے۔ ویسے وہ کوئی رکاوٹ تھی۔ میں یہ اچھّی طرح دیکھ رہا تھا کہ بابا کُچھ ہی فاصلے پر ایک سمندری چٹّان پر چِت لیٹا ہوا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اسے بچا لوں تاکہ اس کے پھیپھڑوں میں پانی نہ بھر جانے پائے۔ لیکن میرے اس ارادے کو وہ خاص رکاوٹ پورا نہ ہونے دے رہی تھی۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مُجھے کیا کرنا چاہیئے کہ اچانک مُجھے دو آدمی اپنی ہی سمت آتے دکھائی دیے۔ سمندر میں داخل ہونے کے بعد انسان اپنا وزن کھو بیٹھتا ہے اور پانی اس کی قوّت اور رفتار کو کم کر دیتا ہے مگر دونوں آدمی بجائے آہستگی سے چلنے کے، تیزی سے میری طرف آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے قدموں کے نیچے نظر نہ آنے والی زمین ہو اور وہ اس پر قدم رکھتے ہوئے آ رہے ہوں۔ میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا،

اچانک مُجھے یہ احساس ہوا کہ اگر جلد ہی میں نے سمندر کی سطح تک پہنچ کر سانس نہ لیا تو ہو سکتا ہے، میرا دم گھٹ جائے اور میں ڈوب جاؤں۔ اوپر اٹھنے کے ارادے سے جیسے ہی میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے ان میں سے ایک آدمی نے ایک عجیب سا ہتھیار نکالا اور اس کا رُخ میری طرف کر دیا۔ ہتھیار میں سے سبز رنگ کی کرنیں نکلیں۔۔۔ اور اس کے بعد میرے اگے کی رکاوٹ دور ہو گئ۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے پیچھے سے ایک زور دار دھکا دیا ہو۔ اس دھکّے کے باعث میں آگے جس گرا۔ 'گرا' میں نے یوں استعمال کیا ہے کہ اس رکاوٹ کے آگے پانی بالکل نہ تھا، بلکہ مُجھے یوں لگا جیسے میں کسی کمرے میں آگیا ہوں۔"

سوامی جب اتنا کہہ کر سانس لینے کے لیے رکا تو سب احمقوں کی طرح ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ کیوں کہ جو کہانی سوامی اس وقت سنا رہا تھا وہ دوسروں کے نزدیک مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ لیکن

چند لوگ ایسے ضرور تھے جن کو اس کہانی پر پورا اعتبار تھا اور ان لوگوں میں میرا بھی شمار تھا۔

"میں نے اب غور سے ان آدمیوں کو دیکھا، وہ ہمارے جیسے ہی انسان تھے۔"

سوامی نے اپنی داستان پھر جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"البتہ جو ہتھیار ان کے ہاتھ میں تھا وہ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ مُجھے اب اندازہ ہوا کہ بابا جس چٹّان پر لیٹا تھا دراصل اس کے اور چٹّان کے درمیان کوئی خاص چیز ضرور تھی، میرا خیال ہے کہ وہ شیشے کا فرش تھا اور اسی شیشے کے فرش پر بابا بے ہوش پڑا تھا۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر مُجھے بڑی خُوشی ہوئی اور میں نے بھگوان کا شکر ادا کیا کہ بابا بھی وہیں ہے جہاں میں ہوں، لہٰذا اس کے پھیپھڑوں میں بھی ابھی تک پانی نہیں بھرا ہے۔ میں دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں آدمی کون ہیں اور سمندر کے اندر

اس عجیب و غریب تیرتے ہوئے مکان میں کیا کر رہے ہیں؟ میرے اس سوال کا جواب بھی مجھے فوراً مل گیا، جس آدمی نے اپنے نرالے ہتھیار کا رُخ میری طرف کر رکھا تھا وہ مجھ سے بولا۔ بے فکر رہئے آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔ صرف آپ ہمارا کہنا مانئے۔"

"آپ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

"گھبرائیے نہیں، ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ شخص میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں دوسرے شخص نے بابا کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا تھا اور پھر آگے بڑھنے لگا تھا، اسے آگے بڑھتے دیکھ کر میرے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے مجھے بھی آگے بڑھنے کا اشارہ کیا، اگر بابا وہیں پڑا رہتا تو شاید میں اس کا یہ حُکم نہ مانتا، لیکن جب دوسرا آدمی بابا کو لے کر جا رہا تھا تو میں نے بھی یہی سوچا کہ بابا کے ساتھ رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔"

"وہ دونوں آدمی اختر کو کہاں لے گئے؟" جان نے بڑی بے تابی سے

پوچھا۔

"بتا رہا ہوں۔" سوامی نے اختر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دونوں آدمی ہمیں ساتھ لے کر تقریباً چار فرلانگ تک سمندر کے اندر ہی اندر دور تک لے گئے تھے۔"

"چار فرلانگ؟" جان نے اپنی بھنویں اوپر اٹھائیں۔ "تو کیا وہ شیشے کا کیبن اتنا ہی بڑا تھا؟"

"جی ہاں وہ اتنا ہی بڑا تھا، مُجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ میں سمندر کی تہہ سے کافی اوپر ایک صاف شفّاف اور بالکل سیدھی لیکن حرکت کرتی ہوئی زمین پر چل رہا ہوں۔ چلتے چلتے جب بہت دیر ہو گئی تو مُجھے ایک تکونا گُنبد نظر آیا۔ یہ دراصل ایک حیرت انگیز عمارت تھی۔ وہ لوگ ہم دونوں کو اسی عمارت کے اندر لے گئے۔ لیکن میں اب اچھّی طرح جانتا ہوں کہ وہ کسی قسم کی لیبارٹری تھی۔ اس کے اندر حیرت انگیز آلات لگے ہوئے تھے جو میں

نے آج تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھے۔ اس جگہ چار آدمی اور تھے۔
انہوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر ہم دونوں کو فوراً ایک میز پر لِٹا دیا۔
میز پر لِٹانے کے بعد میرے اور بابا کے سر پر بجلی کی ایک ٹوپی چڑھا دی
گئی۔ میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ بس مُجھے اتنا ہی یاد
ہے کہ اس گیند نما ٹوپی میں سے مختلف رنگ کے تار نکل کر ایک الماری نما
مشین میں جا رہے تھے اور اس مشین میں لگی ہوئی لا تعداد گھڑیوں کی
سوئیاں ہل رہی تھیں۔ کہیں کہیں بجلی کے شرارے اُڑ رہے تھے اور
چمکیلی سبز کرنیں کپکپا رہی تھیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتے
ہیں کہ ان میں سے ایک آدمی بابا کے قریب گیا اور اس نے پھر الماری نما
مشین کا ایک بٹن دبا دیا۔ ایک زبردست گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی، اچانک مُجھے
لگا جیسے میں ہوا میں اڑ رہا ہوں اور میرے چاروں طرف سبز رنگ کے بادل
لہرا رہے ہیں۔ بھگوان جانے وہ لوگ کیا چاہتے تھے؟"

"اس مشین کا اثر تم پر کیا ہوا؟" جان نے دریافت کیا۔

"کوئی اثر نہیں ہوا۔ بس میں نے اندازے سے جانا کہ مُجھے اس میز پر لیٹے لیٹے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ مُجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میری آنکھیں کھُل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ لوگ میرے اور بابا کے آس پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ مُجھے ہوش میں آتے دیکھ کر ان میں سے ایک جو دراز قد تھا آگے بڑھ کر بولا آپ لوگوں کا کام ختم ہو گیا اب آپ اوپر سطح پر جا سکتے ہیں۔"

"مجھے بڑا تعجّب ہوا کہ آخر میرا کام ہی کیا تھا اور ان لوگوں نے ہمیں وہاں کیوں روکے رکھا۔ اپنی حیرت رفع کرنے کے لیے میں نے ان سے پوچھا۔ لیکن ہمارا کام کیا تھا؟ آپ لوگ کون ہیں؟"

"ہم کون ہیں، یہ وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔"

"لیکن آپ نے ان ٹوپیوں کے ذریعے ہم پر کون سا عمل کیا ہے۔ یہ تو بتا دیجیے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ یہ سب باتیں راز میں رہنی ضروری ہیں، میں نہیں بتا سکتا۔" وہی شخص مُسکرا کر بولا۔ "ویسے ہم آپ کے دُشمن نہیں ہیں۔ ہمیں آپ لوگوں کے جسموں کو ٹیسٹ کرنا تھا وہ ہم نے کر لیا۔ بے فکر رہیے، آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی گئی آپ کا ساتھی کم زور ہے اس لیے اسے دیر میں ہوش آئے گا، اب آپ جا سکتے ہیں۔"

"میں پھر کُچھ پوچھنا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا بس کوئی سوال نہیں۔"

اور اس کے بعد اپنے آدمیوں سے کسی ایسی زبان میں جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی، اس نے کُچھ کہا۔ وہ لوگ ہمیں ساتھ لے کر پھر اسی مقام پر آئے اور انھوں نے پہلے ہی کی طرح بابا کو چٹّان کے اوپر لٹا دیا۔ میں بابا کے پاس ہی کھڑا رہا، اچانک ایک زبردست تڑاخا ہوا، دھواں اتنا گھرا تھا کہ

مجھے اپنے سے دس فٹ دور کی چیز نظر نہ آتی تھی، اس کے ساتھ ہی دوسری حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ یکایک مُجھے یوں لگا جیسے میں پانی میں ہوں اور سمندر کی تہہ میں بیٹھتا جا رہا ہوں اور اگر میں نے جلدی ہی ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو یقیناً ڈوب جاؤں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے تیرنا شروع کر دیا اور پھر سیدھا اس طرف چلا جہاں بابا لیٹا ہوا تھا۔ دھواں چونکہ کم ہو چکا تھا اس لیے بابا مُجھے فوراً ہی نظر آ گیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور پھر پانی میں اوپر ابھرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی سمندر کی سطح پر آ گیا، اس کے بعد جو کُچھ ہوا وہ آپ سب جانتے ہی ہیں۔"

سوامی اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی داستان بڑی عجیب تھی، میرے دِل میں ہزاروں سوال اٹھ رہے تھے اور میں انہیں پوچھنا بھی چاہتا تھا، مگر جان کی موجودگی میں اس سے پہلے دریافت کرنا مُجھے کُچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ مگر وہی سوال جو میں پوچھنا چاہتا تھا، اچانک

جیک نے پوچھ لیا۔

"لیکن ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ انہوں نے بے شک نہیں بتایا لیکن تم نے ایک اندازہ تو لگایا ہوگا؟"

"سوال یہ ہے وہ لوگ کون تھے؟" جان آنکھوں کو آدھا کھول کر دیکھنے لگا۔

"ہماری پولیس اور افواج نے سمندر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا مگر کسی ایسے طویل کیبن کا وجود بھی ثابت نہ ہو سکا تھا، پھر اس سے کیا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ آپ کے اس ساتھی نے سوتے میں یہ سب کُچھ دیکھا۔۔!"

جان اور جیک چونک کر انسپکٹر رانا کو دیکھنے لگے۔ جس نے یہ عجیب و غریب بات کہی تھی۔ مگر وہ بے چارہ چونکہ بہت سی باتوں سے بے خبر تھا اس لیے اس کا اس طرح سوچنا بھی حق بجانب تھا۔ جان نے اس کی

بات کا کوئی جواب نہیں دیا، البتہّ مُجھ سے کہنے لگا۔

"فیروز مُجھے آثار اچھےّ نظر نہیں آتے جو سوالات اس وقت تمہارے اور میرے دِل میں پیدا ہو رہے ہیں، انہیں یوں ہی رہنے دو۔ اور اب سب سے پہلے ایک لمبے سفر کا بندوبست کرو۔"

"جی نہیں۔" زرینہ تقریباً چیختی ہوئی اختر کے بستر سے اُٹھی اور جوش سے بھری ہوئی آواز میں بولی۔ "میں آپ لوگوں کو کہیں نہ جانے دوں گی۔ میں اب ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ لوگ مُجھ سے جدا ہوں۔"

جان نے زرینہ کو کوئی جواب نہ دیا، صرف اسے ایک بار دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

"اختر بڑی مُشکل سے مُجھے واپس ملا ہے، میں اب نہیں چاہتی کہ کسی نہ کسی طرح یہ پھر غائب ہو جائے۔"

”اچھّا!“ جان نے اطمینان کا ایک لمبا سانس بھر کر کہا۔ ”تو پھر پہلی ضرورت اِس بات کی ہے کہ چند دِن آرام کر لیا جائے، اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔“

چند دِن آرام میں کٹے۔ لیکن اس وقفے میں کُچھ باتیں بڑی حیرت انگیز ہو گئیں۔ سب سے عجیب بات تو یہ ہوئی کہ فوج اور پولیس نے لمبے لمبے جال سمندر میں ڈال کر شیشے کا وہ کیبن تلاش کرنا چاہا، جو سوامی کے بیان کے مطابق سمندر میں موجود تھا، مگر اَن تھک کوشش کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ پولیس کے ساتھ ہی فوج کے ذمّہ دار افسروں نے بھی یہ خدشہ ظاہر کیا کہ سوامی نے کہیں کوئی خواب نہ دیکھا ہو، اور اسی لیے وہ اُلٹی سیدھی باتیں بیان کر گیا ہو۔ لیکن میں، جان، اور جیک اچھّی طرح جانتے تھے کہ سوامی کا بیان سچّا ہے۔ سب سے بڑی سچّائی تو اس کے بیان کی یہی

ہے کہ اختر اور خود وہ کافی دیر تک پانی میں رہے اور پھر زندہ سلامت واپس آئے۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اختر ہوش میں آنے کے بعد کُچھ چُپ چُپ سا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سب کو دیکھ بھی رہا ہو اور نہیں بھی دیکھ رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چُلبلا پن بھی رخصت ہو گیا تھا۔ وہ ہم لوگوں کے سامنے بالکل با ادب بیٹھا رہتا تھا، اور اب کبھی کبھار ہماری گفتگو میں شریک ہوتا تھا۔ کبھی ہم اس سے کوئی سوال دریافت بھی کرتے تو جواب محض ہوں یا ہاں میں ملتا۔

جان چونکہ اچھّا سائنس داں اور ڈاکٹر تھا، اس لیے اس نے اختر کا بغور معائنہ کیا اور بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے، ویسے سمندر کی تہہ میں کافی عرصے تک رہنے کے بعد اس نے کوئی خطرناک اور خوفناک چیز دیکھی ہے، اسی لیے اس کے ذہن پر اثر ہے اور وہ خوفزدہ ہے۔

"لیکن وہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"یہ میں کُچھ نہیں کہہ سکتا، سوامی نے تو یہی بتایا تھا کہ وہ شیشے کے مکان میں قید رہا اور وہ لوگ ہماری ہی جیسی شکلوں کے انسان تھے۔"

"جی ہاں۔۔ وہ بالکل گوشت پوست کے تھے، یعنی ایسے نہیں تھے جیسے زہرہ کے باشندے ہوتے ہیں۔" سوامی نے فوراً کہا۔

"مگر تُم بھول رہے ہو، پچھلے سفر میں ہمارے ایک ساتھی کے بارے میں سچ سچ بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ زہرہ کا باشندہ تھا۔ اس کی شکل کتنی خوفناک تھی! لیکن وہ انسانی شکل میں ہمارے ساتھ رہتا تھا۔" میں نے جواب طلب نظروں سے سوامی کو دیکھا۔"

سوامی نے کوئی جواب نہ دیا، نگاہیں نیچی کر کے وہ کُچھ سوچنے لگا۔

"ہمیں اختر کی زیادہ سے زیادہ نگرانی کرنی پڑے گی۔" جان نے کہا۔ "کیونکہ

شاکا اور اس کے ساتھی صرف اختر ہی سے اپنے پہلے لیڈر جیگا کا بدلہ لینا چاہتے ہیں، ان تمام حادثوں سے میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں۔"

"آپ کا خیال درست معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ زرینہ نے بتایا ہے کہ اختر کے کمرے میں جب وہ صُبح سو کر اٹھتا ہے، چمکیلے سبز رنگ کا دھواں بھرا ہوا ملتا ہے۔"

جان نے یہ سن کر حیرت سے اپنی بھوئیں اُچکائیں، پہلے مُجھے دیکھا اور پھر زرینہ کو۔

"بس تو پھر مُجھے یقین ہو گیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "ضرور میری سوچی ہوئی بات درست ہے، ہمیں اختر کی نگرانی کرنی ہی پڑے گی۔"

اختر حسبِ عادت سر جھکائے ہوئے ہماری باتیں سُن رہا تھا اس عرصے میں جب ہم لوگ گفتگو میں مصروف تھے، اس نے ایک بار بھی ہمیں نہیں

دیکھا تھا۔ لیکن جان نے جب آخری فقرے ادا کیے تو وہ چونک کر ہمیں دیکھنے لگا۔

"کیوں اختر۔ ۔ ۔ کیا بات ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ ۔ ۔ بس یوں ہی۔" اختر کا نہایت مختصر سا جواب تھا۔

شاید جمعہ کا دِن تھا، جان نے ایک نہایت ضروری اور خاص میٹنگ بلائی تھی۔ اس میٹنگ میں جیک، سوامی، میں، اختر اور زرینہ شامل تھے۔ جان نے ہم سب کو باری باری دیکھنے کے بعد کہا۔

"میں ایک بہت ہی ضروری اور اہم بات کہنا چاہتا ہوں، ہم لوگ سمجھ رہے تھے کہ 'کالی دنیا' والے سفر کے بعد سیّارہ زہرہ والوں سے ہماری جنگ ختم ہو چکی ہے۔ مگر اب یہ حقیقت ہے کہ جنگ ختم نہیں بلکہ شروع ہوئی ہے اور اس جنگ کا آغاز نجمہ اور امجد کے اغوا سے ہوا ہے۔ کُچھ باتیں

جو میں اب تک سمجھ چکا ہوں، آپ لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ اختر کی ماں یہ سُن کر ضرور گھبرا جائیں گی کہ ہم لوگوں کا سیّارہ زہرہ میں جانا اب بے حد ضروری ہے۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ امجد اور نجمہ کو ہم اسی صورت میں آزاد کرا سکتے ہیں جب وہاں خود جائیں، سیّارہ زہرہ کے ڈکٹیٹر نے اختر کو عارضی طور پر خاموش کر دیا ہے۔ شاید اسی لیے کہ وہ سمندر کے اندر پیش آئی ہوئی باتیں ہمیں نہ بتا سکے۔ اس کے کمرے میں روزانہ اسی لیے سبز دھواں بھر دیا جاتا ہے کہ وہ غنودگی کی حالت میں رہے اور ہوش میں آ کر ہمیں چند رازوں سے آگاہ نہ کر دے۔ مگر سوامی کے بیان نے مُجھے بہت کُچھ سمجھا دیا ہے۔ میں اب جان چکا ہوں کہ نجمہ اور امجد کو کس طرح آزاد کرایا جا سکتا ہے، میری تجویز کو اب آپ غور سے سنئے۔"

جان سانس لینے کے لیے رکا اور ہم سب توجّہ سے اس کی طرف دیکھتے

رہے۔

”ہم لوگ کل صُبح بمبئ سے امریکہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ زرینہ اگر ہمارے ساتھ چلنا چاہیں تو بے شک چل سکتی ہیں۔ میرا پروگرام بالکل واضح ہے، ہم لوگ نیویارک میں والٹر اسمتھ کے مہمان ہوں گے۔ یہ شخص میرے دوستوں میں سے ہے اور امریکہ کی خلائی مُہم میں ایک بڑا افسر ہے۔ اسی کی نگرانی میں خلامیں جانے والے راکٹ تیّار ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی ایک عظیم سائنس داں ہے اور مُہم جو لوگوں کی قدر کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے راز کو راز رکھے گا اور شاگو کے بتائے ہوئے فارمولے کے مطابق مُجھے وہ راکٹ تیّار کرنے میں مدد دے گا، جو ایک ماہ کے اندر اندر سیّارہ زہرہ کی طرف ہم سب کو لے کر پرواز کر جائے گا۔“

اتنا کہنے کے بعد جان نے سب کو جواب طلب نظروں سے دیکھا، زرینہ کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا مگر وہ خاموش تھی اور کبھی کبھی کنکھیوں سے مُجھے

دیکھ لیتی تھی۔ جیک اور سوامی کے چہرے بتا رہے تھے کہ انہیں اس پروگرام پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور وہ ہر حال میں جان کا ساتھ دینے کے لیے تیّار ہیں۔ البتّہ میں زرینہ اور اختر کی حالت کو دیکھتے ہوئے اندرونی کشمکش میں بتلا تھا۔ جان نے یہ بات نوٹ کرلی اور مُجھ سے پوچھا۔ "تُم کُچھ سوچ رہے ہو فیروز۔"

"میں۔۔۔ ہاں میں یہ سوچ رہا ہوں کہ زرینہ اتنے لمبے سفر پر جانے کی مُجھے کس طرح اجازت دے سکتی ہے۔"

"اجازت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔" زرینہ نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "میری طرف سے اجازت ہے، اس لیے کہ اس بار میں آپ میں سے کسی کو بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا۔۔۔ کیا تم بھی۔۔۔" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں۔۔ اس مرتبہ میں بھی ساتھ چلوں گی۔۔۔ جو بھی حشر ہونا ہے، سب کا ایک ساتھ ہی تو ہو گا۔"

"شاباش!" جان نے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے تم سے یہی اُمّید تھی۔۔ لیکن گھبراؤ نہیں، خُدا نے چاہا تو ہم کامیاب لوٹیں گے اور خُدا ہی قدم قدم پر ہماری مدد فرمائے گا۔"
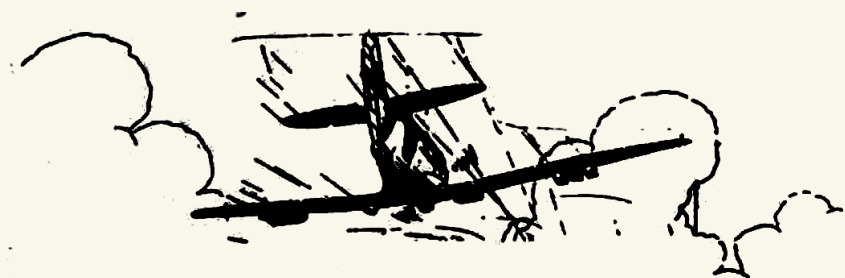
"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" اچانک اختر چلّا کر کھڑا ہو گیا، وہ بڑی دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ مگر اب اس کا چہرہ سفید تھا، جسم کپکپا رہا تھا، مُونہہ سے جھاگ نکل رہے تھے، آنکھیں غُصّے کے باعث پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ بے حد خونخوار ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ ہماری طرف منع کرنے کے انداز

سوامی نے اب اپنے دونوں ہاتھ
آسمان کی طرف اُٹھائے

میں اٹھے ہوئے تھے۔ بھرّائی ہوئی آواز میں وہ کہہ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔۔ کوئی نہیں جائے گا۔"

اختر کی یہ بات سُن کر ہم سب کو ایسا لگا جیسے کمرے میں اچانک کوئی بم پھٹ گیا ہو! حیرت اور تعجّب سے ہم اس کی شکل دیکھ رہے تھے، نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ غُصّے کے باعث تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اختر نہیں کوئی اور ہے۔ اختر کے چہرے پر معصومیت اور بھولپن نظر آیا کرتا تھا، اس وقت وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے سِرے نفرت کے انداز میں نیچے کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے درندگی نمایاں تھی اور وہ بھیانک نظروں سے باری باری ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک مُجھے یہ خیال ہوا کہ شاید کُچھ عرصے سمندر میں رہنے کے باعث اختر کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ جن عجیب و غریب حالات سے وہ دوچار ہو چکا ہے، یہ اسی کا ردِّ عمل ہے۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر

نرمی سے کہا۔

"اختر۔۔ بیٹے۔۔۔ آرام سے بیٹھو، کیا بات ہے؟ تم اتنے گھبرا کیوں گئے؟"

"نہیں۔۔ میں کہہ چکا ہوں، کوئی نہیں جائے گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

اختر نے اتنا کہہ کر اپنے کندھے پر رکھا ہوا میرا ہاتھ بڑے زور سے جھٹک دیا۔ اس کی اس حرکت سے مُجھے بہت دُکھ پہنچا، کیوں کہ اختر آج تک میرا بڑا ادب کرتا آیا تھا، اس نے کبھی مُجھ سے اتنی بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی، حیرت کے باعث میں تو گنگ ہو کر رہ گیا۔

لیکن شاید جیک سے میری بے عزّتی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے اختر کو ڈانٹا۔ "اختر ہوش میں ہو، کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں جاؤں گا۔" اختر کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہو گیا

تھا۔ "اگر کسی نے زبردستی کی تو میں اسے مار ڈالوں گا۔۔ اسے قتل کر دوں گا۔"

ہم لوگ پھر بھونچکا ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اختر اپنے دِل میں ہونے والی کسی کشمکش سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر کُچھ اَن دیکھی قوّتیں اس پر غلبہ پانے میں مصروف ہیں اور وہ اِن قوّتوں کے اثر میں آ چکا ہے۔ اس وقفہ میں زرینہ اختر کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس کا ہاتھ محبّت سے اپنے ہاتھ میں لے کر سہلا رہی تھی۔ اختر کے چہرے پر ایسی کیفیت تھی جیسے وہ اپنی کہی ہوئی باتوں پر پشیمان بھی ہو اور ہمیں بُرا بھلا بھی کہنا چاہتا ہو۔ کُچھ دیر تک وہ ہمیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر جھنجھلا کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اچانک تیزی سے اٹھ کر وہ مُجھ سے لپٹ گیا اور روتے ہوئے بولا۔

"مجھے معاف کر دیجئے، مُجھے معاف کر دیجئے ابّا جی۔"

"نہیں بیٹے۔۔ پریشان نہ ہو۔" میں نے اس کے سر پر محبّت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں بہت زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں جب ہی تم نے ایسی گفتگو کی۔"

"میں۔۔ میں۔۔ میں کُچھ نہیں کہہ سکتا۔۔ نہ جانے مُجھے کیا ہو گیا تھا؟" اختر نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

جان بڑی دیر تک اختر کی حرکات و سکنات خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ ساتھ ہی وہ معنی خیز انداز میں اپنے سر کو ہلا بھی رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے اپنے پائپ کو بجھا کر جیب میں رکھا اور پھر مُسکراتا ہوا اختر کی طرف بڑھا۔ اس نے اختر کی کمر محبّت سے تھپتھپائی اور پھر کہنے لگا۔

”بیٹے اختر زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، جب انسان یقین نہ آنے والے واقعات سے دوچار ہوا کرتا ہے تو اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔ تم اب بڑے ہو گئے ہو اور حالات کی نزاکت کو آسانی سے سمجھ سکتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اب تم ان سے متاثر بھی ہوتے ہو، فکر نہ کرو ہم میں سے کسی نے بھی تمہارے اس برتاؤ کا بُرا نہیں مانا۔“

یہ باتیں سُن کر اختر کا چہرہ پھر کھِل گیا اور وہ ہم سب سے اِس طرح باتیں کرنے لگا جیسے اب سے کُچھ دیر پہلے کُچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ زرینہ تو اختر سے باتیں کرنے لگی اور جان نے مُجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ باہر چلوں۔ میرے ساتھ ہی جیک بھی کمرے سے باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جان کے چہرے پر اس وقت فکر کی گہری لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر کہنا شروع کیا۔

”فیروز، میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب ہمیں اختر کا زیادہ سے زیادہ

خیال رکھنا پڑے گا پچھلے واقعات نے اسے اس قدر صدمہ پہنچایا ہے کہ وہ اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ صدموں سے بوکھلا کر اس نے اس نئے سفر پر جانے پر سے انکار کر دیا تھا۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" جیک نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمیں جلد سے جلد اپنے سفر پر روانہ ہو جانا چاہیئے۔"

"کیوں؟" جان نے پوچھا۔

"جتنی دیر ہوگی ہمیں کوئی نہ کوئی پریشانی ضرور اٹھانی پڑے گی۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس حالت میں جب کہ اختر اور سوامی ٹھیک طرح تندرست بھی نہیں ہوئے ہیں کیا یہ سفر

مناسب رہے گا؟"

"ضرور مناسب رہے گا۔" جیک نے جواب دیا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شاگو کے بتائے ہوئے فارمولے سے جو راکٹ تیّار کیا جائے گا وہ ایک دِن میں بن جائے گا؟ جی نہیں، اسے تیّار ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ یاد رکھئے جب تک ہم لوگ دُنیا میں ہیں خطرے میں گھِرے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ہم نے خلا میں پرواز کی، ہم محفوظ ہوں گے۔"

"تمہاری یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے جیک کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیک ٹھیک کہہ رہا ہے فیروز!" جان نے مُجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "فارمولے میں جو سامان لکھا ہے اور جس طریقے سے وہ راکٹ بنایا جائے گا، وہ اتنا عمدہ اور پائیدار بنے گا کہ شاکا اور اس کے کارندے اسے تباہ نہیں کرسکتے۔ اپنے نرالے آلات کے باعث ایک طرح سے وہ ہماری

پناہ گاہ بھی ہوگا۔ میری ان باتوں کی صداقت تو اس وقت ظاہر ہوگی جب ہم پرواز کر رہے ہوں گے، لیکن فی الحال میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک ہم یہاں دُنیا میں ہیں، محفوظ نہیں ہیں۔"

اِن واقعات کو بیتے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا۔ اپنی کہانی کو مختصر کرتے ہوئے اب میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عرصے میں وہی ہوا جو جان چاہتا تھا۔ ہم لوگ امریکہ پہنچ چکے تھے۔ اور جتنے عرصے ہم وہاں مقیم رہے لیبارٹری میں راکٹ تیّار ہوتا رہا۔ پہلے یہ خیال تھا کہ راکٹ جلد تیّار ہو جائے گا۔ مگر یہاں آکر یہ پتہ چلا کہ ہمیں تقریباً دو ماہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ راکٹ بنانے والا کارخانہ بہت بڑا تھا۔ بس یوں سمجھئے جیسے ایک چھوٹا سا شہر ضرورت زندگی کی سب چیزیں وہاں میسّر تھیں۔ ہم لوگ اِسی کارخانے نما شہر کے ایک بہت ہی خوبصورت مکان

میں مقیم تھے۔

ہمارا روز کا معمول یہ تھا کہ جان تو جیک اور سوامی کے ساتھ لیبارٹری میں چلا جاتا تھا جہاں وہ ڈاکٹر اسمتھ کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا اور میں مکان میں زرینہ اور اختر کے ساتھ ہی موجود رہتا۔ ہم لوگ دِن رات ٹیلی ویژن دیکھتے رہتے یا پھر آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ ڈاکٹر اسمتھ کی طرف سے ہمیں یہ اجازت نہیں ملی تھی کہ ہم لیبارٹری سے باہر نیویارک یا واشنگٹن تک ہو آئیں۔ اس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو بس پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے!

ڈاکٹر والٹر اسمتھ نے ہمیں کیوں منع کیا تھا، یہ بات ہمیں جلد ہی معلوم ہو گئی اور وہ بھی اتنے بھیانک اور خوفناک انداز میں کہ اب جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرا دِل کپکپا رہا ہے۔ میں ڈرپوک تو نہیں ہوں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی نظر نہ آنے والے خطرے سے ہر انسان ڈرتا ہے۔

حالانکہ دِل دہلا دینے والے واقعات کا اب خاتمہ ہو چکا ہے۔ لیکن ان کی ذرا سی یاد بھی مُجھے دہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ایسی سنسنی اور تھرتھری میرے جسم میں پیدا ہوتی ہے کہ میں قلم ہاتھ میں رکھ کر گھنٹوں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ اپنے دِل کو کس طرح قابو میں کروں اور کس طرح وہ ہیبت ناک باتیں بیان کروں جن کے باعث میرے دِن کا چین اور راتوں کی نیندیں تک غائب ہو گئیٔ تھیں۔ آپ حضرات سے معافی چاہتے ہوئے میں پھر داستان کی طرف آتا ہوں۔

جس دِن سے ہم لوگ امریکہ آئے تھے ہمارے دلوں پر ایک عجیب سا خوف چھایا رہتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ابھی کُچھ نہ کُچھ ہو جائے گا۔ لیکن کیا ہو جائے گا؟ افسوس ہمیں پہلے سے اِس کا علم نہیں ہوتا تھا۔ اختر کے ساتھ وہی حالات پیش آنے لگے جو بمبئیٔ میں پیدا ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ ہمارے ہی کمرے میں سوتا تھا۔ مگر اِس کمرے میں بھی رات کے وقت

ہلکے سبز رنگ کا دھواں بھر جاتا تھا۔ اور یہ دھوئیں کا ہی اثر تھا کہ اختر ہر وقت گُم صُم رہا کرتا تھا۔ اس کی نگاہیں بس ایک ہی سمت دیکھے جاتی تھیں۔ کبھی وہ ڈر کر اپنی بھیانک آنکھوں سے ہم سب کو باری باری دیکھنے لگتا تھا اور کبھی اس طرح پیش آتا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ جان نے امریکہ کے قابل اور نامور ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں۔ اختر کو انہیں دِکھایا (یہ تو لکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ ڈاکٹر بھی ہمارے پاس گھر پر ہی آ گئے تھے) مگر ڈاکٹروں کا جواب سُن کر ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اختر ہر طرح تندرست ہے۔ اور اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جس وقت ڈاکٹر اختر کا معائنہ کر رہے تھے، وہ پہلے ہی جیسا ہشاش بشاش تھا، اس کی آنکھوں، چہرے یا انداز سے یہ بات بالکل ظاہر نہ ہوتی تھی کہ چند ماہ پہلے وہ خوف زدہ اور بیمار رہ چکا ہے۔

ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں؟

خاص طور سے میں بہت پریشان تھا۔ میری تمام اُمّیدیں اور آرزوئیں اختر سے وابستہ تھیں، نجمہ اور امجد غائب ہو چکے تھے۔ اور اختر سمندر میں سے آنے کے بعد سے حیرت انگیز طور پر بدل گیا تھا۔ جان کا خیال تھا کہ سوامی کے کہنے کے مطابق جن لوگوں نے اختر کو آبی لیبارٹری میں لے جا کر اس پر کُچھ عمل کیا تھا، شاید اختر کی موجودہ حالت ان ہی کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ مگر مُجھے اور جیک کو اس کی رائے سے اتّفاق نہ تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ ان نامعلوم لوگوں نے دراصل اختر کو ختم کرنے کی اسکیم بنائی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے وہ اس اسکیم کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور انہوں نے اختر کو واپس سطح سمندر پر بھیج دیا۔ اختر نے ان واقعات سے اتنا اثر لیا کہ اس کے دِل و دماغ پر ان نامعلوم لوگوں کا خوف بیٹھ گیا ہے۔ جیک میرے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے یہ بھی کہتا تھا کہ اگر ان نامعلوم لوگوں کا کام صرف اختر

کو ختم کرنا ہی تھا تو اتنا لمبا چوڑا ڈرامہ کھیلنے کی ضرورت کیا تھی؟ پہلی بار جب میرے کمرے میں جکاری نمودار ہوا تھا، اسی وقت اختر کو ختم کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اختر کا معاملہ خُدا کے سپُرد کر دیا اور حالات کے بدلنے کا نہایت خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔ ایک دِن کا ذکر ہے کہ میں کارخانے نما شہر کے اِسی مکان میں تھا کہ سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔ زرینہ دوسرے بستر پر آرام سے سو رہی تھی اور اس کے برابر ہی اختر کا بستر تھا، مگر یہ دیکھ کر یکایک میری چیخ نکل گئی کہ اختر اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کمرے کے بڑے بلب جلائے۔ ہر سمت آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ لیکن اختر مجُھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں گھبرا کر پھر چلّانے والا تھا کہ مجُھے فوراً احساس ہوا کہ اس طرح اپنے حواس کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اختر باہر برآمدے میں ہو۔ میں نے زرینہ کو

اٹھانا بھی مناسب نہ سمجھا اور خود ہی اختر کو ہر طرف تلاش کرتا ہوا سوامی کے کمرے کی طرف آگیا۔ لیکن یہاں دوسرا اچنبھا میرا منتظر تھا، کمرہ خالی تھا، سوامی کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔

میرے دِل کی اس وقت جو حالت تھی، میں الفاظ میں اسے بیان نہیں کر سکتا، دُنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی تھی۔ جیک اور جان چونکہ رات بھر راکٹ بنانے والی لیبارٹری میں رہتے تھے، اس لیے میں نے فوراً انہیں ٹیلی فون کے ذریعہ اختر اور سوامی کے گُم ہو جانے کی خبر دی۔ کُچھ ہی بعد وہ دونوں بھی گھبرائے ہوئے میرے پاس گئے۔ اتنے میں زرینہ بھی خود بخود جاگ گئی تھی، اور اختر کی گمشدگی سے پریشان تھی۔ میں بھی قریب قریب اپنے حواس کھو بیٹھا تھا، میری حالت دیکھ کر جان نے مُجھ سے کہا کہ مُجھے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور کم از کم باہر نکل کر اختر کو تلاش کرنا چاہیئے۔ بات معقول تھی۔ میں نے خود پر لعنت بھیجی اور

پھر ہم چاروں اختر اور سوامی کی تلاش میں مکان سے باہر نکل آئے۔

چاروں طرف سنّاٹا تھا، صرف راکٹ لیبارٹری میں بجلی کی روشنی نظر آتی تھی، ورنہ سب مکانوں کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اس کارخانے کی سڑکوں پر بجلی کے قُمقُمے روشن تھے لیکن رات کے دو بجے گھڑی کُھرنے اِن کی روشنیوں کو اتنا مدھم کر دیا تھا کہ بس روشنی وہیں تک محدود تھی۔ اس لحاظ سے ہمیں دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اختر کو ڈھونڈنے کے لیے ہم پہرے داروں سے مدد لیتے۔ لیکن ہم لوگ جس مشن پر روانہ ہونے والے تھے، اس کی کسی بھی بات یا حادثے کو مشہور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم خاموشی سے آگے بڑھنے لگے، جان نے احتیاطاً اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ ہمیں ہر قدم پر یہی محسوس ہوتا تھا کہ گویا کچھ آنکھیں چھپ کر ہمیں

دیکھ رہی ہیں، کسی کی موجودگی کا حساس ہمیں بار بار ہوتا تھا، لیکن اندھیرے میں گھور کر دیکھنے کے باوجود ہمیں نظر کُچھ نہ آتا تھا۔

گھرا اندھیرا۔۔ ہُو کا عالم اور اجنبی ملک، بس یوں سمجھئے کہ ہماری زندگی اجیرن تھی! آگے بڑھتے بڑھتے اب ہم ایسے مقام تک آ چکے تھے، جہاں کارخانے کی حد ختم ہو جاتی تھی اور جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ حد کانٹے دار تار لگا کر مقرّر کی گئی تھی۔ جو تھوڑی بہت روشنی نظر آتی تھی اس مقام کے بعد وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اچانک مُجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، میرے سامنے دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے میں ہلکی سی ملگجی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ روشنی کسی سرچ لائٹ کے ذریعے اوپر سے نیچے ڈالی جا رہی ہو، یہ روشنی سبز چمکیلے رنگ کی تھی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ اس چمکیلی سبز روشنی کے بالکل درمیان سوامی اپنا مُونہہ اونچا کیے کھڑا تھا۔

ہم سب وہیں ٹھٹھک کر حیرت سے یہ عجیب منظر دیکھنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کانٹوں کی اس باڑھ کو پار کر کے سوامی دوسری طرف کس طرح پہنچ گیا، جب کہ کانٹوں دار باڑھ میں بجلی دوڑ رہی ہے؟ میرے ساتھ ہی جان جیک اور زرینہ بھی اچنبھے میں تھے۔ جب میں نے اپنا خیال جان پر ظاہر کیا تو وہ کہنے لگا۔

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہے، یا تو ان کانٹے دار تاروں کی بجلی ختم ہو گئی ہے یا پھر جان بوجھ کر بجلی کو ختم کیا گیا ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا واکی ٹاکی فون نکالا۔ (یہ فون ٹرانزسسٹر جیسا ایک آلہ ہوتا ہے، جس کا ایریل اوپر کھینچ کر اس کے اسپیکر میں بولا جاتا ہے۔ یہ آواز دوسری طرف ایک ایسے ہی ٹرانزسسٹر فون میں سُنائی دیتی ہے) جان نے واکی ٹاکی کو مُونہہ کے قریب لا کر پہرے داروں کو ہدایت کی کہ وہ

باڑھ کے تاروں کی بجلی ایک دو منٹ کے لیے بند کر دیں۔ مگر اس طرف سے جو جواب آیا وہ ہمیں حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ پہرے داروں نے بتایا کہ وہ خود پریشان ہیں، باڑھ کے تاروں میں جو کرنٹ دوڑ رہا تھا وہ اچانک اپنے آپ ہی ختم ہو گیا ہے۔

اتنا سُنتے ہی جان نے مُجھے اور زرینہ کو اسی جگہ کھڑے رہنے کی ہدایت کی اور خود جیک کو ساتھ لے کر تاروں کی طرف بڑھا۔ جلدی سے وہ دونوں سینے کے بل لیٹ گئے اور پھر کھسکتے ہوئے تاروں کے نیچے سے نکل کر دوسری طرف پہنچ گئے۔ ادھر پہنچتے ہی پہلے تو وہ کھڑے ہو گئے اور پھر اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے سوامی کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ سوامی اسی طرح مُونہہ اونچا کیے کھڑا تھا، اس کے چاروں طرف دائرے کی صورت میں وہ سبز روشنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ شاید وہ کُچھ کہہ رہا تھا، مگر آواز اتنی ہلکی تھی کہ جان اور جیک کُچھ بھی نہ

سن سکے۔ جان نے اس کے بالکل قریب پہنچ کر اسے آواز دی مگر اس نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ جیک نے بھی احتیاطاً اپنا پستول نکال لیا تھا، کیوں کہ اس کے خیال میں صورتحال بہت نازک ہو گئی تھی۔

جان نے پھر دو تین بار سوامی کو پکارا مگر بے سود! یوں لگتا تھا گویا سوامی وہاں ہے ہی نہیں۔ اچانک اس سبز روشنی کا رنگ تبدیل ہونے لگا، پہلے وہ گہری سبز ہوئی، پھر پیلی اور پھر نارنجی، سوامی نے اب اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور پھر بُری طرح کپکپانے لگا۔ یہ کپکپاہٹ اتنی بڑھی کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ اور پھر دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ جان یا جیک آگے بڑھ کر اسے اٹھاتے یکایک اندھیرے میں سے کسی نے پکار کر کہا۔ "ٹھہریئے!"

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا، خُوشی کے مارے میرا دِل بِلّیوں اُچھلنے لگا، کیوں کہ اندھیرے میں سے میرا ہونہار بیٹا اختر برآمد ہو کر اب آہستہ

آہستہ جان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زرینہ اسے دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھی، مگر میں نے اسے فوراً روک لیا۔ میں جان کی حُکم عدولی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اختر اب جان کے قریب آچکا تھا اور غور سے اس نارنجی روشنی کو دیکھ رہا تھا، جواب دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی تھی۔

"اختر۔۔۔ کہاں تھے تم؟" جان نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "ہم کافی دیر سے تمھیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے انکل۔۔ کمرے میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔" اختر نے ندامت کے ساتھ کہا۔ "میں کھُلی فضا میں سانس لینے کے لیے نکل آیا تھا۔

جان کُچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے پہرے داروں نے ہمیں مطلع کیا کہ اب ہم لوگ باڑھ پھلانگ کر اندر داخل نہ ہوں، تاروں میں کرنٹ دوبارہ دوڑنے لگا ہے۔ اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ جیک بہت غور سے اختر کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، شاید وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا

کہ اختر جھوٹ بول رہا ہے یا سچ؟ اختر کے کُچھ اور کہنے سے پہلے ہی جیک نے اس سے پوچھا۔

"سوامی کو کیا ہوا۔۔۔کیا یہ تمہارے ساتھ آیا تھا؟"

"جی نہیں۔۔مُجھے خود تعجّب ہے پتہ نہیں، انہیں کیا ہوگیا؟"

"بیٹے! کیا تم نے وہ روشنی نہیں دیکھی جو سوامی پر پڑ رہی تھی؟" جان نے نرمی سے پوچھا۔

"سبز روشنی؟ جی ہاں دیکھی تھی۔ بلکہ کئی دِن سے دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا کہتے ہو؟" جان نے گھبرا کر کہا۔ "کیا سوامی کافی دِن سے اس مقام پر آ رہا ہے؟"

"جی ہاں۔۔مُجھے اب تفصیل سے ہی سب کُچھ بتانا پڑے گا انکل۔" اختر نے ٹھنڈی سانس بھر کر بے ہوش سوامی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں کہہ

نہیں سکتا کہ راز کیا ہے۔ راز تو آپ ہی تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کلّو سوامی کو روزانہ رات کو چُپکے سے اُٹھ کر یہاں آتے دیکھا ہے۔ میں کئی دِن سے اِن کا پیچھا کر رہا ہوں، یہ خاموشی سے کانٹے دار تاروں تک آتے اور پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے تھے، فوراً ہی کوئی چیز سرّاٹے کے ساتھ کہیں سے آسمان پر نمودار ہوتی اور پھر اس میں سے سبز رنگ کی چمکیلی روشنی نکل کر سوامی پر چھا جاتی، یہ روشنی آہستہ آہستہ جنگل کی سمت بڑھنے لگتی۔ مُجھے یہ دیکھ کر بہت تعجّب ہوتا کہ سوامی تاروں سے اس طرح اس روشنی کے ساتھ ساتھ گُزر جاتے جیسے تار بیچ میں حائل ہی نہ ہوں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ روشنی انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر پہنچا دیتی ہے۔"

"لیکن آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟" جیک نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا، میں جانتا ہی نہیں تو کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں تو بس چھُپ

کر اِن کی حرکتیں دیکھا کرتا تھا۔ یہ آسمان کی طرف مُونہہ اٹھا کر کچُھ بولتے رہتے تھے۔"

"تُم نے یہ بات ہمیں پہلے کیوں نہیں بتائی؟" جیک نے پھر پوچھا۔

"میں پہلے اپنا اطمینان کرلینا چاہتا تھا، یقین مانئے میرا ارادہ تھا کہ آج اس کا ذکر ضرور کروں گا۔"

اختر کا یہ جواب سُن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا سوامی ہم سے غدّاری کرنا چاہ رہا ہے؟ کیا وہ پوشیدہ طور سے ہمارے راز شاکا کو بھیج رہا ہے؟ یہ ایسے سوال تھے۔ جنھوں نے مجُھے سوامی کی طرف سے شُبہ میں بُتلا کر دیا۔ کئی بار ایسا ہو چکا تھا کہ ہم لوگ سوامی کو شُبہ کی نظروں سے دیکھ چکے تھے۔ میرا دِل اب بھی کہتا تھا کہ ایسا نہیں ہے، لیکن حالات سراسر اُس کے خلاف تھے۔

اِس حادثے کے کُچھ دیر بعد ہم لوگ اپنے مکان کے بڑے ہال میں کھڑے تھے۔ سوامی کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے ہم نے تقریباً سب ہی جتن کر ڈالے تھے مگر اسے ہوش ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس موقع پر بھی اختر نے ہمیں یہی بتایا کہ سوامی کو صُبح سے پہلے ہوش نہیں آئے گا، تین چار دِن سے لگاتار ایسا ہی ہو رہا ہے۔ سچ پوچھئے تو میں اس وقت بڑا پریشان تھا۔ واقعات اس طرح اُلجھ کے رہ گئے تھے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی تھی۔

تقریباً پوری رات ہم اسی جگہ بیٹھے سوامی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے رہے۔ جان نے مُجھ سے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ ان واقعات کو ڈاکٹر والٹر اسمتھ سے نہ چھپایا جائے۔ وہ راکٹ بنوا رہا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ یہ باتیں اس کے لیے کارآمد ثابت ہوں، میں اس کے پاس جاتا ہوں، اور اس حادثے کی خبر دیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر جان جیسے ہی کمرے سے باہر جانے کے لیے اٹھا، کمرے کا دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا اور والٹر اسمتھ گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا، اس کے بال پریشان تھے، آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

"مسٹر جان غضب ہو گیا۔" اُس نے چلّا کر کہا۔ "لیبارٹری کے ریکارڈ روم کا سارا سامان کسی نے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" جان نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"چار گھنٹے پہلے کا۔۔۔ کسی نامعلوم شخص نے خُفیہ طور سے ریکارڈ روم میں داخل ہو کر سامان کی تلاشی لی اور۔۔۔ اور۔۔" والٹر نے اپنا سر تھام لیا، وہ بے چارہ اتنا پریشان تھا کہ اس سے جملہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

"اور کیا۔۔؟" جان نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ فارمولا فائل میں سے غائب ہو گیا ہے جس کی مدد سے راکٹ بنایا جا رہا تھا۔"

اتنا کہتے ہی والٹر لڑکھڑایا اور پھر گرنے کے ڈر سے جلدی سے دیوار کا سہارا لے کر بُری طرح ہانپنے لگا۔

"میرے خُدا۔" جیک نے بے پناہ صدمے سے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "یہ آپ کیسی بُری خبر لے کر آئے ہیں مسٹر والٹر۔"

"سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے۔" والٹر نے آہستہ سے کہا۔ "کہ لوہے کی مضبوط چادریں ریکارڈ روم کے دروازوں میں لگی ہوئی ہیں، مگر کسی نے ان دروازوں کو چھوا تک نہیں، صرف اِس دیوار میں جس کا رُخ جنگل کی طرف ہے، تربوز کے برابر ایک سوراخ نظر آ رہا ہے، یہ سوراخ نہ جانے

کس طرح بنایا گیا ہے، مگر اتنی صفائی کے ساتھ بنایا گیا ہے جیسے کسی معمار نے اطمینان سے بنایا ہو۔"

"تو پھر یقیناً اُسی سوراخ سے کوئی اندر داخل ہوا ہوگا اور اُسی نے فارمولا چرایا ہے۔" میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"بالکل یہی بات ہے۔" جیک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اِس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

"آپ کے اِس آدمی کو کیا ہوا۔ شاید یہ بے ہوش ہو گیا ہے؟" والٹر نے سوامی کو دیکھنے کے بعد پوچھا۔

"جی ہاں یہ بے ہوش ہے۔ فارمولا چُرانے کے بعد اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بے ہوش ہو جائے۔" اختر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اختر!" میں نے غُصّیلی نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ "سوامی

تمہارا بزُرگ ہے، کیا میں نے تمہیں بزُرگوں کا ادب کرنا نہیں سکھایا؟ تم خود بھی جانتے ہو کہ اس شخص نے تمہیں گود میں کھلایا ہے، خواہ مخواہ ایسے آدمی پر شُبہ کرنا اچھّی بات نہیں ہے۔"

غصّے کے باعث میرے بدن پر رعشہ پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ اختر نہ جانے کیا دیکھ کر سوامی پر شُبہ کر رہا تھا۔ سوامی جیسا فرشتہ خصلت انسان میرے نزدیک ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اختر خود سوامی پر جان دیتا تھا۔ اس نے کوئی نہ کوئی بات تو ایسی دیکھی ہو گی جس کے باعث وہ سوامی سے بدگمان ہو گیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ بات وہ سب کے سامنے مُجھے نہ بتانا چاہتا ہو۔

جان آرام کرسی سے کمر لگائے اطمینان سے پائپ پی رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا اسے فارمولا چوری ہو جانے کی ذرا بھی فکر نہ ہو۔ والٹر البتّہ تشویشناک نظروں سے کبھی سوامی کو دیکھتا تھا اور کبھی جان

کو۔۔۔ میں جانتا تھا کہ وہ سوامی کی بے ہوشی کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔ میں نے مختصر لفظوں میں کُچھ دیر پہلے پیش آئے ہوئے واقعات اسے بتائے۔ یہ واقعات جانتے ہی والٹر کینہ توز نظروں سے سوامی کو دیکھنے لگا۔ اور کُچھ دیر بعد بولا۔ "اِس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اختر کا خیال درست ہے۔"

"جی ہاں سو فیصدی درست ہے۔" اختر بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ اِن باتوں کا تذکرہ ابھی سوامی سے نہ کیا جائے، دیکھئے وہ کیا کرتا ہے؟ بس اس پر ہر وقت نظر رکھنی ضروری ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" والٹر نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ فارمولے کے بغیر اب راکٹ کس طرح تیّار ہوگا؟"

"اِس کی فکر آپ نہ کریں مسٹر والٹر۔" جان جو بہت دیر سے خاموش تھا کرسی سے اُٹھ گیا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہنے لگا۔ "راکٹ ضرور بنے گا اور کوئی طاقت اِسے بننے سے نہیں روک سکتی۔ فارمولا اگر چوری ہو گیا

ہے تو ہمیں اس کا کوئی غم نہیں۔"

"تو کیا فارمولا آپ کے ذہن میں محفوظ ہے؟" والٹر نے پوچھا۔

"ذہن میں تو نہیں، البتہّ دُنیا کے دس پندرہ مقامات پر اُس کی کئی کاپیاں محفوظ ہیں۔" جان نے کہنا شروع کیا۔

"میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ مقامات کون سے ہیں، اگر فارمولا میرے ذہن میں محفوظ ہوتا تو یہ میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ مُجھے ختم کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی۔ لیکن موجودہ حالات میں کوئی مُجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ البتہّ اِن مقامات کو جاننے کی خواہش وہ شخص ضرور کرے گا جس نے فارمولا چُرایا ہے۔"

"آپ کا مطلب سوامی سے ہے نا؟" اختر نے چہک کر کہا۔

"بکواس نہ کرو۔" جان نے گرج کر کہا۔ "تمھاری اِس بدتمیزی پر میں تمہیں

اتنا مارتا کہ تم زندگی بھر یاد کرتے، مگر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گیا ہوں، تمہارے والد نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ شاید اب تم نے بزُرگوں کا ادب کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

جان کی گرج دار آواز اور غُصّیلی نظروں کی تاب نہ لا کر اختر سر جھُکائے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

مشرق کی طرف آسمان اب آہستہ آہستہ سُرخی مائل ہونے لگا تھا، کیوں کہ صُبح ہو رہی تھی۔ میں جان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، جو اب سوامی پر جھُکا ہوا تھا اور شاید اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم سب کے چہرے رنج و فکر کے باعث اترے ہوئے تھے خاص طور سے میں بہت زیادہ رنجیدہ تھا۔ سوامی پر میں جس قدر اعتبار کرتا تھا شاید کسی اور پر ہرگز نہیں کرتا تھا۔ اور پھر اب یہ سوامی ہی اِس سِلسلے میں چور ثابت ہو رہا تھا، واقعات مجبور کر رہے تھے کہ سوامی کو چور مان لوں، لیکن دِل کہتا تھا ہرگز

نہیں۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔

سوامی کو آہستہ آہستہ ہوش آ رہا تھا۔ اختر اب کمرے میں نہیں تھا اور زرینہ بھی اس خیال سے کچھ ہی دیر بعد باہر چلی گئی تھی کہ اختر پھر کہیں چلا نہ جائے۔ کچھ لمحے پہلے زرینہ بھی حیرت زدہ تھی اور اختر کے برتاؤ کو تعجّب سے دیکھ رہی تھی۔ کئی بار اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنا مُونہہ کھولا بھی تھا، مگر جان کو غُصّے میں دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی بہر حال اب وہ وہاں نہیں تھی، اور اس وقت کمرے میں میرے علاوہ جان جیک، والٹر اسمتھ اور سوامی موجود تھے۔ سوامی دھیرے دھیرے آنکھیں کھول رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پوری طرح ہوش میں آگیا۔ پہلے اس نے پلکیں جھپکائیں، ہر شخص کو باری باری دیکھا اور پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ساتھ ہی اس نے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

اس کی آواز بے حد خوفزدہ تھی۔

"تُم اپنے مکان میں ہی ہو سوامی۔ ہوش میں آؤ، تم سے کُچھ دریافت کرنا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"کیا دریافت کرنا ہے؟" اس کی نظریں حیرت سے میری سمت اُٹھ گئیں۔

"یہی کہ تُم راتوں کو اُٹھ کر باہر جنگل میں کیوں جاتے تھے؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں مالک۔۔" سوامی اچانک چونک کر بولا۔ "میں تو کبھی اس مکان سے باہر گیا ہی نہیں۔"

اتنا زبردست جھوٹ! مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مُجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ جان نے کھنکار کر بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک تو ہے، وہ بے چارہ کب باہر گیا تھا، تم خواہ مخواہ شک کر رہے ہو۔"

میں مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ میں یہ اچّھی طرح سمجھ چکا تھا کہ جان کا منشا نہیں

ہے کہ سوامی کو یہ راز بتایا جائے۔

"کیا میں کہیں باہر گیا تھا۔" سوامی نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"رات کو تمہارا بستر خالی تھا، ہم سمجھے کہ کہیں باہر چلے گئے ہو، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ تم زمین پر سو رہے تھے۔" جان کے یہ فقرے سُن کر سوامی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"ہو سکتا ہے شاید مُجھے نیند میں چلنے کی عادت ہو گئی ہو۔"

آپ جو میری اس کہانی کو دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں، یقیناً ان واقعات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے ہوں گے، بتانے کو تو خیر میں آپ کو ابھی سب کُچھ بتا سکتا ہوں لیکن بہتر یہی ہے کہ ہر راز پر سے مناسب وقت پر ہی پردہ اٹھایا جائے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں زرینہ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، ہم دونوں کافی دیر سے گزرے ہوئے واقعات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میں نے احتیاطاً زرینہ کو اپنی اور سوامی کی گفتگو نہیں سُنائی تھی۔ میں اچھّی طرح سمجھ چکا تھا کہ دال میں کُچھ کالا ضرور ہے، ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے۔ خود جان کی مرضی بھی یہی تھی۔ جہاں تک راکٹ کے فارمولے کو چُرانے والے شخص کا تعلّق تھا ہم اسے بالکل نظر انداز کر چکے تھے۔ اسے تلاش کرنے کی ضرورت اب یوں بھی نہیں تھی کہ جان نے فارمولے کی ایک نقل والٹر اسمتھ کو دے دی تھی۔

اسمتھ بہت زیادہ حیران تھا کہ اتنی جلد یہ نقل کہاں سے مہیّا ہو گئی؟ حالانکہ سوامی سے گفتگو کرنے کے بعد جان نے ہمیں ایک فاؤنٹن پین نکال کر دکھایا تھا، کمرے میں اس نے اندھیرا کر دیا تھا۔ اور پھر دیوار کی طرف پین کا رُخ کر کے کھڑا ہو گیا تھا، پین میں کوئی چھپا ہوا بٹن دباتے ہی اس میں سے

روشنی کی ایک باریک لکیر نکل کر دیوار پر پڑنے لگی تھی۔

فوٹوگرافی میں جس قسم کے انلارجر استعمال ہوتے ہیں، یہ پین اُن کا نمونہ تھا (یا پھر ہم اسے ایک چھوٹا سا سنیما پروجیکٹر بھی کہہ سکتے ہیں) دیوار پر ایک فٹ لمبا سفید دھبّہ نظر آنے لگا، ہمیں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے ایک فٹ مستطیل کا ایک روشن کاغذ چپکا دیا ہے، اس کاغذ پر وہ فارمولا نظر آ رہا تھا جس کے بارے میں سب کا خیال تھا کہ چوری ہو چکا ہے۔

"یہ ہے وہ فارمولا۔" جان نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے مائیکرو فلم پر اس کی کئی کاپیاں بنالی تھیں۔ ان میں کی یہ ایک کاپی تمہیں نظر آ رہی ہے، اسی کی مدد سے اب راکٹ تیّار ہو رہا ہے اور مُجھے اُمّید ہے کہ وہ اگلے ہفتے تک مکمّل ہو جائے گا۔ تو ہم لوگ اپنا سفر شروع کر سکیں گے۔"

حیرت کے مارے ہم لوگ گنگ ہو کر رہ گئے۔ دیکھا جائے تو جان نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ اسے یقیناً پہلے ہی سے اس کا بات کا ڈر تھا

کہ فارمولا پوری ہو جائے گا۔ اگر جان نہ ہوتا تو سچ مچ ہماری اُمّیدوں پر پانی پھر گیا ہوتا۔ اگر سچ پوچھئے تو میں چاہتا تھا کہ فارمولا پوری ہو جائے۔ شاید آپ میرے ہم خیال نہ ہوں اور میری رائے سے اتّفاق نہ کریں، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دو دِل تھے، ایک دِل کہتا تھا کہ میں فوراً راکٹ کے ذریعے اوپر جاؤں، اور نجمہ اور امجد کو آزاد کرا لاؤں اور دوسرا دِل کہتا تھا کہ بہتر یہی ہے کہ جایا نہ جائے۔ جان کہہ چکا تھا کہ جب تک ہم زمین پر ہیں محفوظ نہیں ہیں، لیکن خلاء میں پہنچتے ہی ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ دراصل یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں زرینہ اور اختر کی خاطر یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ ہم لوگ صرف زمین پر ہی محفوظ ہیں۔

خُدا خُدا کر کے وہ گھڑی آئی جب ہمارا خاص راکٹ تیّار ہو گیا۔ جمعہ کا دِن پرواز کے لیے مقرّر ہوا، جمعہ میں ابھی چار دِن باقی تھے اور یہ چار دِن ہم نے جس بے تابی اور بے چینی سے گزارے ہیں، بس میں ہی جانتا ہوں،

میں چار دِن کے واقعات کو تفصیل سے بیان کر کے خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی کُچھ ایسی باتیں رونما ہوئیں جن کا بتانا بے حد ضروری ہے کیوں کہ یہ باتیں دراصل سوامی اور اختر سے تعلّق رکھتی ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، سوامی ہوش میں آنے کے بعد کُچھ چُپ چُپ سا رہنے لگا تھا۔ اس کی بھی تقریباً وہی حالت ہو گئی تھی جو امریکہ آنے سے پہلے اختر کی تھی۔ سوامی سے اگر کُچھ دریافت کیا جائے تو وہ پھٹی پھٹی بے جان آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگتا۔ جس بات کا بھی وہ جواب دیتا، تسلّی بخش نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ اب ہم لوگوں نے اس پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی تھی، اس لیے وہ اب راتوں کو کمرے سے باہر بھی نہیں جاتا تھا۔ رات کے وقت البتّہ اس کی حالت غیر ہو جاتی، وہ دیوار کی طرف مُونہہ کر کے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کُچھ بڑبڑاتا رہتا، کبھی ایسی حرکتیں کرتا

جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ دکھائی دینے والی قوّت سے باتیں کر رہا ہے۔ اس قوّت سے بات کرتے کرتے اچانک وہ آدھا جھُک جاتا، اس طرح جیسے کسی کا ادب کر رہا ہو، اختر اس موقع پر اس کے پیچھے کھڑا مُسکراتا رہتا، جیسے اس کی ان حرکتوں کو اچھّی طرح جانتا اور سب کُچھ سمجھتا ہو۔

ایک دِن جب ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے تو ہمیں ایک زور دار آواز سُنائی دی، ایسا لگا جیسے کوئی شیشہ ٹوٹا ہو، رات کے تقریباً نو بجے تھے اور ایسی کوئی زیادہ رات بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم سوامی کی طرف سے بے فکر بیٹھے ہوئے تھے، لیکن اس آواز نے ہمیں چونکا دیا، ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے سوامی کے کمرے میں پہنچے، کیوں کہ ہمیں یقین تھا کہ وہ آواز اسی کے کمرے سے آئی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر ہم نے جو منظر دیکھا وہ ہمیں حیران کر دینے کے لیے

کافی تھا۔ کمرے کی جو کھڑکی جنگل کی سمت کھلتی تھی اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور سوامی اس کھڑکی کے شیشوں میں اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ اس کا سر اور سینہ تو آگے جھُکا ہوا تھا اور دھڑ کمرے ہی میں تھا، سوامی اس شکنجے سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کا جسم لہولہان تھا، ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ جلدی سے کھڑکی کے باہر کود گیا اور پھر تیزی سے جنگل کی سمت بھاگا۔ جیک نے فوراً اپنا پستول نکال کر اس پر فائر کرنا چاہا لیکن جان نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "خبردار، کیا کرتے ہو؟"

"لیکن سوامی کہاں جا رہا ہے؟" میں نے بے صبری سے دریافت کیا۔

"وہیں جا رہا ہو گا جہاں پہلے گیا تھا۔" جیک نے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھو۔۔ جلدی دیکھو اختر تو محفوظ ہے نا؟" جان یہ کہتے ہوئے اختر کے کمرے کی طرف بڑھا۔

اور پھر ہم نے دیکھا کہ اختر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا ہے۔
ہمیں صرف اس کی پُشت ہی نظر آئی۔

"شش!" جان نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا ہمیں خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ "آؤ اُلٹے قدمے واپس آجاؤ، ہم اختر کو بتائے بغیر اپنے طور پر تحقیق کریں گے۔"

زرینہ کو ہم نے احتیاطاً کمرے ہی میں چھوڑا اور پھر ہم لوگ وہاں آ گئے جہاں ہم نے سوامی کو پہلے دِن کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔ جنگل اس وقت بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ گارڈ پہرے پر بے شک تھے، مگر ہم نے میدان میں آتے ہی یہ بات فوراً نوٹ کر لی تھی کہ وہ اپنی سرچ لائٹوں کو بار بار ٹٹول رہے تھے اور اوپر مچان پر لگے ہوئے بجلی کے مین سوئچ کو جلدی جلدی کھول اور بند کر رہے تھے، میں فوراً سمجھ گیا کہ حسب معمول خار دار تاروں کی بجلی عارضی طور پر ختم ہو گئی ہے۔

جیک اور جان کے ساتھ ہی میں بھی آہستہ آہستہ ان تاروں کے نیچے سے پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، سوامی ہم سے پچاس ساٹھ فٹ آگے تھا اور اب وہ بڑی تیزی سے آگے بھاگ رہا تھا، ہم تینوں بھی سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے رہے، سوامی نے ایک بار بھی پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید وہ اچھّی طرح سمجھتا تھا کہ اس کا تعاقب نہیں ہو رہا ہے۔

کچھ دُور آگے جانے کے بعد ہم ٹھِٹھک گئے۔ ہم نے جو منظر دیکھا وہ ہمیں مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ آسمان سے ایک سبز رنگ کی چمکیلی روشنی دائرے کی شکل میں زمین پر پڑ رہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے کروڑوں جگنو اس روشنی میں مچل رہے ہیں۔ برقی شرارے پھلجھڑی کے شراروں کی طرح روشنی کے اندر ناچ رہے تھے۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس روشنی میں کوئی نامعلوم سایہ اپنے ہاتھ

آسمان کی طرف بُلند کیے ہوئے کھڑا تھا، اُس شخص کی پیٹھ ہماری طرف تھی، اس لیے ہم اس کی شکل صاف صاف نہیں دیکھ رہے تھے۔ جان نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ایک درخت کے پیچھے چھُپ جانے کو کہا اور پھر ہم تینوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھنے لگے جو اُس وقت ہمارے سامنے طِلسم ہوش رُبا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

سوامی بِلّی کے سے قدم رکھتا ہوا چمکیلی روشنی کی سمت بڑھ رہا تھا، ہمیں تعجّب تھا کہ آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ وہ اس وقت بالکل نہتا تھا، جان نے یہ سوچ کر کہ سوامی کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اپنا پستول اونچا کر کے روشنی کے ہالے کا نشانہ لے لیا تھا۔ سوامی اب روشنی کے بالکل قریب ایک درخت کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اقدام کرتا ایک عجیب بات ہوئی، ڈاکٹر والٹر اسمتھ کا رہائشی کمرہ اس مقام سے کُچھ زیادہ دور نہیں تھا، ہم نے دیکھا کہ اچانک اس کے مکان کی کھڑکی میں سے نارنجی رنگ کی

ایک سبز روشنی نمودار ہو کر تیر کی طرح اس سائے پر پڑی جو سبز روشنی میں نہا رہا تھا۔

بس ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے کھڑکی میں سے ٹارچ کی روشنی اس طرف ڈالی ہو، یکایک ایک زبردست تڑاخا ہوا، اور اس تڑاخے کو سنتے ہی سوامی شیر کی طرح جست لگا کر اس روشنی میں کھڑے ہوئے سائے کو دبوچنے کے لیے اچھلا۔ مگر اتنی سی دیر میں ہی اس مقام پر جو کُچھ بھی تھا، اب غائب ہو چکا تھا۔

سبز چمکیلی روشنی اور اس میں کھڑا ہوا سایہ حیرت انگیز طور پر فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہوا تھا؟ مُجھے تو یوں لگا تھا جیسے میں الف لیلہ کی کوئی کتاب جیتی جاگتی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ سوامی دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی نظر نہ آنے والی قوّت سے جنگ کر رہا ہے۔ ہم لوگ خود بھی بھونچکے رہ گئے اس لیے

پہلے تو ہم اسی مقام پر کھڑے حیرت سے اس جگہ کو دیکھتے رہے جہاں سے وہ سایہ غائب ہوا تھا۔ لیکن جیسے ہی سوامی نے پاگلوں کی سی حرکتیں کیں تو ہمیں اپنی پناہ گاہ سے نکل کا سوامی کی طرف بڑھنا ہی پڑا۔

سوامی اب چیخ چیخ کر اختر کو آوازیں دے رہا تھا۔ اِدھر اُدھر دوڑ کر وہ اختر اختر کا نعرہ لگاتا اور پھر اپنے بال نوچنے لگتا۔ ایک دوبار اس نے پھر اختر کو پکارا اور جب جنگل میں سے کسی نے بھی آوازوں کا جواب نہیں دیا تو وہ اکڑوں زمین پر بیٹھ گیا، اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کافی دیر تک یہی حالت رہی، آخر اس نے ہمارے قدموں کی چاپ سُن کر اپنا سر اٹھایا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی، وہ سچ مچ رو رہا تھا، مُجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھا اور پھر میرے قدموں میں گر گیا، ساتھ ہی وہ بڑی بے تابی سے کہنے لگا۔

"مالک۔۔ مالک بابا کو بچائیے، بھگوان کے لیے بابا کو بچائیے۔"

"اختر کو کُچھ نہیں ہوا، وہ محفوظ ہے۔" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"وہ۔۔وہ محفوظ ہے!" سوامی کی آنکھیں حیرت سے مُجھے دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا ہے۔"

"کتاب پڑھ رہا ہے!" سوامی خوف و دہشت کے باعث چونک کر پیچھے ہٹ گیا اور پھر بڑبڑایا۔ "بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔"

"میں تُم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس طرف کیوں آئے تھے؟" جیک نے غُصّیلے لہجے میں پوچھا۔

سوامی نے بھی جیک کے لہجے کی تلخی محسوس کرلیا۔ کُچھ دیر تک وہ سوچتا رہا اور پھر بولا۔ "میں بابا کو دیکھنے آیا تھا۔"

"جھوٹ نہ بولو۔۔۔" جیک نے چیخ کر کہا۔ "ہم کافی دِن سے تمہاری حرکتیں دیکھ رہے ہیں۔ تم نے ہم سے بے شک یہ جھوٹ بول دیا ہو کہ

کُچھ دِن پہلے جب آج جیسا ہی واقعہ پیش آیا تھا، تم اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ لیکن آج تمہاری قلعی کھل گئی ہے۔ تمہیں آج بتانا ہی پڑے گا کہ آخر یہ کیا چکّر ہے؟ تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ تم اس سبز روشنی میں کھڑے ہو کر کیا کرتے تھے۔ یہ روشنی کہاں سے آتی ہے۔ تم کیا چاہتے ہو اور تم نے وہ فارمولا کیوں چُرایا ہے۔ نظریں نہ جھکاؤ، میری طرف دیکھ کر بات کرو۔۔ آج تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔۔ سب کُچھ بتانا پڑے گا۔"

کچھ دیر کے لیے بالکل سنّاٹا چھا گیا۔ اس سنّاٹے میں ہمیں اپنے دِل کی دھڑکنیں بالکل صاف سُنائی دے رہی تھی۔ سوامی نے سب باتیں بڑے سکون اور توجّہ سے سُنیں۔ اُس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ کھل گئی اور مُجھے اس کی یہ مسکراہٹ زہر لگنے لگی۔ اب، مُجھے اس کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے۔ کہ میں سوامی پر مکمل شُبہ کرنے لگا تھا۔ مُجھے

یقین ہو گیا تھا کہ سوامی نے ہی فارمولا چرایا تھا اور پھر کسی نامعلوم ذریعہ سے فارمولا اس نے کسی کو پہنچا دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ذریعہ وہی سبز روشنی ہو جو آسمان سے اس پر آ کر پڑی تھی، جیسی ابھی کُچھ دیر پہلے اس نامعلوم شخص پر پڑ رہی تھی۔ جو اچانک غائب ہو گیا تھا۔ مُجھے فوراً یہ خیال بھی آیا کہ آخر والٹر کے کمرے سے آنے والی وہ روشنی کیسی تھی، جس کا سبز روشنی سے ملاپ ہوتے ہی ایک تڑاخا سُنائی دیا تھا؟

اپنے اِس سوال کا جواب بھی مُجھے فوراً مل گیا۔ کیوں کہ میں نے دیکھا کہ کارخانے کی طرف سے والٹر اسمتھ کُچھ گارڈز کے ساتھ ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔ سوامی نے بھی اسے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر پیدا ہوا اور پھر وہ ہاتھ جوڑ کر مُجھ سے کہنے لگا۔

"مالک! بھگوان کے لیے مُجھ سے کُچھ نہ پوچھیے۔ آپ بے شک مُجھے چور سمجھیے، لیکن اپنے سے علیحدہ نہ کیجیے گا۔ میں خطا وار تو ضرور ہوں مگر اتنا

نہیں جتنا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو سب کُچھ بتا دوں گا لیکن فی الحال آپ، جیک اور جان صاحب مُجھے شک کی نظروں سے نہ دیکھیں بس میں یہی چاہتا ہوں۔"

ٹارچ کی روشنی سوامی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سچ کی جھلک دیکھی۔ میرا دِل اس کی طرف سے ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔ مگر نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جو مُجھے سوامی کی بات مان لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر والٹر سمتھ کی طرف بڑھا۔ والٹر سوامی کو خوف ناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ شاید اس نے گارڈز کو پہلے ہی ہدایت کر دی تھی۔ اس لیے گارڈز نے اپنی بندوق کا رُخ سوامی کی طرف کر رکھا تھا۔

"خُدا کا شکر ہے مسٹر جان کہ میں وقت پر آ گیا ہوں۔" والٹر نے کہنا شروع کیا۔ "اگر میں نے اپنی جی ایل شعاع استعمال نہ کی ہوتی تو آپ کا یہ آدمی

اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوتا۔"

"کون سی شعاع۔۔اور اس کے استعمال کرنے کا کیا مطلب ہے؟"

"میں عرض کرتا ہوں۔"اسمتھ نے سوامی کو گھورتے ہوئے کہا۔"میں کئی دِن سے اپنی کھڑکی سے ایک سبز رنگ کی روشنی دیکھ رہا ہوں جو اس مقام پر آسمان سے گرتی تھی۔ میں آپ کی زبان سے پہلے بھی یہ سب باتیں سُن چکا تھا اس لیے میں نے لگاتار تین دِن کی محنت کے بعد یہ جی ایل شعاع ایجاد کی۔ مُجھے علم تھا کہ سوامی حسبِ معمول آج رات کو پھر یہاں آئے گا اور سبز روشنی میں کھڑا ہو کر ان نامعلوم قوّتوں سے بات کرے گا۔ میں اپنی شعاع کا تجربہ پہلے ہی کر چکا تھا، اس لیے آج جیسے ہی سوامی اس روشنی میں کھڑا ہوا، میں نے کھڑکی میں سے اپنی شعاع سبز چمکیلی روشنی پر ڈالی اور اُمّید کے مطابق سبز روشنی فضا میں ختم ہوگئی۔ میں نے اس روشنی کو ختم کر دیا ہے۔ اب شاید وہ ہرگز اس مقام پر نہیں پڑ سکے گی۔"

"آپ کی یہ شعاع واقعی بڑی کارآمد ہے۔" جان نے کہا۔ "میں آپ کو داد دیتا ہوں۔"

"لیکن۔۔" میں نے تذبذب کے لہجے میں کہا۔ "اِس روشنی میں ایک سایہ بھی تو کھڑا ہوا تھا۔ وہ کہاں گیا؟"

"مالک۔۔۔ میرے مالک۔" سوامی نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا، گویا کہنا چاہتا ہو کہ آپ نے بڑی اہم بات پوچھی ہے۔

"سایہ!" والٹر اسمتھ نے سوامی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "روشنی میں سایہ کہاں تھا۔۔ وہ تو یہی سوامی تھا!"

"جی نہیں۔۔ ہم لوگوں نے خوب غور سے دیکھا ہے، سوامی تو دراصل اُس سائے کو پکڑنا چاہتا تھا جو روشنی میں کھڑا آسمان کی طرف ہاتھ اور مُونہہ اٹھائے کسی سے مخاطب تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں مسٹر فیروز!" والٹر اسمتھ کا مُونہہ حیرت کے باعث کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"مالک ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سوامی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں اس سائے کو پکڑنا چاہتا تھا۔ مگر اتنی دیر میں آپ کی شعاع اس پر پڑی اور پھر وہ فضا میں تحلیل ہوگیا۔"

"تو کیا تمہیں علم تھا کہ سبز روشنی میں کوئی سایہ موجود ہے، اور کیا تم اپنے کمرے میں سے اسی غرض سے دوڑتے ہوئے یہاں آئے تھے کہ اس سائے کو پکڑ سکو؟" جان نے سوامی سے دریافت کیا۔

"مجھے سب علم ہے جناب۔۔ مگر مُجھ سے کُچھ پوچھئے نہیں، میں ابھی کُچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری زبان اس وقت خود بخود بند ہو جاتی تھی، جب میں سبز روشنی کا کوئی راز کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ تین کام بہت جلد انجام دیں۔ پہلے تو راکٹ اور اس کے

فارمولے کو غور سے دیکھیں کہ اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی۔ راکٹ کو باقاعدہ چیک کریں۔ دوسرا یہ کہ بابا کا بہت زیادہ خیال رکھیں اور نگرانی کریں اور تیسرا سب سے ضروری کام یہ کہ فوراً راکٹ کے ذریعے اپنی مُہم پر روانہ ہو جائیں۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔۔۔"

سوامی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اچانک اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ جلدی سے اُس نے اپنے سر کو پکڑ لیا، تکلیف کی وجہ سے اس نے دانت بھینچ لیے۔۔ ایک دو بار لہرایا اور پھر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

ہم لوگوں نے دوڑ کر اس کو اٹھایا اور اسے ہاتھوں پر سنبھالے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ ہماری آمد کی خبر سُن کر اختر بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور سوامی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ سچ پوچھئے تو حیرت کی بات بھی تھی جب سے ہم امریکہ آئے تھے ہر قدم پر ایک نیا اچنبھا ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا اور

اچانک کوئی نئی بات یا نیا حادثہ رونما ہو جاتا تھا!

اختر کے دریافت کرنے پر اسے پوری باتیں بتائی گئیں۔ پہلے تو یہ باتیں سُن کر اس نے پہلے ہی کی طرح سوامی پر شُبہ ظاہر کیا اور مُجھ سے کہا کہ میں تعلقات اور خدمت کی پروا کیے بغیر اِسے فوری نوکری سے الگ کر دوں لیکن جب میں نے اسے یہ بتایا کہ سوامی درحقیقت اس پُراسرار سائے کو پکڑنا چاہتا تھا جو سبز روشنی میں کھڑا ہوا تھا تو اختر بہت حیران ہوا۔ پہلے تو

ہم سات آدمی خلائی سوٹ
پہنے راکٹ کی طرف بڑھ
رہے تھے

اسے یقین ہی نہیں آیا مگر بعد میں جب جان اور جیک نے بھی یہی بات کہی تو وہ خاموش ہوگیا۔

میں خاموشی سے ٹکٹکی باندھے بے ہوش سوامی کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں اس پر شُبہ نہ کروں، اختر کا بہت زیادہ خیال رکھوں اور یہ دیکھوں کہ راکٹ کے فارمولے میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی؟ والٹر کُچھ دیر تک تو سوامی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اور پھر اس کی طرف سے نااُمّید ہو کر واپس اپنی لیبارٹری میں چلا گیا۔ اِدھر ہم آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ جان نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ دال میں کُچھ کالا ضرور ہے۔ کُچھ قوّتیں یہ چاہ رہی ہیں کہ ہم اپنی پرواز روک دیں۔"

"مگر اِس طرح تو ہمارا مشن ادھورا رہ جائے گا!" میں نے جلدی سے اعتراض کیا۔

"اور پھر امجد اور نجمہ کی زندگی کا بھی سوال ہے۔" جیک نے کہا۔

"مجھے اب نجمہ اور امجد کی زندگیاں اتنی پیاری نہیں رہیں جتنی آپ سب حضرات کی ہیں۔" زرینہ نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جب سے آپ لوگوں نے اوپر خلا میں جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ہمارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ یہ رکاوٹیں خواہ کوئی پیدا کر رہا ہو، لیکن اب ہمیں اس کی بات ماننی ہی پڑے گی اور اپنا ارادہ ترک کرنا پڑے گا۔"

میں نے حیرت سے پلٹ کر زرینہ کو دیکھا کہ آخر وہ اتنی عجیب بات کیوں کہہ رہی ہے؟ میں نے فوراً اس سے سخت لہجے میں کہا۔ "زرینہ تم اپنے ہوش میں تو ہو، جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟"

"جانتی ہوں، اچھّی طرح جانتی ہوں۔" زرینہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں دو کی زندگی بچانے کے لیے آپ سب کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈالنا

چاہتی! اختر پر شروع ہی سے آفتیں آ رہی ہیں، میں نہیں چاہتی کہ اب وہ
بھی مُجھ سے چھین لیا جائے۔"

کمرے میں یہ بات سُن کر سنّاٹا چھا گیا۔ ہم ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے
لگے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اب کیا کہیں؟ آخر جان کرسی سے آہستہ سے
اٹھا اور زرینہ کے پاس پہنچ کر اس کے سر پر محبّت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے
کہنے لگا۔ "میں تمہاری حالت کو اچھّی طرح جانتا ہوں بیٹی، لیکن تم فکر مند نہ
ہو۔ اللہ نے چاہا تو ہم پرواز بھی کریں گے اور کامیاب بھی ہوں گے۔"

"مگر۔۔۔ مگر اختر!" زرینہ فقرہ مکمل بھی نہ کر سکی کہ اچانک پھر رونے
لگی۔

"اختر کا ذرا سا بھی بال بیکا نہ ہو گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر
خدانخواستہ اختر پر کوئی مُصیبت نازل ہوئی تو میں سب سے پہلے اس مُصیبت
کو اپنے اوپر لے لوں گا۔"

پھر ہم سب نے باری باری زرینہ کو تسلّی دی۔ آخر اس کی کُچھ ڈھارس بندھی۔ اس عرصے میں سوامی کو ہوش آچکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اور شاید یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کُچھ دیر پہلے اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آچکا ہے۔ ہم نے اس سے کُچھ پوچھنا چاہا مگر وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے عجیب سی نظروں سے ہمیں دیکھا اور بولا۔

"ہم لوگ کب اپنے سفر پر روانہ ہوں گے؟"

"راکٹ تیّار ہوچکا ہے، پرسوں ہمارا یہ سفر شروع ہوجائے گا۔" جان نے جواب دیا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

سوامی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اور چُپ چاپ اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

وہ دِن بھی آہی گیا جس کا ہم سب بڑی بے چینی اور بے قراری سے انتظار

کر رہے تھے۔ راکٹ تیّار ہو چکا تھا اور ہمیں سفر کی ابتدائی مشق کے لیے لیبارٹری میں بُلایا گیا تھا۔ یہ مشق مختلف قسم کے آلات میں بیٹھ کر چکّر کھانے، لٹکنے اور تیز رفتاری سے گھومنے سے شروع ہوئی۔ ہمیں خلائی سوٹ پہنائے گئے۔ یہ لباس خاص قسم کے کپڑے سے بنایا گیا تھا۔ ہمارے سر پر ایک پلاسٹک کا خول رکھ دیا گیا تھا ہم اس خول سے باہر کی چیزیں دیکھ سکتے تھے۔ اور دوسروں کی آوازیں بھی صاف طور سے سُن سکتے تھے۔

اصولاً تو ہمیں کئی ماہ پہلے سے یہ تیّاریاں کرنی چاہیئے تھیں لیکن جان نے ہمیں بتایا تھا کہ راکٹ جس قسم کا بنایا گیا ہے اور اس میں جس طرح کے کَل پرزے استعمال کیے گئے ہیں، ان کی موجودگی میں یہ ضروری نہیں کہ ہم لوگ اس قسم کی مشقیں کریں جو خلائی سفر کے مسافروں کے لیے بے حد ضروری ہوتی ہیں۔ جان نے کہا تھا کہ راکٹ کا فارمولا اتنا عمدہ ہے کہ

ہمیں اپنے راکٹ میں گھر کا سا آرام ملے گا۔ ہم خلائی سوٹ کے بغیر راکٹ کے کیبن میں اِدھر اُدھر گھوم پھر سکیں گے اور زمین کی کشش سے نکل جانے کے بعد بے وزنی کی کیفیّت ہمیں زیادہ پریشان نہیں کرے گی۔ اس کے علاوہ ہمیں پانی کی بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ راکٹ میں مختلف گیسیں بنانے کا معقول انتظام ہے اور ہم گیسوں کو ملا کر پینے کا پانی آسانی سے فراہم کر سکیں گے۔

یہ بات ہماری سمجھ میں آسانی سے اس لیے آ گئی کہ ہم اچھّی طرح جانتے تھے کہ راکٹ کا فارمولا زہروی سائنس داں شاگو کا بھیجا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ زہرہ کے لوگ سائنس میں ہم دُنیا کے لوگوں سے بہت آگے ہیں۔

تقریباً آٹھ گھنٹے تک ہم خلائی سفر کی مشق کرتے رہے، والٹر اسمتھ نے ہمیں اپنے اگلے سفر کی مشکلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”جن خاص قسم کی گیسوں کا ذکر فارمولے میں کیا گیا ہے وہ گیسیں میں نے فیول چیمبر میں بھروا

دی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔ لیکن مُجھے راکٹ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔" میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نظر بھی کیسے آ سکتا ہے جب کہ راکٹ یہاں ہے ہی نہیں۔"

"پھر کہاں ہے؟"

"راکٹ تیّار ہو چکا تھا، راتوں رات وہ یہاں سے لے جایا گیا اور اب وہ میامی بیچ کے پاس پرواز کرنے کے لیے تیّار کھڑا ہے۔" جان نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"جی ہاں۔۔۔ مسٹر فیروز۔" والٹر نے کہا۔ "کل صُبح پانچ بج کر چالیس منٹ پر وہ وہاں سے داغا جائے گا اور اس کی پرواز کی خبر پوری دُنیا میں کسی کو نہ ہو سکے گی۔ میں نے اس کا مکمّل انتظام کر لیا ہے۔"

"کسی کو بھی خبر نہ ہوگی؟" میں نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"صرف میری لیبارٹری میں کام کرنے والوں کو سب باتیں معلوم ہوں گی۔" والٹر نے جواب دیا۔

"صرف وہی لوگ جان سکیں گے کہ ہم خلا میں کہاں اور کس مقام کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی مُشکل پیش آ گئی تو زمین کے یہ لوگ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

"ہماری۔۔۔!" میں نے تعجّب سے والٹر کو دیکھ کر پوچھا۔ "آپ یہ لفظ ہماری کیوں استعمال کر رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ میرے عزیز دوست والٹر اسمتھ بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں، فیروز!" جان نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا واقعی؟" میں یہ سُن کر خُوشی کے مارے اچھل پڑا۔

"جی ہاں۔ میں نے اور میرے دوست جان نے میری روانگی کو ابھی تک راز ہی رکھا تھا۔ چونکہ میں نے یہ راکٹ بنایا ہے اور میں ہی اس کے کل پرزوں سے خوب اچھّی طرح واقف ہوں۔ اس لیے جب جان نے مُجھ سے چلنے کے لیے کہا تو میں انکار نہ کر سکا۔ ایک تو یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے کہ راستے میں راکٹ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور تب وہاں میری ضرورت پیش آئے۔ دوسرے اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی اس مُہم میں شامل ہونے کے بعد میں بھی آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔"

"یقین مانئے گا ہمیں یہ جان اتنی خُوشی ہو رہی ہے کہ ہم اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔" جیک کی بھی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"میں آپ کے اِس جذبے کی دِل سے قدر کرتا ہوں مسٹر جیک۔" والٹر اسمتھ نے کہا۔ "اور اب آپ سب حضرات کو یہ ہدایت کرتا ہوں کہ آپ آرام کریں تاکہ کل صُبح پرواز کا کام بخیر و خوبی پورا ہو سکے۔ مشق آپ لوگ

کر ہی چکے ہیں، بس ایک بات کا خیال رکھنا ہے کہ آپ کے نامعلوم دُشمن اس مقام کے چپّے چپّے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ اِن سے ہر وقت ہوشیار رہیں۔"

"ہماری کوشش تو یہی ہے والٹر۔" جان کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی۔ "اب تک وہ ہمیں کُچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکے۔"

"اِس کے باوجود اب بھی کوئی ہماری راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔" جیک نے کہا۔

"بہرحال ہم احتیاط کے طور پر ایک ہی کمرے میں آرام کریں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "اور رات بھر ہم میں سے ایک شخص باری باری جاگ کر پہرہ دیتا رہے گا۔"

"ہاں یہ خیال بہت عمدہ ہے۔" والٹر نے خوش ہو کر کہا۔ "اچھّا، میں اب

چلتا ہوں، مُجھے انجینئروں کو کُچھ ہدایات دینی ہیں۔"

والٹر کے جانے کے بعد ہم دیر تک اپنے اگلے سفر کے بارے میں سوچتے رہے۔ کتنا عجیب اور مُشکل سفر ہو گا۔ امریکہ کے کئی جانباز اب تک خلائی سفر کر چکے ہیں۔ اس سفر کی ابتدا روس کے یوری گگارن نے کی تھی اور پھر امریکہ کے مختلف خلا بازوں نے چاند تک سفر کیا تھا۔ مریخ سیّارے تک بھی ایک چھوٹا سا جہاز روانہ کیا گیا تھا جو تقریباً پانچ یا چھ مہینے میں مریخ کے قریب سے ہو کر گزرا تھا۔ چھ ماہ کا طویل عرصہ مریخ تک پہنچنے میں!

اور سیّارہ زہرہ تک پہنچنے کے لیے کتنا وقت درکار ہو گا؟

یہ باتیں سوچ کر میرا دِل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ جب میں نے اپنے خدشات کا تذکرہ جان سے کیا تو اس نے مُجھے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تم ناحق پریشان ہوتے ہو فیروز! خلاء کا سفر اب نہ تو کوئی معمّہ رہا ہے اور نہ

بے حد مُشکل کام۔ پچھلے دنوں زمین سے چاند تک جن لوگوں نے پرواز کی تھی تم ان سے سبق کیوں نہیں لیتے؟"

"مگر وہ لوگ بھی تو چاند تک تقریباً چار دِن میں پُہنچے تھے۔ سیّارہ زہرہ تک نہ جانے ہم کب پہنچیں گے؟"

"نا اُمّید کیوں ہوتے ہو؟" جان نے پھر مُجھے تسلّی دی۔ "اوّل تو یہ سفر میرے نزدیک کُچھ مُشکل ہے نہیں۔ مُشکل صرف اپنی زمین کے دائرہ کشش سے نکلتے وقت پیش آتی ہے۔ راکٹ کو ہماری زمین کی کشش اپنی طرف کھینچے گی اور راکٹ اس کشش سے دامن چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ اس وقت ہمارے دِل اندر ہی اندر ڈوبتے جائیں گے۔ زمین کی کشش سے آزاد ہونے کے بعد ہم خلا میں ہوں گے۔ یہ ایک خالی اور کالا خول ہو گا جس کا کنارہ کسی انسان نے آج تک تلاش کیا ہے اور نہ کبھی کرے گا۔ اس اندھیرے خلا میں ہمارا راکٹ ایک تنکے کی طرح نامعلوم سمت میں

بہا چلا جائے گا۔ جسے میں خلاء کہہ رہا ہوں وہ ہمیں اپنی زمین سے نیلی دُنیا کی طرح نظر آتا ہے۔"

"کیوں۔۔ نیلی دُنیا کی طرح کیسے نظر آتا ہے؟" میں نے جان کی باتیں غور سے سننے کے بعد دریافت کیا۔

"ہماری زمین کو خُدا نے ہوا کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ ہوا کا غلاف ہماری گیند جیسی دُنیا پر ہر سمت موجود ہے۔ کسی اور سیّارے پر ہوا نہیں ہے۔ ہوا میں جو خاک کے ذرّے ملے ہوئے ہیں اُن کے جمع ہونے سے ہمیں خلاء نیلا نظر آتا ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ اگر ہماری زمین پر ہوا نہ ہوتی تو آسمان ہمیں زمین سے نیلا نہیں بلکہ کالا نظر آتا، بالکل اسی طرح جیسے چاند سے خلاء بالکل کالا نظر آتا ہے۔"

"ہاں، کیوں کہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ چاند پر ہوا نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"بالکل، اِس لحاظ سے ہم لوگ جس نیلی دُنیا کا سفر کریں گے در حقیقت وہ کالی دُنیا ہو گی۔ ایک حیرت انگیز، کبھی نہ ختم ہونے والے گھرے اور کالے رنگ کا گڑھا جس میں جگہ جگہ کروڑوں چمکتے ہوئے اور دمکتے ہوئے ستارے لٹکے ہوئے ہوں گے اور اِن ستاروں میں سے ایک ستارہ زہرہ ہماری منزل مقصود ہو گا۔"

"لیکن میں اس اندھیرے سے نہیں گھبرا رہا ہوں، میں تو اتنے لمبے سفر اور طویل وقت سے گھبرا رہا ہوں۔"

"تم بھول گئے ہو کہ راکٹ کا فارمولا شاگو نے ہمیں بھیجا ہے اور وہ لوگ سائنس میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ خود والٹر نے مُجھے یہ بات بتائی ہے کہ جس انداز اور جس طریقے سے یہ راکٹ بنا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زہرہ تک پہنچنے میں وہ بہت زیادہ وقت نہیں لے گا۔ ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے کے بجائے صرف چھ دِن ہی درکار ہوں۔"

جان کی بات سُن کر میں بہت خوش ہوا اور پھر بولا۔ "ہاں اگر اتنا وقت لگتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"میں یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتا ہوں۔" جان نے مُسکرا کر کہا۔ "یہ تو کل کی پرواز سے ہی پتہ لگے گا۔ اب تم پہرہ دینے کے لیے تیّار ہو جاؤ تاکہ میں تھوڑا سا سو سکوں اور خود کو کل کے سفر کے لیے تیّار کر سکوں۔"

رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی، صُبح ہونے کے بعد ہم لوگ میامی بیچ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اختر اور سوامی حسب عادت چپ تھے، میرا دِل لرز رہا تھا اور خاموش دُعا مانگ رہا تھا کہ خُدا ہمیں ہر مُصیبت اور آفت سے بچائے رکھے۔ ممکن ہے آپ حضرات پڑھ کر ہنسیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مُجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی قربان گاہ پر لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سات آدمی خلائی سوٹ پہنے ہوئے آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں

کئی سو پونڈ وزنی وہ راکٹ ایک دیو کی طرح مُونہہ اونچا کیے ہوئے کھڑا تھا۔ یہ راکٹ ایک بہت اُونچے پلیٹ فارم سے سہارا لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے سب سے اوپر والے حصّے میں وہ کیبن فٹ تھا جس میں ہم لوگوں کو پہنچنا تھا۔ سہارے والے پلیٹ فارم کے ساتھ ایک لفٹ نصب تھی جو ہمیں کیبن میں لے جانے کے لیے بالکل تیّار تھی۔

پہلے میں سمجھا تھا کہ وہاں ہمارے اور چند انجینئروں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ہوائی، برّی اور بحری فوج کے کافی جوان پہلے ہی سے موجود تھے۔ کیوں کہ ہماری پرواز امریکہ کی خلائی انجمن 'این اے ایس اے' سے تعلّق نہیں رکھتی تھی اور ہم جس مشن پر جا رہے تھے اسے دوسروں سے چھپایا گیا تھا، اس لیے ہر شخص ہمیں حیرت اور تعجّب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ "نہ تو اخبار میں آیا اور نہ ہی سرکاری طور پر اعلان کیا گیا، پھر آخر یہ سات آدمی کون ہیں جو ایسے جان جوکھم والے

کام کے لیے تیّار ہو گئے ہیں؟"

اس وقت صُبح کے پانچ بج رہے تھے۔ راکٹ کی پرواز میں ابھی چالیس منٹ کا وقفہ تھا۔ فوجی ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے اور ہم ان کی گرمجوشی کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے لفٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لفٹ کا دروازہ خود بخود کھل گیا تھا اور ہم سے اب اس کا فاصلہ تقریباً بیس فٹ رہ گیا تھا۔ ہمارے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے ہی اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے لفٹ کے پرخچے اڑ گئے۔ فولاد کے ٹکڑے بڑی تیزی سے اوپر کی طرف اڑے اور ان کی چوٹ سے بچنے کے لیے ہم لوگ جلدی سے زمین پر لیٹ گئے۔ دھماکے کے ساتھ ہی شعلے بھی لپکنے لگے اور اس سے پہلے کہ آگ بجھانے والے انجن موقع پر پُہنچے آگ زیادہ بھڑک اٹھی۔ غُصّے کے مارے جان کی بُری حالت تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ کام ہمارے دُشمن کا ہی ہو سکتا ہے۔ دُشمن گوشت

پوست کا انسان ہو تو آدمی اس سے نمٹ بھی لے، لیکن نہ دکھائی دینے
والی قوّتوں سے بھلا کون ٹکّر لے سکتا ہے!

جان نے چیخ چیخ کر مائیکروفون پر احکامات دینے شروع کر دیئے۔ وہ فوجوں
کو حُکم دے رہا تھا کہ وہ بھی آگ بجھانے میں لگ جائیں۔ مگر نہ جانے کیا
بات تھی کہ آگ بڑی تیزی سے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یہ لوگ آگ سے بچنے
کے لیے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ زرینہ نے اختر کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور
سوامی حسبِ عادت اختر کی پشت پر تھا۔ جیک اس وقت زمین پر جھُکا ہوا
کوئی چیز اٹھا رہا تھا۔ دراصل وہ لفٹ کے دروازے کا ہینڈل تھا، اس ہینڈل
پر کسی کی انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ جس کس نے بھی
لفٹ کو کھولا تھا، شاید اس کے ہاتھ میں نمی تھی یا پھر تیل لگا ہوا تھا۔ اسی
لیے ہینڈل پر وہ نشان بہت صاف تھے۔ جیک نے جب یہ ہینڈل جان کو
دکھایا تو وہ بڑا حیران ہوا اور پھر اس نے ایک انجنیئر کو اشارے سے اپنے

قریب بلا کر کہا کہ وہ جلدی سے لیبارٹری میں جائے اور انگلیوں کے نشانات دیکھنے والے ماہروں سے یہ معلوم کر کے بتائے کہ وہ نشانات کس کے ہیں؟ کوئی باہر کا آدمی ہے یا اس کی پارٹی کے لوگوں میں سے کسی کے ہیں؟

وہ انجینئر تو فوراً چلا گیا۔ مگر اب ایک عجیب بات ہوئی۔ آگ بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچ گئی جہاں راکٹ کھڑا تھا۔ راکٹ کی دم سے آگ تقریباً پانچ سو گز دور تھی، پوری کوشش اور احتیاط کے باوجود بھی فائر بریگیڈ آگ پر قابو نہ پا سکا تھا۔ یہ دیکھتے ہی جان کا ماتھا ٹھنکا، اس سے پہلے کہ وہ کُچھ کہتا والٹر اسمتھ نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"جان راکٹ کو بچاؤ۔ آگ کا رُخ اُس کی طرف ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود بخود اڑ جائے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔ تم ہی کُچھ سوچو۔۔۔" جان نے آگ کو گھورتے

ہوئے جواب دیا۔

"راکٹ اگر اُڑ گیا تو ہماری محنت اکارت جائے گی۔" جیک نے گھبرا کر کہا۔

"میرے خیال میں ہم لوگ یہاں سے دور ہٹ جائیں۔" اختر بولا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ راکٹ ہی پھٹ جائے؟"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" جان نے دانتوں پر دانت جماتے ہوئے کہا۔ "میں دشمنوں کی چال ہرگز کامیاب نہ ہونے دوں گا۔ سمجھتے ہو والٹر، وہ کیا چاہتے ہیں؟"

"کیا چاہتے ہیں؟"

"اُن کا منشا یہ ہے کہ جب ہم لوگ لفٹ میں سوار ہوں تو پوشیدہ طور پر رکھا ہوا بم آپ ہی آپ پھٹ جائے۔ ہم تباہ ہو جائیں اور پھر آگ کی وجہ سے ہمارا رات دِن کی محنت کے بعد تیّار کیا ہوا یہ راکٹ خود بخود ہوا میں اڑ

جائے۔ اوراس طرح نہ ہم رہیں نہ راکٹ اور نہ فارمولا۔ کیوں۔۔ ٹھیک کہہ رہاہوں نا؟"

"واقعی بڑی کامیاب چال ہے۔" جان کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگیں۔

"لیکن میں اس چال کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔" اتنا کہہ کرجان جلدی سے انجنیئروں کی طرف بڑھا اوران سے کُچھ کہہ کرپھر ہماری طرف واپس آ گیا۔ بار بار وہ آگ کو دیکھتا جاتا تھا کہ شعلے راکٹ تک پُہنچے تو نہیں، مگر خُدا کا شکر ہے کہ ابھی آگ راکٹ کے نچلے حصّے سے کافی دور تھی۔

اچانک ہمارے سروں پر ایک ہیلی کاپٹر کی گرج سُنائی دی۔ یہ ہیلی کاپٹر نیچے اتر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ زمین پر ٹکا جان نے مائیک پر کہا۔

"دنیا والوں کوہمارا اسلام، دوستو! اور ساتھیو! ہماری کامیابی کی دُعا کرنا۔ خُدا نے چاہا تو ہم جلد واپس آئیں گے۔"

اتنا کہہ کر اس نے پھر ہمیں حُکم دیا کہ ہم فوراً ہیلی کاپٹر میں بیٹھ جائیں۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے سے پہلے ہم نے دیکھا کہ اب آگ راکٹ کے نچلے حصّے تک پہنچ گئی ہے اور اس جگہ سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہوں گے کہ راکٹ دراصل پٹرول وغیرہ سے نہیں بلکہ مختلف گیسوں کے آپس میں ملنے اور شُعلہ پیدا کرنے سے اڑتا ہے۔ اس خاص قسم کے راکٹ میں بھی ایسی ہی کُچھ گیسیں بھری ہوئی تھیں۔ شاگو کے کہنے کے مطابق اس راکٹ کے فیول چیمبر میں سوبیا دھات بھی ڈالی گئی تھی۔ (سوبیا دھات کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ یہ میرے پہلے سفر میں تلاش کی گئی تھی اور زہرہ کے لوگوں کے لیے یہ دھات ویسا ہی کام کرتی تھی جیسا ہمارے لیے ایٹم۔ اس دھات کا مفصل حال آپ میرے پہلے سفر نامے 'خوفناک جزیرہ' میں پڑھیے)۔

شاگو نے ایندھن کا جو فارمولا لکھا تھا اس میں مختلف گیسوں کے ساتھ ہی

سو بیا بھی شامل تھی۔ اس لیے یہ دیکھتے ہی کہ آگ راکٹ کے نچلے حصّے میں پہنچ گئی ہے۔ ہمیں فوراً یہ ڈر ہوا کہ کہیں راکٹ آگ نہ پکڑ لے اور یہ آگ اس کے ایندھن تک نہ پہنچ جائے!

ایک زبردست دھماکہ ہوا اور ہم نے دیکھا کہ راکٹ ہل رہا ہے اور اس کے نیچے سے زبردست دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اس عرصے میں ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھ چکے تھے اور جان کی ہدایت کے مطابق ہیلی کاپٹر راکٹ کی چوٹی سمت پرواز کر رہا تھا۔ جان نے مائیک ہاتھ میں لے کر وائرلیس اسٹیشن کو پیغام بھیجا۔

"آپ ذمّہ دار افسران کو بتا دیجیۓ کہ ہمارے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ کسی نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی راکٹ کو بھی تباہ کرنا چاہتا تھا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے اس دُشمن کا یہ ارادہ کامیاب نہ ہونے دوں۔ میں راکٹ کے کیپسول میں ہیلی کاپٹر

کے ذریعے اپنے ساتھیوں سمیت داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔۔

خُدا حافظ!"

راکٹ کے نیچے سے اب شُعلے بُلند ہونے لگے تھے۔ انجینئروں کی ہدایت کے مطابق وہ پلیٹ فارم جس نے راکٹ کو سہارا دے رکھا تھا اب دائیں طرف جھکنے کے قریب تھا، کیونکہ انجینئر سمجھ چُکے تھے کہ راکٹ اب کوئی دم میں اُڑا ہی چاہتا ہے۔ ہمارا ہیلی کاپٹر راکٹ کی چوٹی کے قریب ہوا میں معلّق ہو گیا تھا۔ اُس کے پائلٹ نے ایک فولادی سیڑھی نیچے لٹکا دی تھی اور اس سیڑھی سے اتر کر ہمارے ساتھی باری باری کیپسول کے دروازے کے اندر سر کے بل داخل ہو رہے تھے۔ والٹر اسمتھ سب سے پہلے گیا، پھر زرینہ اور اختر، اور آخر میں جیک، جان سوامی اور میں۔۔ ہیلی کاپٹر ہمیں چھوڑتے ہی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا، کیوں کہ راکٹ ایک زبردست شور اور دھماکہ کے بعد آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا تھا۔

اوپر۔ ۔ ۔ اور اوپر۔ ۔ ۔ بہت ہی اوپر!

راکٹ کی رفتار لگاتار بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ہمیں اتنا موقع بھی نہ مل سکا تھا کہ ہم خود کو کیپسول کی کرسیوں سے بیلٹ کے ذریعے جکڑ لیں۔ ۔ بس ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہماری جان کھینچ رہا ہے۔ ہم اوپر اٹھ رہے تھے اور کوئی طاقت نیچے سے ہمیں کھینچ رہی تھی۔ اس کھینچا تانی میں ہماری صورتیں بدل گئیں اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گئے۔ اور چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ہمارے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

مگر یہ حالت کُچھ ہی دیر رہی۔ جلد ہی ہم کشش ثقل سے آزاد ہو گئے۔ ہمارا راکٹ تیر کی طرح خلا کی طرف جانے لگا۔ اور پھر ہم نے راکٹ کی کھڑکی میں سے زمین کو دیکھا۔

سبزی مائل نیلی زمین! ہماری پیاری زمین!!

خبردار کوئی ہلنے کی کوشش نہ کرے

چاروں طرف ہلکی دودھیا لکیر نظر آرہی تھی جو یقیناً ہوا کا غلاف تھا۔ اور پھر اس غلاف کے بعد گہرا سیاہ خلا۔۔۔ وہی خلا جو ہمیں اپنی زمین پر سے نیلا نظر آتا ہے۔۔ ایک عجیب اور نیلی دُنیا کی طرح۔ ہم لوگ اپنی مختصر سی پارٹی کے ساتھ اسی نیلی دُنیا کی طرف جا رہے تھے۔

کسے معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے؟

مگر کاش ہمیں معلوم ہو جاتا۔ کاش ہمیں پہلے ہی سے پتہ لگ جاتا کہ نیلی دُنیا کی مختلف اور ہیبت ناک آفتیں اپنا بھیانک مُونہہ کھولے ہمارے راکٹ کو نگل لینے کے لیے بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی ہیں!

میری یہ ہیبت ناک کہانی یہاں تک پڑھنے کے بعد آپ شاید یہ جاننے کے خواہش مند ہوں گے کہ آخر یہ خلا ہے کیا چیز اور اس سے ہم لوگ کس لیے اتنا ڈر رہے تھے؟ سائنس سے دلچسپی رکھنے والے تو اسے آسانی سے سمجھ

لیں گے، لیکن جن کی سمجھ میں سائنس کی باریکیاں نہیں آتیں ان کے لیے

میں مختصر اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اگر آپ ایک بہت بڑا مٹکا لیں جس کا

محیط تقریباً ایک میل ہو۔ اور پھر اس مٹکے کو اندر سے کالا کر دیں تو مٹکے کے

اندر کا خالی حصّہ خلاء کہلائے گا (جو ہر سمت سے کالا دکھائی دے گا) اب اگر

ایسا کیا جائے کہ کسی طرح ایک ہوائی جہاز میں کُچھ آدمی بٹھا کر وہ ہوائی جہاز

مٹکے کے اندر چھوڑ دیا جائے اور مٹکے کے بیچوں بیچ سو واٹ کا ایک بلب جلا

دیا جائے (یہ بلب سورج کو ظاہر کرے گا) اس کے علاوہ مٹکے کی کالی

دیواروں پر چھوٹے بڑے گول گول شیشے لگا دیے جائیں۔ یعنی ایسے شیشے

جو فٹ بال کی گیند سے لے کر پچیس پیسے کے سکے کے برابر تک کے ہوں

اور پھر اس کے بعد مٹکے کا مُونہہ بند کر دیا جائے تو اس صورت میں مٹکے

کے اندر کا حصّہ خلاء ہے اور ہمارا راکٹ ہوائی جہاز! دور دور تک پھیلی ہوئی

سیاہی اور اس سیاہی میں چھوٹے بڑے ستارے (جو دراصل آئینے ہیں)

اس نہ ختم ہونے والے خلا میں ٹمٹماتے ہوئے دِکھائی دے رہے ہیں۔

ہماری زمین میں ایک مقناطیسی کشش ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کشش کی وجہ سے ہر چیز میں وزن محسوس ہوتا ہے۔ اگر کسی طرح، جس مقام پر ہمارا مٹکا رکھا ہے وہاں کی کشش ختم کر دی جائے تو مٹکے کے اندر والا ہوائی جہاز کاغذ سے بھی ہلکا ہو جائے گا۔ مٹکے کی ہوا بھی اگر باہر نکال دی جائے تو ہوائی جہاز کے چلنے سے شور بھی پیدا نہ ہو گا۔ کیوں کہ یہ ہوا ہی ہے جو ہمیں آوازیں سنواتی ہے۔ جب مٹکے میں نہ ہوا ہو گی نہ کشش تو ہمارا ہوائی جہاز خلاء میں بغیر کسی سہارے کے متعلّق ہو جائے گا۔ بے شک جہاز کے انجن بند ہو جائیں مگر جہاز اسی جگہ معلّق رہے گا۔ لیکن اگر کوئی اِس جہاز کو دھکّا دے دے تو پھر وہ ہمیشہ اسی رفتار سے خلاء میں گھومتا رہے گا۔

اب آپ آسانی سے میری بات سمجھ سکتے ہیں اس لیے میں اپنی بھیانک

کہانی پھر سے شروع کرتا ہوں۔

ہمارا راکٹ ایک خاص رفتار سے (جو کم سے کم اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹہ تھی) خلاء میں نہایت تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو ہمیں ایسا لگ رہا تھا گویا یہ جوں کی چال چل رہا ہے۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ زمین پر اگر ہم کسی ریل گاڑی میں بیٹھیں تو اس کی رفتار کا اندازہ برابر سے گزرتی ہوئی چیزوں مثلاً درخت، کھیت یا بجلی کے کھمبوں اور ریل کے شور سے کرتے ہیں۔ جب درخت جلدی جلدی گزرنے لگتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ریل تیز چل رہی ہے۔ یا پھر ریل کی پہیوں کی آواز بڑھ جاتی ہے تب ہم سمجھتے ہیں کہ ریل کی رفتار تیز ہے۔ خلاء میں معاملہ اس کے بر عکس تھا۔ نہ تو وہاں ہوا تھی اور نہ برابر سے گزرنے والی چیزیں، بس دور تک سیاہی ہی سیاہی۔ اب بھلا کوئی کس طرح رفتار کا اندازہ کر سکتا ہے!

ہمارے دِل اندر ہی اندر ڈوبتے جا رہے تھے، ہم جانتے تھے کہ ہم بے

وزنی کی کیفیت میں ہیں، کیونکہ ایک بار جب میں نے اپنی نوٹ بک جان کی طرف اُچھالی تو وہ ہوا میں تیرنے لگی۔ حالانکہ شاگو کے ڈیزائن کیے ہوئے اس راکٹ میں ہمیں خلائی لباس پہننے کی ضرورت بالکل نہیں تھی، مگر ہم نے احتیاط کے طور پر یہ لباس اپنے جسم سے علیحدہ نہیں کیا تھا۔ ہمارا خلائی کیبن ایک ہال نما کمرہ تھا۔ جس میں مختلف چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ہر کیبن میں کھڑکیاں تھیں جن میں سے ہم باہر کا نظّارہ دیکھ سکتے تھے۔ اگر سچ پوچھئے تو لفظ "نظّارہ" استعمال کرتے ہوئے میرا دِل لرز رہا ہے، وہ نظّارہ کُچھ اس قسم کا تھا کہ حدِّ نظر تک اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ سورج کی روشنی سے کروڑوں اوراربوں ستارے جگمگا رہے تھے۔ بار بار کوئی شہاب ثاقب تیز رفتاری سے شعلے اُگلتا ہوا ادھر سے اُدھر جاتا ہوا نظر آ جاتا۔

شہاب ثاقب خلاء میں اڑتے ہوئے مادی اور ٹھوس ٹکڑے ہوتے ہیں۔

جس سیّارے کے نزدیک سے یہ گزرتے ہیں، سیّارے کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور وہ تیز رفتاری سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ ایسے شہاب ثاقب ننّھی سی گیند سے لے کر پہاڑ جتنے بڑے ہوتے ہیں۔ آپ راتوں کو آسمان پر ستارے ٹوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ دراصل یہ وہی شہاب ثاقب ہوتے ہیں، بڑا بھیانک نظّارہ تھا۔ یوں لگتا تھا گویا ہم جہنَم میں آ گئے ہیں۔ اور جہنَم کے فرشتے آگ کی چھوٹی بڑی گیندیں ہماری طرف پھینک رہے ہوں۔ واقعی وہ جہنّم تھا۔ نہ درخت، نہ پہاڑ، نہ ندی نالے، نہ چہچہاتے ہوئے خوبصورت پرندے اور نہ نیلا آسمان۔ اگر کُچھ تھا تو بس صرف سیاہ خلاء، اور اب یہی سیاہی ہمارا مقدر بن کر رہ گئی تھی۔

والٹر اسمتھ اور جان خلائی کیبن کے کنٹرول روم میں مصروف تھے۔ اختر اور سوامی ایک برتھ پر خاموشی سے گردن لٹکائے بیٹھے تھے۔ میں زرینہ کے قریب بیٹھا ہوا اسے مختلف باتیں سُنا کر اس کا دھیان بٹانے کی کوشش

کر رہا تھا اور جیک کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا خلاء میں جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنے جبڑے بڑی سختی سے بند کر رکھے تھے اور اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک تھی۔ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ ہم سب اپنے تیز رفتار راکٹ کے رحم و کرم پر تھے جو ہمیں اپنی دور دراز منزل تک لے جا رہا تھا۔ مگر ہمارے دِل یہ سوچ کر ڈر رہے تھے کہ کیا ہم اس تک پہنچ بھی سکیں گے؟

راکٹ آہستہ آہستہ مختلف وقفے کے بعد اپنے نچلے حصّے گراتا جا رہا تھا۔ اس لحاظ سے اس کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن میں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ رفتار کے بڑھنے اور گھٹنے کا اندازہ بالکل نہ ہوتا تھا، صرف کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا جان کبھی کبھار ہمارے پاس آ کر بتا دیتا تھا کہ راکٹ کی رفتار کتنی ہے اور ہم لوگ کتنے عرصے کے بعد سیّارہ زہرہ تک پہنچیں گے؟

"زمین کے کنٹرول روم سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ہم ایک ہفتے کے بعد زہرہ تک پہنچیں گے۔"

"لیکن آپ نے ان سے یہ بھی دریافت کیا کہ لفٹ پر کس کی انگلیوں کے نشان تھے۔" جیک نے پوچھا۔

"ہاں۔۔ ابھی ایک گھنٹے کے اندر مجھے اس کی رپورٹ مل جائے گی۔"

"مگر اس سے فائدہ کیا۔ ہمارا دُشمن تو اب یہاں نہیں ہے۔" سوامی نے کہا۔

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو۔" میں نے جلدی سے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "ہمارا دُشمن کوئی انسان نہیں ہے، بلکہ وہ سیّارہ زہرہ کی ایک ہستی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی اور شکل میں ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہا ہو۔"

میری یہ بات سُن کر سب کے چہروں پر مردنی چھا گئی اور سب خوفزدہ

نظروں سے مُجھے دیکھنے لگے۔

سوامی نے کنکھیوں سے ہر شخص کو باری باری دیکھا اور پھر بولا۔ ’’ایسا ناممکن ہے، وہ ہمارے ساتھ اِس راکٹ میں نہیں ہو سکتا۔‘‘

’’اور فرض کر لیجئے اگر ہوا بھی تو پھر ہم اُس سے مُقابلہ کریں گے۔‘‘ جیک نے جلدی سے کہا۔

’’اُسے ختم کرنے کے لیے تو میں ہی کافی ہوں۔‘‘ اختر بہت دیر سے خاموش تھا۔ مگر اب اچانک جوشیلے لہجے میں بولنے لگا۔

میں نے محبّت بھری نظروں سے اختر کو دیکھا۔ کیوں کہ اس کے اس طرح سینہ تان کر یہ کہنے سے میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ اختر شروع ہی سے خطروں کے اندر پلا بڑھا تھا اسی لیے وہ بہت زیادہ بہادر اور نڈر تھا۔ اور یہ اس کی بہادری ہی تھی جو اس نے سب کے سامنے یہ بات کہی تھی۔

میں کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک کنٹرول روم میں سے والٹر نے مُجھے آواز دی۔ اور میں فوراً اس کے پاس پہنچ گیا۔

"زمین کے کنٹرول ٹاور سے پیغام آگیا ہے۔" والٹر نے کہا۔

"کون سا پیغام۔۔؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہی لفٹ کے اوپر انگلیوں والا پیغام۔"

"اچھّا چھا۔۔۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کس کی انگلیوں کے نشان تھے وہ؟"

"یہ تو نہیں بتایا گیا۔۔۔ البتّہ اتنا کہا گیا ہے کہ جس کی انگلیوں کے نشان ہیں، وہ شخص ہماری پارٹی میں شامل ہے۔"

کیبن میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی نظریں ہماری طرف لگی ہوئی تھیں، والٹر نے جو کُچھ کہا تھا وہ سب نے اچھّی طرح سُن لیا تھا۔ اور یہ بات سنتے

ہی کیبن میں ایک بھنبھناہٹ سی گونج اٹھی۔ سب ایک دوسرے کو شک و شُبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے، ان نظروں میں ہلکا سا خوف چھپا ہوا تھا۔ بالکل ایسا ہی واقعہ میرے دوسرے سفر میں پیش آیا تھا جب کہ میں کالی دُنیا میں گیا تھا (ناول کالی دُنیا پڑھیے)۔ تب بھی ہم نے ایک دوسرے پر شک کیا تھا۔ ہو بہُو ویسی ہی حالت اب تھی۔ سوامی پر چونکہ ہمیں پہلے ہی سے شک تھا۔ اس لیے میرے ساتھ ہی دوسروں کی نظریں بھی اس کے چہرے پر جم گئیں۔ مگر وہ ذرا نہ گھبرایا بلکہ ڈھٹائی سے مُسکراتا رہا۔ جیک کو یہ دیکھ کر اچانک تاؤ آگیا۔ اور وہ اس کی طرف گھونسہ تان کر بڑھا۔ سوامی نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ بھی اس طرح آگے کر دیے گویا وہ بھی لڑنے کے لیے تیّار ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ بولا۔

"مجھے بد تمیزی پر آمادہ نہ کیجئے جیک صاحب۔ آپ لوگوں کی جو عزّت میری نظروں میں قائم ہے اسے برقرار رہنے دیجئے۔"

"میں تمہارا مُونہہ توڑ دوں گا۔ ۔ ۔ "جیک نے غُصّے سے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ضرور توڑ دیجیۓ گا۔" سوامی نے اطمینان سے کہا۔

"لیکن مُجھے خطا وار ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

جیک نے یہ سُنتے ہی اپنے ہاتھ نیچے گرا دیے اور اس کا تنا ہوا جسم اچانک ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ سوامی سے نرمی سے دریافت کرنا چاہیۓ کہ آخر اس پر ہم لوگ شُبہ کیوں نہ کریں؟ میں نے جب اس سے یہ بات کہی تو وہ حسبِ عادت مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مالک کی انگلیوں کے نشانات کس طرح ملائے جائیں گے؟"

والٹر سب باتیں دیکھ اور سُن رہا تھا۔ حالات کو بگڑتے دیکھ کر اچانک اس

نے آگے بڑھ کر کہا۔

"دیکھئے مسٹر فیروز آپ کا یہ ملازم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ حضرات کا شُبہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن انگلیوں کے نشانات کو دیکھے بغیر کسی کے خلاف کوئی فیصلہ کر دینا دانش مندی نہیں ہے۔"

"پھر کیا کِیا جائے؟"

"ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔ آپ کی پارٹی پرانی ہے اور آپ سب پر اعتبار بھی کرتے ہوں گے۔ صرف میں آپ کی اس پارٹی میں نیا ہوں۔ اصولاً آپ حضرات کو مُجھ پر شُبہ کرنا چاہیئے۔"

"کیا کہہ رہے ہو والٹر!" جان نے چونک کر کہا۔

"درست کہہ رہا ہوں۔۔۔" والٹر نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہنا شروع کیا۔ "میں نے اِس اُلجھن کا یہ حل سوچ لیا ہے کہ میں زمین کو فوراً یہ پیغام بھیجتا

ہوں کہ وہ لوگ انگلیوں کے نشانات کا ایک فوٹو ٹیلی ویژن کے ذریعے ہمیں بھیج دیں۔ جب نشانات کا فوٹو ہمارے پاس آ جائے گا تو ہم اس راکٹ میں موجود سب ہی لوگوں کی انگلیوں کے نشانات سے ملا کر اسے دیکھیں گے اور اس طرح ہمارا مجرم ہمارے ہاتھ آ جائے گا۔"

"نہیں۔۔۔ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" سوامی نے چیخ کر کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔" جان نے سوامی کو غُصّے سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اگر تم مجرم نہیں ہو تو تمہیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مگر۔۔۔مگر۔۔۔میں، نہیں بھگوان کے لیے ایسا نہیں کیجیۓ۔"

سوامی یہ کہتے ہوئے اپنا سر پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔

"اب تو ایسا ہی ہو گا۔۔۔تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔" جان نے کہا۔

زرینہ پھٹی پھٹی نظروں سے سب کو باری باری دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوامی کے لیے ہمدردی کا جذبہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بر عکس سوامی کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک گزر گزر جاتا۔ وہ مُونہہ ہی مُونہہ میں کُچھ بڑبڑا رہا تھا۔ جان والٹر کو ساتھ لے کر کنٹرول روم میں چلا گیا اور جاتے ہوئے جیک کو ہدایت دے گیا کہ وہ سوامی کا خیال رکھے اور اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے۔

ابھی چند لمحوں کے بعد فیصلہ ہو جانے والا تھا۔ ہم سب اچھّی طرح جان چکے تھے کہ مجرم سوامی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ وہ چونکہ ثبوت مانگتا تھا اس لیے ثبوت بھی مہیّا ہوا جاتا ہے۔ اختر خاموش اور اداس نظروں سے سوامی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ملامت تھی۔ گویا وہ کہہ رہا ہو۔

"کلو سوامی۔۔ ہمیں تم سے یہ اُمّید نہیں تھی!"

سوامی کو اس انداز سے دیکھنے کے بعد وہ کبھی کبھار ہم سب کو بھی دیکھ لیتا

تھا، اس طرح جیسے وہ ہم سے اس کے لیے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔
حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دِل کٹ رہا تھا۔ میں اچّھی طرح جانتا تھا کہ وہ سوامی سے کتنی محبّت رکھتا ہے! مگر اب میں بھی مجبور تھا۔ سوامی نے ایسا بھیانک جرم کیا تھا جس کی سزا اسے ملنی ضروری تھی۔
جان جب تک والٹر کے ساتھ کنٹرول روم میں رہا، میں اتنے عرصے تک ایک بات برابر سوچتا رہا۔ ۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر سوامی ہی سچ مچ مجرم ہے تو اس نے لفٹ کے اندر ڈائنا میٹ کیوں رکھا۔ جب کہ وہ یہ بات اچّھی طرح جانتا تھا کہ ڈائنا میٹ کے پھٹتے ہی وہ خود بھی موت کے مُونہہ میں پہنچ جائے گا؟

بس یہی ایک بات تھی جو سوامی کے حق میں جاتی تھی ورنہ وہ ہماری نظروں میں مشکوک تھا۔

جتنی دیر تک جان کنٹرول میں رہا، ہمارے دِل میں دھکڑ پکڑ ہوتی رہی۔ ہم

لوگ ایک ایک لمحہ بڑی مُشکل سے گزار رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک لمحہ ایک سال سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ آخر خُدا خُدا کر کے جان اپنے ہاتھ میں ایک فوٹو لیے ہوئے باہر آگیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں اس معاملے میں بے قصور ہوں، خواہ مخواہ میرا دِل اندر ہی اندر بیٹھتا جا رہا تھا۔ جان نے ایک اُچٹتی ہوئی سی نظر سب پر ڈالی اور پھر بولا۔

"آپ حضرات اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے نشانات دینے کے لیے تیّار ہو جائیں۔"

اس کے یہ الفاظ بم کی طرح ہم پر گرے۔ ہم گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں انگلیوں کے نشانات سیاہی کے ذریعے صاف کاغذ پر اُتارنے پڑے۔ جب یہ نشانات جان کے پاس آ گئے تو اس نے انہیں اس فوٹو سے ملانا شروع کیا۔ جو کُچھ ہی دیر پہلے بذریعہ ٹیلی ویژن ہمارے راکٹ کے کنٹرول روم میں وصول ہوا تھا۔

جان باری باری نشانات ملاتا جاتا اور پھر بُلند آواز سے اس بات کا اعلان کرتا جاتا تھا کہ نشانات فلاں آدمی کی انگلیوں سے نہیں ملتے۔ جس کا نام فہرست سے خارج ہو جاتا وہ اطمینان کا لمبا سا سانس لیتا۔ سب سے پہلے والٹر، پھر جان اور اس کے بعد میں اور زرینہ اس خطرناک الزام سے بری ہوئے۔

اب ہماری نظریں جیک و سوامی اور اختر پر لگی ہوئی تھیں۔ ہم جانتے تھے کہ اب کُچھ ہی دیر میں اس کڑوی حقیقت کا انکشاف ہوا ہی چاہتا ہے جسے جاننے کے لیے ہم عرصے سے پریشان تھے۔

جان نے بُلند آواز سے سوامی کا نام پکارا اور کہا کہ اب وہ اس کی انگلیوں کے نشانات ملا رہا ہے۔ اتنا سُنتے ہی اختر فوراً کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی جیک بھی دو قدم آگے بڑھ آیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جیسے ہی جان سوامی کا نام ظاہر کر کے اسے مجرم قرار دے گا۔ جیک اور اختر بِلّی کی سی پھرُتی سے

اُسے دبوچ لیں گے تاکہ وہ اور کوئی خطرناک حرکت نہیں کر سکے۔

جان نشان ملا رہا تھا اور سوامی کی حالت ایسی تھی گویا اس کی جان نکلی جا رہی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ زرد تھا اور جسم لرز رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا نام بطور ایک مجرم کے پکارا جاتا اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور جان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولا۔

"نہیں بھگوان کے لیے نہیں۔۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں مان لیتا ہوں کہ یہ سب کُچھ میں نے کیا تھا۔ میں نے ہی شروع سے آپ کی راہ میں کانٹے ہوئے تھے اور میں ہی لفٹ کو ڈائنامیٹ کے ذریعے اڑا دینا چاہتا تھا۔"

سوامی کی زبان سے یہ سُنتے ہی جیک نے جلدی سے اُسے دبوچ لیا۔ مگر سوامی نے ذرا سا بھی احتجاج نہیں کیا۔ ہم لوگ حیرت اور خوف سے سوامی کو دیکھ رہے تھے اور میرا دِل رو رہا تھا۔ سچ مچ رو رہا تھا، کیونکہ سوامی تو وہ

شخص تھا جو میرے پسینے کے ساتھ اپنا خون بہا سکتا تھا۔ جو ہر آڑے وقت میں میرا کام آتا تھا۔ جس نے میرے بچّوں کی اتنی خدمت کی تھی کہ شاید ہی کوئی کرتا۔ اور وہی سوامی اس وقت میرے سامنے اقبالِ جرم کر رہا تھا۔

جان نے حالانکہ ابھی تک سوامی کا نام نہیں پکارا تھا لیکن وہ خود حیرت اور تعجّب سے اسے لگاتار تکے جا رہا تھا۔ کافی دیر تک اس طرح دیکھتے رہنے کے بعد جان نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اور پھر جیک کو مخاطب کر کے بولا۔

"سوامی کو چھوڑ دو جیک۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔ بھلا ایک خطرناک مجرم کو میں کیسے چھوڑ دوں؟" جیک نے غرّا کر کہا۔

"چھوڑ دو سوامی کو۔" جان نے غُصّیلے لہجے میں کہا۔ "وہ مجرم نہیں ہے۔"

"کیا۔۔۔۔؟" جیک کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر سوامی کو چھوڑ دیا۔

"وہ مجرم نہیں ہے تو پھر کون ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"خبردار۔۔ اپنی جگہ سے کوئی ہلنے کی کوشش نہ کرے۔"

یہ آواز کیبن میں گونجی۔ لیکن یقین مانئے مُجھے یوں لگا جیسے میرے کان مُجھے دھوکا دے رہے ہیں، میری آنکھیں حیرت کے باعث پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں خوفزدہ نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو ہاتھ میں ایک عجیب قسم کا ریوالور لیے ہوئے ہمارے سامنے کھڑا تھا اور وہ شخص۔۔۔ ہائے کس طرح بتاؤں کہ وہ شخص میرا چہیتا اور لاڈلا بیٹا اختر تھا!

میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میری اور زرینہ کی کیا حالت

ہوئی۔ شرمندگی کے باعث میری آنکھوں میں آ گئے۔ سب کے سب اختر کو اس طرح دیکھ رہے تھے گویا وہ کوئی حیرت انگیز انسان ہو۔ اپنی جگہ سے کسی نے بھی ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چند انسان پتھرّ کے بُت بن کر رہ گئے ہوں۔ آخر کار جان نے اس خاموشی کو توڑا اور سخت لہجے میں کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے اختر؟"

"تم سب ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ، ورنہ میں سب کو مفلوج کر دوں گا۔" اختر نے جواب دینے ک بجائے بھیانک آواز میں حُکم دیا۔

سوامی کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے کُچھ کہنے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اختر نے للکار کر کہا۔ "او خبیث بُڈّھے۔۔۔ اپنی جان کی خیر چاہتا ہے تو اپنی جگہ کھڑا رہ۔"

"اختر۔۔ بیٹا اختر تمہیں یہ کیا ہو گیا۔۔؟"

زرینہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ مگر اختر نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے اپنے سے علیحدہ کر کے دور پھینک دیا اور پھر فوراً ہی اپنے حیرت انگیز ریوالور کا رُخ زرینہ کی طرف کر کے بٹن دبا دیا۔ ریوالور میں سے سُنہری رنگ کی ایک شُعاع نکلی اور اِس شُعاع کی زد میں آتے ہی زرینہ جس طرح اور جس انداز میں گری ہوئی تھی ایسی ہی گری رہ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس شعاع نے زرینہ کو منجمد کر دیا ہو۔ اس کا ہاتھ جہاں رکھا تھا وہیں رکھا رہا اور مُونہہ رونے کے انداز میں جس طرح کھلا ہوا تھا ویسا ہی کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کان کھول کر سُن لو تم سب۔" اختر نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ "میں اِس عورت کی طرح تم سب کو ایک ایک کر کے مفلوج کر دوں گا۔ یاد رکھو میں تمہیں اتنی سخت سزا دوں گا کہ تم لوگ ہمیشہ یاد کرو گے، لیکن اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو شاید میں تمہیں معاف کر دوں۔"

جیک حبشی تھا اور بے حد بہادر بھی اس لیے اختر کی اِن دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوااوراس نے اچانک اپنے مقام سے جست کی تاکہ وہ اختر کو پکڑ سکے۔ مگراتنے ہی عرصے میں اختر نے جیک کی طرف اپنے پستول کا رُخ کر کے اس کا بٹن دبا دیا تھا۔ جیک اس وقت کیبن کی زمین سے کئی فٹ اوپر تھا لیکن سنہری شعاع کی زد میں آتے ہی وہ وہیں درمیان میں معلّق رہ گیا۔ اس کیے ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے اور مُونہہ اس طرح کھلا ہوا تھا کہ اس میں سے نوکیلے دانت نظر آ رہے تھے۔۔ اختر نے اسے دیکھ کرایک قہقہہ لگایااور پھر ہمیں دیکھ کر بولا۔

"میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی یہی سزاہوتی ہے، میں کہہ چکا ہوں کہ میں کسی پر بھی ذراسارحم نہیں کروں گا۔"

"بابا۔۔ بھگوان کے لیے بابا ایسا مت کہو۔" سوامی نے اس کے آگے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب تمہارے بزُرگ ہیں۔"

"کوئی میرا بزُرگ نہیں ہے اور نہ میں ان میں سے کسی کا بیٹا ہوں۔"

اختر نے حقارت سے ہونٹ سکوڑ کر جواب دیا۔

"اب میں اِن کا آقا ہوں اور یہ میرے غلام۔ میرا کہا مانیں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ کُتّے کی موت مارے جائیں گے۔"

"میں جانتا تھا کہ تم یہی کہو گے۔" سوامی نے گردن جھُکا کر کہا۔ "مجھے اِسی دِن کا ڈر تھا، میں جانتا تھا کہ یہ وقت ضرور آئے گا۔ اسی لیے میں نے تمھیں بچانے کی خاطر سب الزام اپنے سر لیے لیا تھا۔۔۔ مگر بابا ذرا سوچو تو سہی۔۔۔"

"بُڈّھے۔۔۔" اختر نے گرج کر کہا۔ "تو بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا ہے۔۔۔ خاموش رہ ورنہ ایسا نہ ہو کہ مُجھے تیری زبان کاٹنی پڑ جائے۔"

میں آپ کو اپنی اس وقت کی حالت کیا بتاؤں؟ اگر میں زمین پر ہوتا تو ضرور

یہ خواہش کرتا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ لیکن اس وقت میں خلاء میں تھا لہٰذا اس قسم کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ میں بالکل خاموش تھا لیکن میری آنکھیں رو رہی تھیں۔ آنسو میرے کپڑوں کو گیلا کر رہے تھے اور غم و غصّہ کے باعث میرا رواں رواں لرز رہا تھا۔ جس سوامی کو میں اب تک غدّار سمجھتا تھا در حقیقت وہ تو میرا سب سے بڑا وفادار ثابت ہوا۔ میں نے بڑے ضبط کے بعد اپنی زبان کھولی اور اختر کو مخاطب کر کے بولا۔

"خوب صلہ دے رہے ہو میری محبّت کا بیٹے۔ شاباش! مُجھے تم سے یہی اُمّید تھی۔"

اختر نے جواب کُچھ نہیں دیا، بس مُجھے گھور کر دیکھتا رہا، جان اور والٹر اگر چاہتے تو فوراً ہی اپنے پستول نکال کر اختر کو نشانہ بنا سکتے تھے مگر وہ بھی بے بسی سے یہ سب کُچھ دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ اچھّی طرح جانتے تھے کہ

وہ اختر پر گولی نہیں چلاسکتے۔ اختر مُونہہ ہی مُونہہ میں کُچھ بڑبڑاتا رہا اور پھر اس نے جان کی طرف دیکھ کر کہا،

"تم لوگ فوراً بڑے کیبن میں پہنچ جاؤ۔۔ یہ میرا آخری حُکم ہے۔"

"لیکن پھر راکٹ کو کون دیکھے گا۔۔۔؟" والٹر نے گھبرا کر پوچھا۔

"اسے دیکھنے کے لیے میں اکیلا کافی ہوں۔" اختر نے ایک بھیانک تبسّم کے ساتھ کہا۔

"تُم ایک طرح سے میرے قیدی رہو گے۔ جب تک کہ میں زہرہ نہیں پہنچ جاتا تم اسی کیبن میں قید رہو گے۔۔۔۔ چلو جلدی چلو۔۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

میں جواب میں کُچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سوامی نے مُجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ گویا وہ مُجھے بتلانا چاہتا تھا کہ میں اختر کی بات مان لوں۔ پھر بھی میں نے

مناسب سمجھا کہ اختر سے دریافت کرلیا جائیے کہ قید میں ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی۔ جب میں نے پوچھا تو اختر نے ہنس کر جواب دیا۔

"تکلیف کیوں ہونے لگی سرکار، آپ کے لیے تو مخمل اور کمخواب کے گدّے بِچھا دیے گئے ہیں قید خانے میں۔" اس کے بعد ڈانٹ کر بولا۔

"چلو اندر چلو۔۔۔"

مجبوراً ہم سب قید خانے میں آ گئے۔ زرینہ اور جیک کے بارے میں اختر نے بتایا تھا کہ پانچ گھنٹے کے بعد انہیں خود بخود ہوش آ جائے گا اور وہ قید خانے میں پہنچا دیے جائیں گے۔ یہ تو اب ظاہر ہو ہی چکا تھا کہ غدّار سوامی نہیں بلکہ اختر تھا۔ لیکن اتنا جاننے کے باوجود کُچھ باتیں اور تھیں جنھیں ہم معلوم کرنا چاہتے تھے۔ سوامی سے جب کہا گیا کہ وہ اب تک کے پیش آئے ہوئے واقعات بتائے تو اس نے پہلے تو کُچھ پس و پیش کیا لیکن پھر سب کے اصرار پر وہ آمادہ ہو گیا۔

کسی نامعلوم سیّارے کی کشش میں داخل ہوگیا ہے

اس نے کیبن کی کھڑکی میں سے جھانک کر اختر کو دیکھا۔ اختر کنٹرول والی سیٹ پر بیٹھا ہوا سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے مصروف پا کر سوامی نے ایک لمبا سا ٹھنڈا سانس بھر کر کہنا شروع کیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا بات کہاں سے شروع کروں؟ ویسے یہ سب چکّر اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم لوگ بمبئ میں تھے اور زہرہ کے نئے ڈکٹیٹر شاکا نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ وہ بہت جلد ہم سے انتقام لینے والا ہے۔"

"تو کیا یہ شاکا کا انتقام ہی ہے جو اختر اچانک ہمارے خلاف ہو گیا ہے۔" میں نے چونک کر دریافت کیا۔

"ہاں مالک۔۔۔ یہ اسی کا انتقام ہے۔۔" سوامی نے پھر ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اُس نے جو دھمکی دی تھی وہ پوری ہوئی، وہ چاہتا تھا کہ ہمارے ساتھیوں میں سے کسی پر اپنا خاص عمل کر کے اسے اپنا تابع بنا لے۔ اس مقصد کے لیے اس نے بابا کو چُنا۔"

"تُم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جان نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اختر ہی دراصل شاکا کے نزدیک پچھلے فساد کی جڑ تھا۔ اسی نے نجمہ کے ساتھ مل کر زہرہ کے پرانے ڈکٹیٹر کا خاتمہ کیا تھا۔"

"درست ہے۔ اسی لیے اختر پر اس نے اپنا حربہ آزمایا۔" والٹر نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"مجھے رہ رہ کر زرینہ اور جیک کا خیال آ رہا تھا۔" جان نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے وہ دونوں اپنی عجیب اور حیرت انگیز قید سے کب رہا ہوں گے؟"

"آپ بے فکر رہیئے۔ بابا ان دونوں کو جلد ہی آزاد کردے گا۔" سوامی نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں زیادہ تک مفلوج نہیں رکھے گا۔"

"ہم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے ہیں اور سوامی کی داستان نہیں سُن رہے ہیں۔" میں نے سب کو باری باری دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"واقعی یہ غَلطی ہوگئی۔" جان نے جلدی سے کہا۔ "ہاں سوامی تم اپنی روداد شروع کرو۔"

سوامی نے چند لمحوں تک خاموش رہ کر اپنے ذہن کو کریدا اور پھر بولا۔ "جب دیو زاد چیلوں نے ہم پر حملہ کیا تھا اور بہت بڑے کچھوے بابا کو گھسیٹ کر سمندر میں لے جانے لگے تھے تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ میں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی، اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا، چھلانگ لگانے کے بعد میں ایک مچھلی کے پیٹ میں چلا گیا تھا۔ پہلے تو میں اسے مچھلی ہی سمجھا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ میں شیشے کے ایک بہت بڑے

کیبن میں ہوں۔ آپ کو میں یہ سب کُچھ بتا چکا ہوں۔ اب تو یہ سنیے کہ جب دو عجیب و غریب انسان مُجھے اور بابا کو اٹھا کر سمندری لیبارٹری میں لے گئے تو پھر کیا ہوا؟"

"ہاں، صرف وہی حصّہ ہم لوگوں کے لیے کار آمد ہے۔" جان نے کہا۔

"لیبارٹری میں ہم دونوں کو میزوں پر لِٹا دیا گیا اور بجلی کے عجیب اور حیرت انگیز آلات سے ہمیں جکڑ دیا گیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ لوگ ہم پر کوئی خاص عمل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے سروں پر بجلی کی ٹوپیاں چڑھانے کے بعد ایک آدمی اس مشین کے پاس پہنچا جس میں سے چند تار نکل کر ہماری فولادی ٹوپیوں میں آرہے تھے، اس نے جیسے ہی مشین کا بٹن دبایا مُجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں اڑ رہا ہوں اور میرے چاروں طرف سبز رنگ کے بادل لہرا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بابا بے ہوش ہو چکا تھا۔ مگر میں اس وقت تک ہوش میں تھا۔"

"لیکن تم بے ہوش کیوں نہیں ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"بمبئی میں، مَیں نے جان بوجھ کر آپ کو غَلط کہانی سُنائی تھی مالک۔" سوامی نے مُسکرا کر کہا۔ "مجھے وہ باتیں چھپانی تھیں۔ میں اگر اسی وقت یہ راز ظاہر کر دیتا تو شاید اس وقت ہم سب راکٹ میں نہیں ہوتے، بلکہ کبھی کے ختم ہو گئے ہوتے!"

"اور وہ راز کیا تھا؟" والٹر نے اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ راز یہ ہے کہ میں نے ایک چھوٹی سی پِن جو اس وقت میری قمیض کے کالر میں لگی ہوئی تھی، جلدی سے نکال کر اپنے بازو میں آدھی سے زیادہ پیوست کر دی۔۔۔ مُجھے تکلیف تو بہت ہوئی مگر میں برداشت کر گیا۔ اس سے مُجھے یہ فائدہ ہوا کہ دماغ دھونے والی اور یادداشت دور کر دینے والی اس مشین کا اثر مُجھ پر ذرا بھی نہ ہوا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ میرا دماغ تکلیف کی وجہ سے جاگتا رہا تھا۔ میرے بازو میں جو درد ہو رہا تھا اس نے مُجھے

سونے سے روک دیا تھا۔۔ بابا سوگیا تھا اس لیے ان لوگوں نے بابا کا دماغ دھودیا، اس کی یادداشت دور کردی اور اپنے احکامات اس میں بھر دیے۔ درحقیقت اب بابا ان کا غلام بن چکا تھا۔

مسمریزم کے ذریعے کسی بھی شخص کو اپنا تابع بنایا جا سکتا ہے۔ بابا کے ساتھ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سبز روشنی میں وہ اسی لیے بابا کو نہلاتے تھے کہ اس کا دماغ ہماری طرف سے اجنبی اور ان کا جانب دار ہو جائے۔ میں ان لوگوں کے جال میں پھنسا تو نہیں لیکن جس وقت وہ میرا دماغ صاف کر رہے تھے میں نے ظاہر یہی کیا تھا کہ میں بھی ان کا حامی بن چکا ہوں۔ بابا کے سامنے بھی میں یہی ظاہر کرتا رہا۔ اگر نہ کرتا تو میرا بھید کھل جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ لوگ مُجھ پر شک کرتے رہے۔ سچ پوچھیے تو میں بھی یہی چاہتا تھا، کیوں کہ آپ کا مُجھ پر شک کرنا ضروری تھا۔ اس طرح بابا اپنے آقاؤں کو یہ خبریں دیتا رہا کہ شُبہ سوامی پر

کیا جا رہا ہے اور میں بالکل محفوظ ہوں۔"

"واقعی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جان نے ایک لمبا سا سانس لیا اور پھر آہستہ سے بولا۔ "مُجھے یاد ہے کہ ایک بار اختر نے مُجھ سے تمہارے بارے میں یہی کہا تھا کہ تم راکٹ ساز فیکٹری کے تاروں میں سے سبز روشنی میں نہاتے ہوئے گزر جاتے تھے اور بعد میں اپنے ہاتھ آسمان کی سمت اٹھا کر کُچھ بڑبڑاتے رہتے تھے۔"

"یہ مُجھ پر الزام تھا۔" سوامی نے جلدی سے کہا۔ "بابا دراصل تمام شُبہ مُجھ پر ڈالنا چاہتا تھا، اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ بابا کے بارے میں مختصراً اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ فارمولا بھی اُسی نے چُرایا تھا۔ ریکارڈ روم کے دروازوں پر لگی ہوئی آہنی چادریں اس نے اپنے آقاؤں کی مدد سے توڑی تھیں۔ میں نے خود دیکھا تھا کہ ایک دِن وہی سنہری روشنی ریکارڈ روم کے دروازے پر پڑی تھی۔ اور اس میں تربوز

کے برابر ایک سوراخ بنا گئی تھی۔ اسی سوراخ میں سے بابا گزر کر کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس نے فارمولا چرایا تھا۔"

اتنا سُنتے ہی میں نے شرم کے مارے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ میرا بیٹا خود چور! یا خدا، یہ دِن بھی دیکھنا میری قسمت میں لکھا تھا!

بات چونکہ بالکل صاف تھی اس لیے تردید کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ میں مُردوں کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا سوامی کی باتیں سُن رہا تھا۔ سوامی اب جان سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"راتوں کو اپنے بستر سے اٹھ کر میں بابا کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ میرا مقصد اس کی جاسوسی کرنا نہیں بلکہ اسے کسی بھی آفت سے بچانا ہوتا تھا۔ ایک رات جب بابا جنگل کی طرف گیا تو میں بھی جلدی سے اس کے تعاقب میں بھاگا۔ اتّفاق سے مُجھے کھڑکی میں لگا ہوا شیشہ نظر نہ آیا اور میں زخمی ہو گیا۔ یہی وقت تھا کہ آپ لوگوں نے مُجھے دیکھ لیا تھا۔ میں جنگل کی سمت کھلنے والی

کھڑکی میں پھنسا ہوا تھا۔ شیشے ٹوٹ کر میرے جسم میں گھُس گئے تھے جس کی وجہ سے میرے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنے زخمی ہونے کی ذرا سی بھی پرواہ نہ کی اور بابا کے پیچھے دوڑنے لگا۔

میں جانتا تھا کہ آپ لوگ میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ مگر مُجھے اس کی فکر نہیں تھی، فکر تھی تو بابا کو بچانے کی۔ کیونکہ وہ اس وقت بھی اپنے نامعلوم آقا کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا۔ وہی آقا جو خلاء میں سے سبز روشنی بابا پر ڈالتا تھا اور اس روشنی کے ذریعے اس سے بات کرتا تھا۔ جب بابا اسی روشنی میں کھڑا ہو گیا اور اپنے آقا سے بات کرنے لگا تو میں نے ایک بہت بڑی حماقت کی۔ افسوس ہے کہ بابا کی محبّت میں مُجھ سے وہ غَلطی سر زد ہو ہی گئی۔ اِسی غَلطی کا خمیازہ بعد میں ہمیں اس وقت بھگتنا پڑا جب ہمارا راکٹ پرواز کرنے والا تھا اور اسے ڈائنا میٹ سے اُڑانے کی کوشش کی گئی تھی۔"

"مگر وہ غَلطی کیا تھی؟" جان نے پوچھا۔

"یہی کہ میں فوراً روشنی میں نہاتے ہوئے بابا کو پکڑنے دوڑا۔ پھر اچانک ایک تڑاخا ہوااور بابا اس جگہ سے غائب ہو گیا۔"

"وہ میری جی ایل شعاع تھی جس کی وجہ سے روشنی غائب ہوئی تھی۔" والٹر نے جلدی سے کہا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔" سوامی نے والٹر کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت بابا کہاں غائب ہو گیا تھا؟ مالک میں راز جان چکا تھا اور جب میں نے وہ راز آپ کو بتانا چاہا تو اچانک کسی خاص قوّت نے مُجھ پر بے ہوشی طاری کر دی اور میں آپ کو کُچھ نہ بتا سکا۔۔ وہ قوّت دراصل بابا کی تھی جس کا جسم غائب ہو گیا تھا، مگر جو ہمارے قریب موجود تھا اور ہماری گفتگو سُن رہ تھا، اسی نے مُجھے بے ہوش کیا تھا۔"

"مگر یہ بات تو ثابت ہو چکی تھی کہ اختر اپنے کمرے میں کتاب پڑھ رہ تھا، پھر آخر وہ اُس جگہ روشنی میں کیسے آگیا اور کیسے غائب ہو گیا؟" میں نے چونک کر گردن اٹھائی اور سوامی سے دریافت کیا۔

"میرے مالک اِس غَلط فہمی کا ہم سب شکار ہوئے۔" سوامی نے جواب دیا۔

"بات معمولی ہے، جس بابا کو آپ نے کمرے میں کتاب پڑھتے ہوئے پایا تھا، وہ اصل بابا نہیں تھا۔ اصل بابا تو روشنی میں کھڑا نہار رہا تھا۔"

"اگر وہ اصل اختر نہیں تھا تو پھر کون تھا؟" جان نے گھبرا کر پوچھا۔

"بابا کا عکس!" سوامی نے کہا۔ "ویسا ہی عکس جیسا ہم بمبئی میں مالک کے کمرے میں جکاری اور زوک کا دیکھ چکے تھے۔ زہرہ کے ڈکٹیٹر شاکا نے کروڑوں میل دور سے یہ عکس مالک کے کمرے میں بھیجا تھا۔ وہ محض

تصویر تھا مگر ہمیں جیتا جاگتا دکھائی دیتا تھا۔ بابا کا اِسی طرح کا عکس آپ کو دکھایا گیا اور آپ مطمئن ہو گئے کہ بابا تو کمرے میں کتاب پڑھ رہا ہے، پھر بھلا سبز روشنی میں وہ کس طرح ہو سکتا ہے۔"

"سوامی میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ تم نے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا۔۔۔" جان نے آگے بڑھ کر اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ سوتے رہے اور تُم جاگتے رہے۔ لیکن اگر تم ہمیں بھی اپنے راز میں شریک کر لیتے تو شاید اتنی مشکلات پیش نہ آتیں، جتنی کہ اب آئی ہیں۔"

"معاف کیجئے گا، میں آپ سے متّفق نہیں ہوں۔" سوامی کی بجائے والٹر نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "سوامی اگر آپ کو پہلے ہی سے سب کُچھ بتا دیتا تو ظاہر ہے کہ آپ لوگ انجان بننے کی اداکاری کرتے رہتے، لیکن کسی بھی وقت یہ اداکاری اختر پر ظاہر ہو جاتی اور اس کے آقا پر

پھر آپ کا بھید کھل جاتا۔ میں تو سوامی کی باتوں سے یہ سمجھ پایا ہوں کہ اختر دراصل ایک چلتا پھرتا ٹرانسمیٹر ہے اور ایک انسان سے اسے چلتا پھرتا ٹرانسمیٹر اس کے آقاؤں نے صرف ہمارے راز جاننے کے لیے بنایا ہے۔ اس لحاظ سے سوامی نے اچھّا کیا کہ اختر کے راز جانتا رہا اور ہمیں لاعلمی میں رکھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پھر ہم لوگوں کو راکٹ کی اڑان سے پہلے ہی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی۔"

"بہر حال جو بھی ہوا وہ تو ہو چکا لیکن سوال یہ ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟" جان نے پوچھا۔

"اب تو ہم اختر میں قابو میں ہیں، دیکھئے وہ کیا کرتا ہے؟" والٹر کے لہجے سے نااُمّیدی صاف جھلک رہی تھی۔

"میں تمہارا بہت بُرا حشر کردوں گا۔" دروازہ کھلا اور اختر کی آواز آئی۔

اس کے ہاتھ میں وہی حیرت انگیز پستول تھا۔ اور وہ ہمیں نہایت غُصّیلی نظروں سے گھور رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہمیں اتنی خوف ناک آنکھوں سے کیوں دیکھ رہا تھا؟ اسے دیکھتے ہی میرے دِل میں اتھل پتھل ہونے لگی۔ آخر وہ میرا بیٹا تھا۔ مانا کہ وقتی طور پر وہ ہمارا دُشمن بن گیا تھا۔ لیکن وہ خود ایسا نہیں بنا تھا، اسے بنایا گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ آخری مرتبہ سے راہ پر لانے کی ایک زوردار کوشش اور کرلوں۔ میں نے اس سے کہا۔

"بیٹا اختر۔۔ کیا تم اپنے ہوش میں آنے کی کوشش نہ کروگے؟"

"خبردار، بے وقوف انسان! آئندہ مُجھے اس طرح مخاطب نہ کرنا۔" اختر نے مُجھے ڈانٹ کر کہا۔ "اور کان کھول کر سُن لو۔ میرا نام اختر نہیں جرمی ہے۔ میں زہرہ کی زوک قوم کی مایہ ناز بیٹی ژاما کا بیٹا ہوں۔۔ سمجھے!"

میں نے تو اداسی کے ساتھ اپنا سر جھُکا لیا، البتّہ جان نے اپنی مُٹھّیاں بھینچ لیں۔ شاید وہ اسے مارنا چاہتا تھا۔

"نہیں۔۔ خُدا کے لیے آپ ایسا نہ کیجئے۔" میں نے فوراً اسے روکا۔

والٹر خاموشی سے اختر کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے تک اس نے لمبے لمبے اور گہرے سانس لیے اور پھر اختر کی طرف ایک قدم بڑھا کر بولا۔

"ٹھیک ہے، تم یہی چاہتے ہو تو یہی سہی مسٹر جرمی۔۔۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ تم ژاما کے بیٹے ہو۔"

"ہوں۔۔۔۔" اختر نے والٹر کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اِن احمقوں میں تم ہی ایک معقول آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"شکریہ! لیکن میں آپ سے کُچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھ سکتے ہو!" اختر نے شاہانہ انداز سے کہا۔

"آپ کا اگلا پروگرام کیا ہے اور آپ ہم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں تمہیں زہرہ لے جانا چاہتا ہوں، تمہاری قسمتوں کا فیصلہ میرے آقا عزّت مآب شاکا خود کریں گے۔"

"ہمیں منظور ہے مسٹر جرمی۔۔۔ لیکن اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہمارے ان دو ساتھیوں کو آزاد کر دیں جنہیں آپ نے باہر مفلوج کر دیا ہے اور جو اس وقت بھی وہیں ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔ میں ابھی انہیں آزاد کر دیتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ایک وعدہ چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے۔۔۔"

"تم لوگ کوئی گڑبڑ نہیں کرو گے۔ زہرہ کا سفر لمبا ہے اور اس سفر میں تم مُجھ پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کرو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

”بہتر ہے، لیکن کان کھول کر سن لو کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو نتیجہ کے ذمّہ دار تم خود ہو گے۔“

اتنا کہہ کر اختر نے اپنے اسی پستول کا بٹن دبایا۔۔۔ اچانک ہمیں کیبن کے باہر دھم سے ایک آواز سُنائی دی اور پھر فوراً بعد ایک چیخ بھی۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ جیک ہوا میں معلّق تھا اب فرش پر گر پڑا ہے اور زرینہ کے کھلے ہوئے مُونہہ سے ادھوری چیخ آزاد ہوئی ہے۔

دروازہ چونکہ کھُلا ہوا تھا اس لیے جیک فوراً دوڑتا ہوا اندر آگیا۔ اختر کو دیکھتے ہی اس نے پھر اسے دبوچنے کی کوشش کی، مگر میں فوراً ان دونوں کے درمیان آگیا اور پھر مختصر لفظوں میں جیک کو کُچھ دیر پہلے کی اختر اور والٹر والی گفتگو سُنا دی جیک نے خوں خوار نظروں سے اختر کو گھورا اور اسی طرح اسے گھورتا ہوا ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔

باہر سے زرینہ کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔۔۔ مُجھے اب خیال آیا کہ اختر

نے زرینہ کو دھکا دے کر دور پھینک دیا تھا۔ یقیناً زرینہ کو چوٹ لگی ہوگی۔ اسی لیے اب وہ کراہ رہی ہے۔ میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا اور پھر آگے بڑھ کر میں نے زرینہ کو اٹھنے میں سہارا دیا۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے مُجھے ایک بار دیکھا اور پھر میرے شانے سے سر لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اختر نے ہم پر ایک گہری نظر ڈالی۔ کُچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر ایک دم پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ زرینہ کو اختر کے رویہ سے کافی تکلیف پہنچی تھی۔ ایک بیٹا اپنی ماں سے اتنی سختی اور بے دردی سے پیش آئے گا یہ اس نے شاید خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

ہم اب اختر کے رحم و کرم پر تھے جو خود کو جرمی جیسے بے ہودہ نام سے پکارنے پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ اختر کے باہر جانے کے بعد ہم نے آپس

میں جو صلاح مشورہ کیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم جہاں تک ہو سکے اختر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہیں، اس کا کہا مانیں اور ساتھ ہی اس کا خیال بھی رکھیں۔ ہمارے راکٹ کو زہرہ تک پہنچنے میں دس دِن کا وقت درکار ہے اور ہمارا خیال تھا کہ ان دس دنوں میں یقیناً ہم اختر کے دماغ کو ٹھیک کرلیں گے اور بالفرض ٹھیک نہ بھی کر سکے تو مُمکن ہے وہ خود ہی راہ راست پر آجائے۔

زہرہ تک پہنچنے میں دس دِن کا وقت لگے گا۔

یہ بات شاید ان لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آئے گی جو میری یہ بھیانک داستان پڑھ رہے ہیں، مگراِس سِلسلے میں مُجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ زہرہ مِرّیخ سے بھی دور ہے۔ مِرّیخ تک راکٹ کے پہنچنے میں چھ ماہ لگتے ہیں تو پھر آخر زہرہ (جواس سے بھی دور ہے) تک پہنچنے میں دس دِن کس طرح لگیں گے؟ اصولاً تو دس یا بارہ مہینے لگنے چاہئیں۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب بھی کرتا ہوں کہ شاگو کے فارمولے سے بنایا ہوا یہ راکٹ عجیب سے کل پرزوں سے لیس تھا۔ اس کی رفتار بھی بے حد تیز تھی۔ اس لیے یہ ایک ماہ کا فاصلہ ایک دِن میں طے کرتا تھا۔ لہٰذا اس حساب سے ہمیں زہرہ تک پہنچنے میں دس دِن کا عرصہ ہی درکار تھا۔

ہم اپنے قید خانے میں پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ جان کیبن کی کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا اور میں زرینہ کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کو یہ کہہ کر اطمینان بھی دلا رہا تھا کہ اختر کی یہ کیفیت عارضی ہے۔ جلد ہی وہ ہوش میں آ کر ہمیں پہچاننے لگے گا، زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔ زرینہ جواب میں کُچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک جان نے چلا کر کہا کہ ہم جلدی سے کھڑکی کے قریب آئیں۔ ہم فوراً اس کے قریب پہنچے۔ وہ کھڑکی کے باہر کا نظّارہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو فیروز۔ ۔ ۔ وہ رہا ہمارا چاند۔ ۔" جان نے ایک ہلکے بھورے اور کتھئی رنگ کی چمک دار گیند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا راکٹ دانستہ اُس کی کشش سے بچ کر نکلا ہے اور اگر میرا اندازہ غلَط نہیں ہے تو اس سے تقریباً ایک ہزار میل دور ہے۔"

"کالے خلا میں یہ خوبصورت سی گیند کتنی بھلی لگ رہی ہے!" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"ساتھ ہی یہ بات بھی نوٹ کرو کہ یہ گیند کتنی تیزی سے چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ہم بڑی تیزی سے چاند کو پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ ۔ اور وہ دیکھو چاند کے پیچھے سے اس سے چھ گنا بڑی ایک گینداور نظر آ رہی ہے۔ وہی ہلکے نیلے رنگ کی گیند۔ ۔ ۔ وہ ہماری زمین ہے!"

"ہماری زمین!" زرینہ حیرت سے تقریباً چیخ کر بولی۔

"ہاں بیٹی۔۔ وہ ہماری زمین ہے۔۔ ہماری خوبصورت اور حسین دُنیا۔ خُدا سے دُعا کرو کہ وہ ہمیں ہمارے مقصد میں کامیاب کرنے کے بعد بحفاظت اس دُنیا میں پہنچا دے۔"

اتنا کہتے ہوئے جان کی آواز بھرّا گئی اور اُسے روتے دیکھ کر ہمارے دِل بھی بھر آئے۔ ہم کھڑکی سے ہٹ کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور پھر خاموشی سے ایک دوسرے کی صورتیں تکنے لگے۔

ہمیں زمین سے پرواز کیے ہوئے تین دِن ہو چُکے تھے۔ ہمارے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ خلائی لباس ابھی تک ہمارے جسم پر تھا اور ہم اختر کو منانے اور اسے اپنا ہم خیال بنانے کا پورا جتن کر چکے تھے مگر ایسا لگتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اختر بھی زیادہ پتھرّ دِل ہوتا جا رہا تھا۔ بہرحال ہمیں اس کی فکر نہیں تھی۔ کم از کم میں یہ چاہتا تھا کہ جو کُچھ بھی ہونا

ہے جلد ہو جائے تاکہ میں اپنی پیاری بیٹی نجمہ اور بہادر داماد امجد کو کسی نہ کسی طریقے سے آزاد کرا سکوں۔

شاید میرے دِل کی یہ خاموش دُعا خداوند کریم نے سُن لی۔ مُصیبت میں وہی اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے اور اسی کی ذات پاک گناہ گار انسانوں کو ایسی آفتوں سے عین وقت پر بچا لیتی ہے۔ اللہ کی یہ مدد بھی اچانک اس وقت آ گئی جب کہ میں اداس اور ملول بیٹھا ہوا اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا۔

راکٹ تیزی سے آگے جا رہا تھا کہ اچانک ہمیں ایک زبردست جھٹکا محسوس ہوا۔ یہ جھٹکا اتنا سخت تھا کہ کیبن کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا سوامی اُدھر سے اڑ کر اِس طرف آ گیا۔ ہم نے گھبرا کر کھڑکی کھولی اور خلا کا نظّارہ کرنے کے لیے کھڑکی میں سے جھانکا۔

میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ سبز رنگ کا ایک

گولا، بہت بڑا گولا تیزی سے ہماری طرف آرہا ہے۔ اس گولے میں سبزی کے ساتھ ہی مختلف قسم کے اور بھی رنگ جھلک رہے تھے۔ جان نے اسے دیکھ کر کہا۔

"خدا ہماری مدد کرے، ضرور کسی نامعلوم سیّارے کی کشش میں ہمارا راکٹ داخل ہوگیا ہے، اوراب وہ سیّارہ ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔"

یہ سُنتے ہی خوف کے مارے ہمارے چہرے زرد ہو گئے۔ یوں لگا جیسے کسی نے ہاتھ پیروں کا دم نکال لیا ہو۔ جوں جوں ہمارا راکٹ اس سیّارے کے نزدیک ہوتا ہوتا جا رہا تھا، سیّارے کی بہت سی چیزیں ہمیں صاف صاف نظر آنے لگی تھیں۔ میں کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک کیبن کا دروازہ کھلا اور اختر گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔

"چلو۔ جلدی چلو، اور راکٹ کے کل پرزے چیک کرو، ایسا نہ ہو کہ ہم اِس سیّارے سے ٹکراجائیں۔"

دِل تو چاہتا تھا کہ اختر کو خوب صلواتیں سناؤں۔۔۔ مگر وہ موقع ایسا نہ تھا، ہم جلدی سے کنٹرول روم میں پُہنچے اور جان اور والٹر کے ساتھ آلات چیک کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اختر ایک طرف خاموش کھڑا ہوا ہمیں گھور رہا تھا، ایسا لگتا تھا گویا وہ خود بھی پریشان ہے اور اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے کہ اسے درحقیقت کیا کرنا چاہیئے؟

سیّارے کی کشش میں داخل ہونے کے بعد راکٹ کی رفتار بے حد بڑھ گئی تھی۔ مُجھے اس کی ہر سمت میں آگ کے لمبے لمبے شعلے لپکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کنٹرول روم کے آلات بتا رہے تھے کہ بس دس منٹ کے اندر اندر راکٹ سیّارے سے ٹکرا کر تباہ ہو جانے والا ہے۔ کاہی مائل سبز رنگ سیّارے سے منعکس ہو کر اب راکٹ کی کھڑکیوں میں سے اندر رینگنے لگا تھا۔ اچانک والٹر کو کُچھ خیال آیا اور اس نے چلّا کر کہا۔

"گھبرائیے نہیں، میں بھول گیا تھا کہ راکٹ میں مخالف سمت میں داغنے

والے چھوٹے راکٹ بھی لگے ہوئے ہیں، میں ان راکٹوں کو داغتا ہوں اور پھر جان صاحب، آپ اس کے دس سیکنڈ بعد پیراشوٹ کھولنے والا لیور دبا دیجئے گا۔"
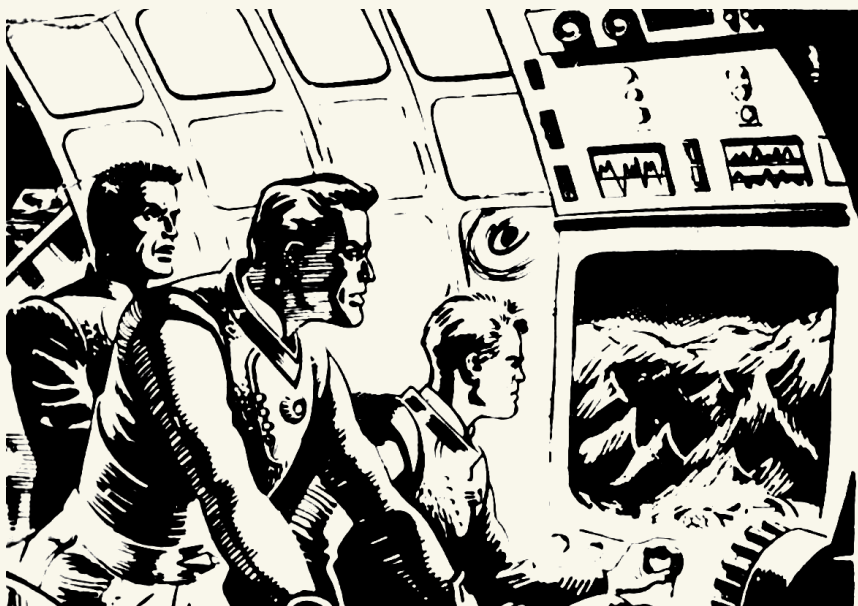
جیسے ہی والٹر نے چھوٹے راکٹ داغے ہمارے راکٹ کی رفتار حیرت انگیز طور پر کم ہو گئی۔ کہاں تو وہ اسّی ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے سیّارے کی طرف جا رہا تھا، اور کہاں اب پیراشوٹ کھولنے کے بعد اس کی

رفتار صرف دو میل فی گھنٹہ رہ گئی۔ اس معمولی رفتار سے ہم لوگ اب آہستہ آہستہ اس سبز سیّارے کی طرف جا رہے تھے جہاں ہمارے لیے یا تو آسائشیں، آسانیاں اور نرالی قسم کی نعمتیں اپنی آغوش کھولے ہمیں پانے کے لیے بے تاب تھیں، یا پھر بھیانک آفتیں، حیرت انگیز واقعات اور اَن دیکھی بلائیں خاموشی سے بیٹھی سبز سیّارے پر ہمارے قدم رکھنے کی منتظر تھیں!

ہمارے دِل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی تھی کہ مُجھے یوں لگتا تھا گویا دِل تڑپ کر اب باہر آ جائے گا۔ خوف اور ہیبت کے باعث جسم کی رگیں کھنچنے لگی تھیں۔ آنکھیں اس طرح اُبل پڑی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈھیلے اب باہر نکل پڑیں گے۔ ہمارے چہرے ہلدی کی طرح زرد تھے۔ سبز رنگ ہمارے چہروں پر اس طرح حاوی ہو گیا تھا کہ ہمیں اپنے چہرے اپنے نہیں معلوم ہوتے تھے صرف چند منٹ کے اندر ہم بالکل بدل چکے

کوئی چیز ہمارے اوپر دھب سے گری

تھے۔ ہمارے گال پچک گئے تھے اور چہرے پر نیلی رگیں نمایاں ہو گئی تھیں۔

میرے خُدا یہ کیسا جہنّم تھا اور یہ کیسا عذاب تھا!

میں کھڑکی میں سے اِس عجیب سیّارے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف سبز رنگ کا ایک ہلکا سا غلاف چڑھا ہوا معلوم ہوتا تھا جس طرح خلا میں سے ہماری زمین کے سب طرف ہلکا نیلا غلاف نظر آتا ہے۔ یہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ پہلی بار تو میں یہی سمجھا کہ شاید اِس سیّارے میں ہوا کا بھی ایک رنگ ہے اور وہ رنگ سبز ہی ہے۔ سیّارے کی زمین مُجھے بڑی بھیانک نظر آتی تھی کہیں سیاہ دھبّے تھے اور کہیں سفید اور اِن دھبّوں میں سے نارنجی رنگ کی چنگاریاں سی اُڑتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس کے علاوہ سیّارے کے اُفق پر مُجھے گہرے سُرخ رنگ کی چٹّانیں دِکھائی دے رہی تھیں۔ خُدا جانے یہ سب کیا تھا؟ زیادہ واقفیت تو اسی وقت حاصل ہو سکتی

تھی جب ہم خیریت کے ساتھ سیّارے کی زمین پر اتریں۔ ۔ اور وہ وقت اب دور نہ تھا۔

جب ہمارا راکٹ سیّارے کی زمین سے کوئی ایک میل اوپر رہ گیا تو والٹر نے چند گیئر اور لیور دبائے۔ اچانک راکٹ اُلٹا ہو گیا۔ دُم سیّارے کی طرف ہو گئی اور مُونہہ خلا کی سمت۔ راکٹ کے نیچے کی سمت جو انجن لگے ہوئے تھے وہ بند کر دیے گئے اور اب اُس میں سے شعلے نکلنے بند ہو گئے۔ فوراً والٹر نے ایک بٹن دبایا اور پھر راکٹ کے نچلے حصّے میں سے اسپرنگ والی چار ٹانگیں بڑی آہستگی سے نکلنے لگیں اور ان ٹانگوں کے نیچے فولادی پیڈ لگے ہوئے تھے، راکٹ اب دھیرے دھیرے نیچے جا رہا تھا۔ وہ ایک معمولی سے جھٹکے کے ساتھ سیّارے کی زمین سے ٹِک گیا۔ اس موقع پر ہمیں کُچھ دیر تک ہچکولے محسوس ہوئے۔ لیکن پھر جلد ہی یہ کیفیت دور ہو گئی۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے کھڑکیوں سے باہر جھانکا۔ سیاہ رنگ کی ناہموار زمین دور تک پھیلی ہوئی تھی صرف کہیں کہیں چند چھوٹی چٹّانیں تھیں۔ اِن چٹّانوں کا رنگ حیرت انگیز طور پر سُرخ تھا۔۔۔ ایسا سُرخ جیسے لپکتے ہوئے شُعلوں کا ہوتا ہے۔ سیاہ زمین پر سے ہمیں اُفق عجیب سے رنگ کا نظر آتا تھا۔ ہماری اپنی دُنیا سے ہمیں آسمان فیروزی نظر آتا ہے، مگر اس سیّارے کی سیاہ زمین سے آسمان بالکل سبز کا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اپنے راکٹ سے بہت دور ہمیں عجیب سے پرندے بھی اُڑتے ہوئے نظر آئے۔ چونکہ وہ بہت دور تھے۔ اس لیے اُن کی ٹھیک ٹھیک شکل و صورت ہمیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔۔۔ سیاہ رنگ کی یہ زمین آگے جا کر اچانک ختم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور پھر وہاں سے سفید رنگ کے کُچھ دھبّے شروع ہوتے نظر آتے تھے۔

بہرحال یہ عجیب جگہ تھی، والٹر ابھی تک کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا مختلف

آلات کی دیکھ بھال کر رہا تھا اور جان اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کُچھ بٹنوں کو دباتا جا رہا تھا۔ اختر سب لوگوں سے لاتعلّق ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہماری مصروفیت کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ والٹر اور جان کی چہروں پر اچانک اطمینان اور سکون کے آثار پیدا ہو گئے۔ والٹر نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم دونوں یہ دیکھ رہے تھے کہ سیّارے کی فضا ہمارے لیے سازگار ہے یا نہیں اور کیا ہم وہاں اتر کر سانس لے سکتے ہیں؟ آپ کو یہ سن کر خُوشی ہوگی کہ ہم خلائی لباس کے بغیر باہر نکل سکتے ہیں اور اس سیّارے پر گھوم پھر سکتے ہیں۔"

"اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں کی فضا ہماری زمین جیسی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"کہہ نہیں سکتا۔۔۔" جان نے کُچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے

کہ کُچھ فرق بھی ہو۔ لیکن یہ فرق اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب ہم میں سے کوئی شخص نیچے جائے۔"

"لیکن یہ خطرہ کون مول لے گا؟" زرینہ نے گھبرا کر کہا۔

"ہم اختر کو بھیجیں گے۔" والٹر نے دانت پر دانت جماتے ہوئے کہا۔

"کیا کہتے ہو!" میں چونک گیا۔ "اختر کُچھ بھی ہو لیکن وہ میرا بیٹا ہے، میں اسے جان بوجھ کر موت کے مُونہہ میں نہیں دھکیل سکتا۔"

"معاف کیجئے گا۔" والٹر کینہ توز نظروں سے مُجھے دیکھنے لگا۔ "پھر ہم میں سے کسی کی جان قیمتی نہیں۔"

میں نے گھور کر والٹر کو دیکھا، اس نے مُجھے غُصّے میں دیکھ کر فوراً اپنی نظریں جھُکا لیں۔ باتیں حالانکہ اختر کے بارے میں ہی ہوئی تھیں لیکن وہ اب بھی اجنبیوں کی طرح باری باری ایک ایک کو دیکھتا رہا۔ سوامی نے

صورت حال کو بھانپ لیا اور پھر آہستہ سے بولا۔ "میں نیچے جاتا ہوں، میری جان ظاہر ہے کہ آپ حضرات کے مقابلے میں زیادہ قیمتی نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر فوراً جیک نے کہا۔ "رہنے دیجئے فیروز صاحب، ہم میں سے کسی نہ کسی کو نیچے جانا ہی ہے۔ سوامی نہیں جائے گا تو میں جاؤں گا اس لیے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔"

سوامی تیّار ہو گیا تو جان نے احتیاط کے طور پر اُسے خلائی لباس پہن لینے کی تاکید کی کہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سوامی سیّارے کی زمین پر قدم رکھنے کے بعد خلائی سوٹ اُتار دے گا۔ اپنے عام لباس میں اگر اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تو پھر سب نیچے چلیں گے۔ بات معقول تھی اس لیے ایسا ہی ہوا سوامی نے جب راکٹ کا دروازہ کھولا تو ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ وہ سیڑھی سے اترا اور پھر اس

نے ڈرتے ڈرتے اپنا پہلا قدم سیّارے کی زمین پر رکھا۔ ہم لوگ کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اس کا پیر تقریباً ٹخنوں تک اس زمین میں دھنس گیا۔ دونوں پیر زمین میں رکھنے کے بعد وہ چند قدم آگے چلا اور ہمیں یوں لگا گویا وہ مخمل یا ربڑ پر چل رہا ہے ایک جگہ کھڑے ہو کر اس نے آہستہ آہستہ اپنا خلائی سوٹ اُتارنا شروع کیا۔ یہ لمحات بڑے جان لیوا تھے۔ ہم سانس روکے اور پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہے تھے۔

سوامی لباس اُتار چکا تھا اور اب ہمیں مُسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ ہلا کر بتایا کہ سب خیریت ہے، ہم لوگ نیچے آسکتے ہیں۔ بے پناہ مسرّت کے باعث ہماری ہلکی سی چیخیں نکل گئیں اور پھر ہم ضروری سامان کے بیگ اپنے کندھوں اور کمر سے باندھنے میں مصروف ہو گئے۔ اختر نے حالانکہ راکٹ میں ہی رہنا پسند کیا تھا لیکن جان نے اس کی ایک نہ

سُنی اور پھر اُس کے عجیب سے ریوالور کو بھی وہیں رکھوا دیا۔ اور اس سے کہا۔

"مسٹر جرمی، جہاں ہم لوگ جا رہے ہیں وہاں آپ ہمارے دُشمن نہیں بلکہ دوست ہیں، نہ تو ہم آپ کو کوئی نقصان پہنچائیں گے اور نہ ہی آپ ایسا کریں گے، اس لیے آپ کا ریوالور اسی جگہ رہے تو بہتر ہے۔"

اختر نے یہ سُن کر بہت بُرا سا مُونہہ بنایا اور پھر اپنا ریوالور وہیں واپس رکھ دیا، کُچھ ہی دیر بعد ہم لوگ سوامی کے پاس کھڑے ہوئے اس عجیب و غریب سیّارے کی زمین کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم اِس سیّارے پر کُچھ دیر کے لیے قیام کریں گے، کیوں کہ اِس سیّارے کی کشش نے ہمارے راکٹ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا، اس

لیے ہم یہاں اُتر گئے تھے۔ ورنہ ہماری منزل یہ سیّارہ تو نہیں تھا! لہٰذا ہمارا ارادہ صرف چند گھنٹے یہاں رُکنے کا تھا اور اس کے بعد ہمیں اپنے راکٹ کو پھر سے داغنا تھا تاکہ وہ زہرہ کی سمت پرواز کرسکے۔ لیکن کیا ایسا ہوا؟ یہ تو آپ آگے پڑھیں گے۔

سیّارے کی کالی زمین کے بارے میں پہلے میرا خیال تھا کہ شاید اس کی سطح بھربھری ہوگی، اسی لیے سوامی کے پیر اس میں دھنستے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ لیکن اب مُجھے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا، یہ زمین اسفنج جیسی تھی۔ پاؤں اس میں کم ازکم چھ انچ اندر ضرور دھنس جاتے تھے۔ میرا اپنا خیال تھا کہ اس زمین پر کوئی بھی جاندار تیزی سے نہیں دوڑ سکتا تھا۔ کیوں کہ اگر وہ دوڑتا تو یقیناً سطح سے دس بارہ فٹ ضرور اوپر اچھلتا! جان نے جب نیچے جھک کر زمین کو چھوا تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا اس نے ہمیں بتایا کہ یہ زمین کسی پگھلے ہوئے ربڑ کے مادے کی ہے!

ہمارے جسم کا رنگ باہر آتے ہی ہلکے سبز رنگ کا ہو گیا تھا، اس کی وجہ وہی تھی جو میں پہلے بیان کر آیا ہوں، یعنی سیّارے کی فضا سبز رنگ کی تھی اور اس کی بیشتر چٹّانوں سے سُرخ رنگ کے ساتھ ہی سبز رنگ کی لپٹیں بھی نکل رہی تھیں۔ ہم لوگ آنے کو تو باہر آ گئے تھے، لیکن اب ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کریں گے کیا؟ جان نے شاید ہمارے دِل میں چھپے ہوئے اس سوال کو جان لیا اور پھر ہم سے بولا۔

"میرے خیال میں اتنے لمبے سفر سے ہم لوگ تھک گئے ہیں۔ سیّارے کی فضا سازگار ہے۔ اس لیے اگر یہاں ایک دِن آرام کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ مُجھے اِس سیّارے کے کا ہی آسمان پر کُچھ پرندے بھی اُڑتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہاں پرندوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق بھی ہو گی۔ اگر ہم اس مخلوق کو ڈھونڈ نکالیں اور اس سے تبادلۂ خیال کریں تو یہ بات سائنس کے حق میں بڑی مفید ثابت ہو گی!"

یہ سُن کر سب خاموش رہے، کوئی نہیں بولا، سوائے زرینہ کے۔ زرینہ خوش ہو کر کہنے لگی۔ "میں آپ کے خیال کی تائید کرتی ہوں۔۔۔ واقعی اب مُجھے تھکن محسوس ہورہی ہے، یہاں آرام کرنا بہتر ہوگا۔"

زرینہ کے بولنے کے بعد باقی سب نے بھی یہی کہا، البتّہ میں اس قیام کا مخالف تھا۔ مُجھے ڈر تھا کہ خدانخواستہ یہاں کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ بہرحال کُچھ بھی ہو، ہمارے لیے وہ ماحول اجنبی تھا۔ میں نے جان سے یہ بات کہی بھی۔ لیکن اس نے فوراً مُجھے تسلّی دے دی اور یہ کہہ کر ڈھارس بندھائی۔

"ایسا کُچھ نہ ہوگا اور پھر ہم آدمی بھی تو کافی ہیں، اختر اور زرینہ کے سوا ہم میں سے ہر ایک کے پاس ریوالور بھی موجود ہے کسی بھی خطرے کے وقت ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ اُس طرف جا رہے تھے ۔ جہاں ہمیں راکٹ میں سے سفید دھبّے نظر آ رہے تھے اور جس مقام کے اوپر ہمیں کُچھ پرندے بھی اُڑتے ہوئے دکھائی دیے تھے ۔ راکٹ کی حفاظت کے لیے ہم نے جیک کو اکیلا وہاں چھوڑ دیا تھا ۔ زرینہ سے بھی بہت کہا گیا کہ وہ وہیں راکٹ میں رہے مگر اس نے یہ بات نہیں مانی تھی ۔ اور سب سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہے گی، خواہ حالات کُچھ بھی ہو جائیں!

آگ کے رنگ کی سُرخ چٹّانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم لوگ آگے بڑھنے لگے، یہ چٹّانیں دہکتے ہوئے کوئلے کے رنگ کی تھیں ۔ مگر حیرت یہ تھی کہ ان میں تپش بالکل نہ تھی، حالانکہ ان میں سے ویسی ہی لپٹیں نکل رہی تھیں جیسی کوئلے میں سے نکلتی ہیں، اس قسم کی چٹّانیں اب ہمیں کافی تعداد میں ملنے لگی تھیں ۔ ہم اپنے پیچھے تقریباً بیس ایسی چٹّانیں چھوڑ آئے تھے ۔ سفید رنگ کی زمین اب ہم سے تقریباً ایک فرلانگ دور

رہ گئی تھی۔ اچانک زرینہ نے گھبرا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اسے زور سے بھینچا، ساتھ ہی اس نے دہشت زدہ لہجے میں مُجھ سے کہا۔ ”فیروز خُدا کے لیے ذرا پیچھے تو دیکھو۔“

میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو خوف کے باعث میرا سانس بھی گھُٹ کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا جن چٹّانوں کو ہم اپنے سے ایک دو فرلانگ پیچھے چھوڑ آئے تھے، وہ اب بھی ہم سے پندرہ گز کے فاصلے پر موجود ہیں۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے یہ بات جان کو بتائی، اس نے بھی پیچھے مُڑ کر دیکھا اور ہماری طرح وہ بھی حیران رہ گیا۔ بارہ چھوٹی بڑی چٹّانیں ہمارے بالکل پیچھے تھیں۔ خُدا معلوم وہ کیا بلائیں تھیں ہم انہیں زندہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے زندہ ہوتیں تو ہمیں ہلتی جلتی دکھائی دیتیں پھر پتہ نہیں یہ کیا آفت تھی۔ راکٹ ہمیں ابھی تک اپنے سے ڈیڑھ فرلانگ پیچھے نظر آ رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ راکٹ کے آس پاس جو سُرخ چٹانیں تھیں وہ اب

وہاں نظر نہ آتی تھیں۔ جہاں تک میں سمجھ پایا تھا وہ سب چٹّانیں مل کر ہمارا تعاقب کر رہی تھیں!

اُف میرے خدا! یہ کتنا بھیانک اور خوفناک مقام تھا۔ دہشت کی ایک تھرتھری ہمارے جسموں میں اچانک پیدا ہو گئی۔ ہم نے جلدی جلدی قدم بڑھانے شروع کر دیئے، ربڑ کی لچکیلی مگر سیاہ زمین نے ہمیں گیند کی طرح اُچھالنا شروع کر دیا۔ جس طرح سرکس کے مسخرے گدّے دار چیزوں پر اُچھلتے ہیں۔ ہماری بھی وہی حالت ہو گئی، جس مقام پر ہمارے پاؤں پڑتے وہاں سے ہم گویا دس فٹ لمبی چھلانگ لگا کر آگے پہنچ جاتے۔ اس طرح ہم جلد ہی اس جگہ پہنچ گئے جو ہمیں سفید دھبّوں کی طرح نظر آتی تھی۔ میں یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گیا کہ یہ سفید دھبّے دراصل ایک ہموار اور سنگِ مرمر جیسی سطح تھی جس کے کُچھ ہی آگے ہمیں بالکل سفید رنگ کی لمبی لمبی شاخیں نظر آ رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ہمارے آگے سفید

باڑھ لگا دی ہو۔

سنگِ مرمر جیسی زمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں یوں لگا جیسے بہت ہی سخت اور وزنی سطح سے ہمارے پاؤں ٹکرائے ہوں۔ ہم نے فوراً پیچھے مُڑ کر ان بلاؤں کو دیکھا جو سُرخ آتشیں چٹّانوں کے روپ میں ہمارا تعاقب کر رہی تھیں اور پھر یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ چٹّانیں اب ہم سے کافی پیچھے رہ گئی ہیں۔

اس بات سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ چٹّانیں خواہ کُچھ بھی ہوں، سنگِ مرمر جیسی اِس صاف اور شفاف سطح پر نہیں آ سکتی تھیں۔۔ لیکن ایسا کیوں تھا؟ افسوس یہ مُجھے اس وقت تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔

سنگِ مرمر کی یہ زمین اتنی عجیب تھی کہ میں بڑی دیر تک اُسے حیرت اور تعجّب سے دیکھتا رہا۔۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ہماری دُنیا کے کسی سنگ تراش نے اُسے آرام سے اور فرصت میں بیٹھ کر بنایا ہو۔ سنگِ مرمر جیسی

ہی اُس میں لکیریں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اور اِن لکیروں میں دھنک کے سے رنگ جھلک رہے تھے۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی راجہ کے عالی شان محل کے فرش پر چل رہے ہوں۔ اب ہم اس مقام کے قریب آ چُکے تھے جہاں ہمیں دور سے سفید رنگ کی باڑھ دکھائی دیتی تھی۔ میں اسے حیرت اور تعجّب سے دیکھتا رہ گیا، کیوں کہ وہ سفید جنگلات نہیں بلکہ نِرالے قسم کے سفید درخت تھے۔ ایسے درخت جن کی شاخیں تو لا تعداد تھیں لیکن جن میں پتّا ایک بھی نہ تھا!

درختوں کی شاخیں ہاتھی کی سونڈ جتنی موٹی تھیں اور اسی لحاظ سے آگے سے جا کر پتلی ہو جاتی تھیں۔ ایک درخت پندرہ بیس شاخوں سے مل کر بنا تھا اور یہ شاخیں گولائی میں مڑی ہوئی تھیں۔

"یہ کس قسم کے درخت ہیں؟" مُجھے اپنے کان میں زرینہ کی سہمی ہوئی آواز سُنائی دی۔

"خُدا ہی بہتر جانتا ہے۔" ظاہر ہے میں اس کے علاوہ اور کیا جواب دے سکتا تھا۔

"فیروز۔۔۔" جان نے آگے بڑھتے بڑھتے اچانک رُک کر کہا۔ "مجُھے آثار کُچھ اچھّے نظر نہیں آتے۔ نہ جانے یہ کیسے درخت ہیں؟ بہرحال ہمیں اس جگہ پہنچنا ضرور ہے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم یہیں سے لوٹ چلیں۔۔۔" والٹر نے ہر سمت نظریں دوڑاتے ہوئے رائے دی۔

"ضرور چلتے اگر وہ آتشیں رنگ کی چٹّانیں ہمارے درمیان حائل نہ ہوتیں۔" جان نے جواب دیا۔

"لیکن وہ تو ہر صورت سے حائل رہیں گی، خواہ ہم ابھی واپس چلیں یا کُچھ عرصے بعد۔"

"مجھے سوچنے دو مسٹر والٹر۔"

جان اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ صورت حال واقعی خطرناک ہے مگر جان اس کا اعتراف کر کے دوسروں کے دِلوں میں خوف پیدا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑے ششش و پنج میں تھا۔ آتشیں چٹّانوں کے بارے میں ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ ہمارا تعاقب کرتی ہیں۔ ویسے کیا واقعی وہ خطرناک چیز ہیں۔ یہ بات ہمیں ابھی تک معلوم نہ ہو سکی تھی۔ اور یہی معاملہ ان سفید درختوں کے ساتھ بھی تھا، ہم ان سے بے حد قریب تھے۔ مگر ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ کیسے درخت ہیں۔ بہت دیر کے سوچ بچار کے بعد جان نے کہا۔

"چلنے کو تو ہم ابھی واپس چل سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کا کیا بھروسہ ہے کہ ہم اس سیّارے کی کشش سے باہر نکل جائیں گے۔۔ ہو سکتا ہے کہ ہم پرواز کریں اور یہ ہمیں پھر اپنی طرف کھینچ لے۔ ہمیں چند دِن بیٹھ کر سوچنا

پڑے گا کہ راکٹوں کے انجنوں میں کیا تبدیلی کی جائے جو وہ طاقت ور ہو جائیں، کیوں والٹر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں یہ طریقہ بہتر ہے۔" والٹر نے جواب دیا۔

"لہٰذا ہمیں یہ وقت ہر طرف گھوم پھر کر بتانا چاہیئے۔ ہم جب واپس راکٹ میں پہنچیں گے تو انجن کی طرف متوجّہ ہوں گے فی الحال تو تحقیق اور تلاش ہمارا مقصد ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمیں کوئی خاص چیز مل جائے۔"

جان کی بات درست تھی یا غَلط۔۔۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا!

سنگِ مرمر جیسی شفّاف زمین پر سفید درخت بڑے عجیب لگ رہے تھے ان کی لمبی اور جلیبی کے انداز میں مُڑی ہوئی شاخیں سبز کاہی آسمان تک پہنچ رہی تھیں، زمین پر کوئی گھاس یا جھاڑی نہیں تھی۔ درختوں کے بائیں

طرف جو میدان تھا اس میں اُوودے رنگ کی اونچی اونچی چٹّانیں اور درّے تھے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ عجیب اور حیرت انگیز جگہ تھی، یوں لگتا تھا جیسے ہماری زمین کے کسی معمار نے ناپ تول کر ہر چیز بنائی ہے۔ پہلے کالی زمین تھی جس میں سُرخ چٹّانیں تھیں، یہ زمین اچانک ختم ہو گئی تھی اور سنگِ مرمر جیسی زمین شروع ہوئی تھی جس پر سفید رنگ درخت تھے۔ یہ زمین بھی اچانک بائیں طرف ختم ہو جاتی تھی اور میدان شروع ہو جاتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے آگے میلوں دور تک سفید زمین تھی، ہمارے پیچھے کالی زمین اور ہمارے بائیں طرف میدان میں اودی چٹانیں تھیں۔ جو پرندے ہم نے دور سے کاہی آسمان میں اُڑتے ہوئے دیکھے تھے وہ اب کہیں نظر نہ آتے تھے۔

یہ سوچ کر میدان میں ہم نسبتاً ہر خطرے سے محفوظ رہیں گے۔ ہم بائیں سمت مُڑ گئے، اس طرح دور تک ہمیں صاف اور چٹیل زمین نظر آتی

تھی۔ اونچی اونچی اوودے رنگ کی چٹّانیں کافی تعداد میں تھیں۔ البتّہ درخت یا پتّے جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ چٹّانوں کے قریب سے گزرتے وقت ہم نے احتیاطاً انہیں غور سے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ وہ چٹّانیں اپنے مقام پر موجود تھیں، یعنی ہمارا تعاقب نہیں کررہی تھیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں اطمینان ہوا اور ہم ایک درّے کی طرف بڑھنے لگے جس کے دائیں اور بائیں طرف دو اونچی چٹّانیں تھیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید اِن چٹّانوں کے باہر کچُھ اور نظر آئے، کیوں کہ یہ چٹّانیں ایک پردے کی طرح ہماری راہ میں حائل تھیں۔

جیسے ہی ہم درّے کے درمیان پُہنچے ایک عجیب بات ہوئی، شاید میں اپنے الفاظ سے وہ آواز بیان کرنے سے قاصر رہوں گا، یوں سمجھیے کہ صورِ اسرافیل جیسی خوفناک اور دہشت انگیز وہ آواز تھی جو اچانک ہمیں سُنائی دینے لگی۔ یہ آواز اتنی تیز اور اونچی تھی کہ ہم اپنے جسم سے اسے ٹکراتا

ہوا محسوس کر رہے تھے۔۔۔ بھیانک اور دِل کو ہلا دینے والی یہ آواز نہ جانے کہاں سے آ رہی تھی، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جیسے ہی میں نے زرینہ اور اختر کو ساتھ لے کر آگے بھاگنے کی کوشش کی، مُجھے یوں لگا گویا وہ سائرن جیسی لرزتی ہوئی آواز مُجھے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔

ہم گردنیں اُٹھائے خوف زدہ نظروں سے اوپر دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ چیخ یا سیٹی جیسی آواز چٹّانوں کے اوپر سے ہی آئی تھی۔ ہمارے اوپر دیکھتے ہی کوئی چیز میرے اوپر دھب سے گری، میرے ہوش اُڑ گئے جب میں نے یہ محسوس کیا کہ دراصل وہ کوئی رقیق مادہ تھا۔ اپنے پورے جسم پر مُجھے گیلا گیلا سا گوند بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ شاید یہ مُصیبت صرف میرے اوپر ہی نازل ہوئی ہے لیکن جب میں نے ہر ایک کو اس چیز کو اپنے جسم سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ ہم سب اچانک کسی حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ گوند جیسی چیز

سخت بد بُودار تھی۔ اس کی دم گھونٹ دینے والی بُو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی لیکن جتنا ہم اس گوند کو ہٹانے کی کوشش کرتے وہ اتنا ہی چپکتا جاتا۔

سائرن جیسی آواز ابھی تک برابر آ رہی تھی۔ اچانک چٹانوں کے اوپر سے کوئی چیز دھب سے کودی۔۔۔ اُف خُدا، میں کس طرح الفاظ میں اس وقت کی حالت بیان کروں میرا قلم لرز رہا ہے۔۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ قلم تو ابھی کئی مقامات پر تھرتھرائے گا اس لیے دِل کو قابو میں رکھ کے بیان کر ہی دیتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی!

وہ دراصل ایک بہت بڑی مکڑی تھی، تقریباً دس فٹ لمبی مکڑی۔ اس کی آٹھ ٹانگیں کسی پہلوان کی رانوں جیسی موٹی تھیں۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس مکڑی کا سر بالکل انسانوں جیسا تھا سب کُچھ وہی! بس فرق اتنا تھا کہ مُونہہ کی جگہ اس کے سر میں طوطے جیسی چونچ تھی۔ چونچ

کے اوپر دو آنکھیں تھیں جو ہمیں گھور رہی تھیں۔ (اس لحاظ سے میں اس عجیب اور خوفناک چیز کو "مکڑّ آدمی" ہی لکھوں گا)۔ اس کے جسم پر رواں تھا اور یہ رواں گھوڑے کے بالوں جتنا موٹا تھا، مکڑّ آدمی کی چونچ بار بار کھُل اور بند ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ تعداد میں وہ کل چھ تھے ان کے چونچ نما مُونہہ سے ہی وہ بدبودار لعاب نکل رہا تھا۔ جو ہمارے جسموں تک ایک لکیر کی صورت میں پہنچ رہا تھا۔

میں تب سمجھا کہ دراصل وہ اِن کا جالا تھا۔ اور انہوں نے اوپر سے اپنا یہ جالا ہمارے اوپر ہمیں جکڑنے کے لیے پھینکا تھا۔ اس خیال کی تصدیق پھر فوراً ہی ہو گئی کیوں کہ مکڑّ آدمیوں نے جلدی جلدی ہمارے چاروں طرف گھوم کر چونچ سے نکلتے ہوئے لعاب کے اس جالے کو ہمارے اوپر تاننا شروع کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ننّھی سی مکڑی اپنے کسی شکار کو

جالے میں جکڑ کر جلدی سے اس کے گرد جالا تاننے لگتی ہے۔ یہ جالا بھی عجیب تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہمیں ربڑ کے رسّے سے باندھ دیا گیا ہو۔ زرینہ بے چاری خوف کے باعث بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور ہم میں سے کسی کو بھی اتنا موقع ہی نہ مل سکا تھا کہ اپنے ریوالور نکال کر ان سے کُچھ کام لے سکتے۔

مکڑ آدمیوں نے باری باری ہمیں اپنی کمر پر لادا اور پھر قافلے کی صورت میں میدان میں آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید انھوں نے ہمیں اپنے جسم سے بھی اچھّی طرح جکڑ لیا تھا یہی وجہ تھی کہ ہم ان کی کمر پر چِت لیٹے ہوئے تھے اور ذرا بھی نہ ہلتے تھے۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے ہمارے بولنے کی قوّت سلب ہو گئی تھی۔ اب جو ذرا ہوش آیا تو جان نے کہا۔ "قسمت پر شاکر رہو فیروز۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جب بھی موقع ملے گا ہم اپنے ہتھیاروں سے کام لیں گے۔"

"اگر تُم لوگوں کو اس کا موقع ملا۔" ایک خاموش آواز ہم سب کو سُنائی دی۔ حالانکہ مکڑآدمیوں میں سے کوئی نہیں بولا تھا۔ لیکن ہمارے ذہن کو یہی جواب سُنائی دیا تھا۔ شاید یہ کوئی خاص قوّت یا ٹیلی پیتھی تھی جس کے باعث ہم نے مکڑآدمیوں کے خیالات پڑھ لیے تھے۔

ہم چوکنّے ہو گئے اور ہم نے دِل ہی دِل میں فیصلہ کرلیا کہ کم از کم جب تک ہم مکڑآدمیوں کی کمر پر لدے ہوئے یہ سفر کر رہے ہیں ہر گز کُچھ نہ بولیں گے۔

"تیار ہو جاؤ۔۔۔" ہمیں اپنے ذہن میں وہ آواز پھر سُنائی دی، مکڑآدمی کہہ رہا تھا۔ "تم لوگ ہمارے آقا کے سامنے پہنچنے والے ہو۔ خبردار لڑنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ انجام بہت بُرا ہو گا۔"

بڑا بھیانک ماحول تھا، مکڑآدمیوں کی کمر پر لدے ہوئے ہم بڑی تیزی سے

کسی خاص سمت میں جا رہے تھے۔ ہم اپنا جسم تو ہلا ہی نہیں سکتے تھے۔
ہمارے اوپر سبز کاہی آسمان تھا اور دائیں بائیں اودی چٹانیں۔ مکڑ
آدمیوں کا سخت رواں میری پیٹھ میں سوئیوں کی طرح چُبھ رہا تھا۔ لیکن میں
اِس بُری طرح جکڑا ہوا تھا کہ پہلو بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ زرینہ ابھی تک
بے ہوش تھی اور اختر ہمیشہ کی طرح حالات سے بے پروا، آسمان میں
لگاتار گھورے جا رہا تھا۔

اچانک تین بڑے بڑے چاند ہمارے پیروں کی سمت سے آسمان میں
نمودار ہوئے اور ہمارے اوپر سے گزرتے ہوئے سر کی طرف چلے گئے۔
یہ تین چاند مٹکے سے بھی زیادہ بڑے تھے اور اِن کی روشنی نارنجی تھی، میں
ان کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا اور
وہی آواز مُجھے ذہن سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"یہ ہماری دُنیا کے چاند ہیں، تین تین کی ٹکڑی میں بٹے ہوئے یہ کل بارہ

چاند ہیں۔ اور یہ ہماری دُنیا کے لگاتار چکر لگاتے رہتے ہیں۔"

ہم چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ جو سوال میرے دِل میں پیدا ہوا تھا تقریباً وہی سوال دوسروں نے بھی سوچا تھا اور مکڑ آدمیوں نے ہمیں اس سوال کا جواب دے دیا تھا۔ والٹر اسمتھ اور جان اپنی گردنیں بار بار اٹھا کر اوپر دیکھ رہے تھے۔ کہ شاید وہ چاند پھر نظر آئیں مگر ایسا نہ ہوا۔ کیوں کہ مکڑ آدمیوں کے کہنے کے مطابق صرف ایک ہی ٹکڑی ہمارے سروں پر سے گزری تھی۔ تین چاندوں والی دوسری ٹکڑی خُدا جانے کب آتی۔۔۔؟ بہرحال ہم اس سلسلے میں اپنے دماغوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ہم خاموش ہی رہے۔ کوئی کسی سے کُچھ نہیں بولا۔

"ہوشیار!" مکڑ آدمی کی آواز ہمارے ذہنوں سے پھر ٹکرائی۔ "تم عظیم کراما کے سامنے پہنچنے ہی والے ہو، اس کا مقدّس اور پاک گھر ایک بہت بڑی

چٹّان کے غار میں ہے۔ ہم تمھیں پھر آگاہ کرتے ہیں کہ کسی بھی چالاکی اور شرارت کی کوشش نہ کرنا۔۔۔ ورنہ تم اپنے انجام پر بری طرح پچھتاؤ گے۔"

میں بے بسی کے عالم میں دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا، جس مکڑّ آدمی کی کمر پر سوامی بندھا ہوا تھا وہ مُجھ سے کافی قریب تھا۔ اس لیے میں سوامی سے باتیں کر سکتا تھا مگر مُشکل یہ تھی کہ مکڑّ آدمیوں کی یہ قوم دِل کی بات بھی سمجھ لیتی تھی اور خیالات کے پڑھنے میں بھی ماہر تھی۔ اس لیے سوامی سے کوئی بات کرنی یا پھر اپنے بچاؤ کی ذراسی بھی کوشش کرنا بے کار تھا۔

جلد ہی ہم ایک غار میں داخل ہونے لگے۔ اس غار کی چھت پر لاتعداد روشنیاں چمک رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا گویا ہزاروں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں یا پھر کروڑوں کی تعداد میں جگنو چمک رہے ہوں۔ ان غاروں کی بناوٹ

بھی عجیب تھی، چوکور پتھرّوں سے دیواروں کی چنائی کی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور اِن پتھرّوں سے وہی لیس دار اور رقیق مادہ لپٹا ہوا تھا۔ اندر بہت اندھیرا تھا، جگنوؤں کی سی چمک محض چمک ہی تھی روشنی نہیں۔ اس لیے اندھیرا بدستور تھا۔ مکڑّ آدمی ہمیں لیے ہوئے کُچھ اُونچے نیچے پتھرّوں اور ڈھلانوں کو عبُور کرتے ہوئے جلد ہی ایک ہموار اور صاف شفّاف مقام پر پہنچ گئے۔ اور پھر یہاں پہنچ کر شاید انہوں نے ہمیں حُکم دیا کہ ہم ان کی کمروں سے اتر جائیں۔ ہمیں یہ محسوس کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ ربڑ کے رسے جیسے جن جالوں نے ہمیں جکڑ رکھا تھا وہ یک بیک ڈھیلے ہو گئے اور ہم نہایت آسانی سے غار کی زمین پر کود گئے اور پھر کودتے ہی میں نے جلدی سے ہر سمت دیکھنا شروع کر دیا۔

میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا؟ میں نے دیکھا کہ یہ ایک بہت اونچا اور بہت بڑا ہال ہے اور اس ہال کے بیچوں بیچ ایک بہت اونچا اور لمبا

درخت ہے۔ اس درخت کے پتّے تقریباً چالیس فٹ لمبے تھے اور پورے درخت میں مُشکل سے صرف پچاس ساٹھ پتے تھے۔ یہ درخت ہماری دُنیا کے حساب سے اندازاً ایک فرلانگ کے رقبے میں ضرور تھا اوراس کے سب سے اوپر والے پتّے کے درمیان میں سفید رنگ کا ایک مکّڑ آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مخروطی سر کے بال ایک مربّع نما تاج سے ڈھکے ہوئے تھے اس تاج کے بیچ میں ایک سنہری گولا لگاتار چکّر لگا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گولے میں سے ایک بہت ہی مدھم مگر سنہری شعاع بھی نکل رہی تھی۔ یہ مکّڑ آدمی پتّے پر بڑے آرام سے اپنی آٹھ ٹانگوں کی مدد سے چل رہا تھا۔ ہمارے ذہنوں کو ایک خاموش حُکم ملا کہ ہم سب ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ ہم نے اس حُکم کی فوراً تعمیل کی، سفید مکّڑ آدمی کی بھیانک آنکھیں ہمیں غور سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑی آہستگی سے وہ پتّے کے کنارے پر آیا اور پھر اپنی چونچ سے نکلتے ہوئے

لعاب دار تار کی مدد سے نیچے اترنے لگا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی مکڑی اپنے جالے کے ایک تار سے لٹک کراوپر سے نیچے آتی ہے۔

درخت کے سب سے نچلے پتّے پر آکر وہ ٹِک گیا اور پھر ہمیں گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے زرینہ کو سہارا دے رکھا تھا کیوں کہ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اگر میں اسے نیچے پڑا رہنے دیتا تو یقیناً یہ ہیبت ناک قوم اسے مُردہ سمجھ لیتی اور پھر خُدا جانے اس کا کیا حشر کرتی، جس وقت میں اُس بھیانک سواری پر سے اتر رہا تھا اسی وقت میں نے بے ہوش زرینہ کا ہاتھ تھام لیا، یہی وجہ تھی کہ زرینہ اس وقت آنکھیں بند کیے اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ مکڑّآدمی میرے خیالات سن لیں گے، جان سے دریافت کیا۔

"یہ خوفناک قوم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟"

"ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں فیروز۔" جان نے بے بسی سے کندھے

جھٹکے۔ "ہمیں اِن کا کہنا مانتے رہنا چاہیئے، ممکن ہے کہ بعد میں کوئی طریقہ ان سے چھٹکارا پانے کا مل جائے۔"

"مگر زرینہ کا کیا کروں؟ یہ تو بالکل بے ہوش ہے۔"

"تمہاری اوپر کی جیب میں جو فوری امداد والا پیکٹ ہے اسے جلدی سے کھول کر گلابی رنگ کی گولی نکالو اور زرینہ کے مُونہہ میں زبردستی ڈال دو۔ وہ بے ہوشی دور کرنے والی دوا ہے۔"

میں نے جب فوراً جان کے کہنے پر عمل کیا تو زرینہ کو ہوش آگیا۔ اس نے یہ بھیانک اور ڈراؤنا ماحول دیکھ کر چیخنا چاہا مگر میں نے اسے تنبیہ کی کہ وہ خاموش رہے اور اپنے حواس کو قابو میں رکھے۔ زرینہ میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ بعض حالات میں خود پر فوراً قابو پا لیتی تھی۔ اس نے اپنی چیخ کو روک لیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے بتّے پر پھرتے ہوئے مکڑ آدمی کو دیکھنے لگی، میں دِل میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے اس وقت کے خیالات اور باتیں

ان جانور نما انسانوں نے کیوں نہیں سنیں؟ ہم نے جو باتیں کی تھیں انہیں سُن کر مکّڑ آدمی کو ہمیں فوراً روک دینا چاہیئے تھا۔ اس وقت تو یہ بات میری سمجھ میں آئی نہیں ہاں البتّہ بعد میں اس حقیقت کا انکشاف ضرور ہو گیا کہ وہ قوم صرف دس پندرہ فٹ کی دوری ہی سے ہمارے خیالات پڑھ سکتی تھی اس سے زیادہ فاصلے سے نہیں۔

"جھُک جاؤ۔۔۔ عظیم کراما کے آگے جھک جاؤ۔۔۔" ہمیں آواز سُنائی دی مگر ہم نے اس حُکم کی تعمیل نہیں کی۔

"سُنا نہیں تم نے۔ عظیم کراما کے سامنے جھُک جاؤ۔۔۔"

"افسوس ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکیں گے۔۔۔" میں نے بُلند آواز میں جواب دیا۔ "ہم سوائے خُدا کے اور کسی کے سامنے نہیں جھُکا کرتے۔"

"خُدا کون ہے؟" قہر آلود لہجہ میں کسی نے پوچھا۔

”ہمارا تمہارا اور پوری کائنات کا مالک۔۔۔ وہی ہمارا آقا ہے اور ہم اسی کے آگے جھکے ہیں۔“

”تمہیں اس حُکم عدولی کی جرأت کیسے ہوئی؟“ ایک لرزتی ہوئی آواز جو سیٹی سے مشابہ تھی، سُنائی دی۔ یقیناً یہ آواز کراما کی تھی۔ اس کی خوفناک آنکھیں مُجھے گھور رہی تھیں۔ ”تم نہیں جانتے کہ ہم تمہارا کیا حشر کر سکتے ہیں۔ خیر پتہ لگ جائے گا جب تمہاری پیشانی پر کتاک باندھا جائے گا اور تمہیں شیفاؤں کی خوراک بننے کے لیے میدان میں چھوڑ دیا جائے گا۔ تب تمہیں اس وقت کی حُکم عدولی یاد آئے گی۔“

ہم چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، خُدا جانے یہ کتاک اور شیفا کیا بلائیں تھیں؟ بہر حال کُچھ بھی ہو ہم سمجھ چکے تھے کہ ہم نے کراما کے آگے نہ جھُک کر ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دِل میں ایک خیال گھر کرتا جا رہا تھا کہ یہ حُکم عدولی ہم نے صرف اس لیے کی

ہے کہ ہم لوگ خُدا پرست تھے ہم نے خُدا کی خُوشی کی خاطر یہ خطرہ منظور کیا تھا، اب کیا خُدا ہمیں ان بلاؤں سے نجات نہ دلائے گا؟ اور جیسا کہ آپ آگے پڑھیں گے اس سوال کا جواب ہمیں جلد ہی مل گیا۔

کراما بتےّ پر ہی بیٹھا رہا اور اُس کے ساتھی یا مصاحب جو کُچھ آپ سمجھیں، نیچے کھڑے رہے۔ یہ ایک بھیانک عذاب تھا جو ان بلاؤں کی صورت میں ہم پر مسلّط تھا۔ جس غار میں ہم کھڑے ہوئے تھے وہ اتنا بڑا تھا کہ اس کا دوسرا حصّہ ہمیں بالکل نظر نہ آتا تھا۔ اس لیے ہمیں وہ مکڑّ آدمی نظر نہ آ سکے جو آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے کسی نامعلوم سمت سے غار میں جمع ہو رہے تھے۔ جلد ہی وہ کئی سو کی تعداد میں نظر آنے لگے۔ ان کی کمان دراصل ایک پیلے رنگ کا مکڑّ آدمی کر رہا تھا۔ اب میں سمجھا کہ دراصل وہ ان کی فوج تھی۔ اس فوج کے سب سے آگے جو مکڑّ آدمی تھے ان کی چونچوں میں چند سفید سی پٹیاں لٹک رہی تھیں۔ بڑے ادب کے ساتھ وہ

کراما کے سامنے آ کر جھک گئے اور پھر ان میں سے ایک چند فٹ آگے بڑھ کر بولا۔

"عظیم کراما ہمیشہ حکومت کرتا رہے۔۔۔ میں قیدیوں کو گرفتار کرنے حاضر ہو گیا ہوں۔"

کراما یہ سن کر مسکرایا، شاید وہ اس کی مسکراہٹ ہی تھی جو اس کی چونچ کُچھ دیر تک کھل کر پھر بند ہو گئی تھی۔ ادھر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب یہ جانور نما انسان بالکل صاف کیوں بول رہا ہے؟ پہلے ان کی آوازیں ہمارے ذہنوں سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں لیکن اب ہم صاف سُن سکتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جو کُچھ وہ بول رہے تھے اُردُو میں بول رہے تھے اور یہی بات مُجھے حیرت زدہ کر دینے کے لیے کافی تھی مُجھے حیران دیکھ کر شاید وہ میرے دِل کی بات سمجھ گیا۔

"میں سمجھ گیا کیا سوچ رہے ہو۔" کراما نے مُجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ دراصل ہماری سائنس ہے کہ ہم بول تو اپنی زبان میں رہے ہیں لیکن تم اسے اپنی زبان میں سُن رہے ہو۔ یہ ہماری بڑائی کا ایک معمولی ثبوت ہے کہ ہم کراماتی زبان بولتے ہیں اور تم تک پہنچتے ہی کراماتی زبان اُردُو میں تبدیل ہو جاتی ہے۔۔ کہو اب میری طاقت کا لوہا مانتے ہو اور میرے آگے جھکتے ہو؟"

میں خاموش رہا اور کنکھیوں سے جان کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے، مُجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے مُجھ سے آہستہ سے کہا۔

"نااُمّید نہ ہو۔۔۔ ہمیں وقت کی ضرورت ہے، ہو سکتا ہے کہ کُچھ وقت ملنے پر رہائی کا کوئی طریقہ ہمیں سوجھ جائے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ہم آسانی سے ان کے قیدی بن جائیں؟" والٹر اسمتھ نے پوچھا۔

"یقیناً!"

میرا خیال درست ہی تھا کیوں کہ دور ہونے کے باعث ہماری یہ گفتگو اور ہمارے خیالات مکڑّ آدمیوں پر ظاہر نہ ہو سکے اور وہ اسی طرح اپنی بلّی جیسی آنکھوں سے ہمیں گھورتے رہے۔ ہمیں خاموش دیکھ کر کراما نے وہی سیٹی جیسی آواز نکالی اور اپنی فوج کے سپہ سالار کو حُکم دیا کہ وہ ہمیں گرفتار کر لے۔ پیلے رنگ والا مکڑّ آدمی ہماری طرف جیسے ہی بڑھا، میں نے فوراً جان سے کہا۔

"کیا ہمیں اپنے ریوالوروں سے کام لینا چاہیئے؟"

"کوشش کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟" والٹر اسمتھ نے جلدی سے جواب دیا۔

"ہاں ایک بار ہوائی فائرنگ کر کے دیکھ لو۔۔۔" جان نے کُچھ سوچتے

ہوئے کہا۔

ہم نے یہ سُنتے ہی اپنے اپنے ریوالور نکال لیے اور پھر مکّڑ آدمیوں کی طرف تان لیے۔ ہمیں ایسا کرتے دیکھ کر کراما بڑے زور سے ہنسا، اس کی چونچ کھل گئی اور تیز سیٹی جیسی ہنسی ہمیں سُنائی دینے لگی۔

"تمہارے یہ کھلونے ہمارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" اس نے غُصّیلی آواز میں کہا۔ "اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہم میں سے چند ضرور مر جائیں گے مگر ہماری تعداد بہت زیادہ ہے۔ تم بچ کر ہرگز نہیں جا سکتے۔"

"اس کے علاوہ۔۔۔" پیلے رنگ والے مکّڑ نے اتنا کہہ کر اپنی دونوں اگلی ٹانگیں تالی بجانے کے انداز میں پیٹیں۔ "تم لوگ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے، کیوں کہ تمہارا ایک ساتھی ہمارے قبضے میں ہے۔"

تالی کی آواز سُنتے ہی چند مکّڑ آدمی کسی کونے میں سے ایک آدمی کو دھکے

دیتے ہوئے ہمارے سامنے لائے۔ ہلکی سی ملگجی روشنی میں جب اسے ہم نے دیکھا تو بھونچکے رہ گئے اور پھر نااُمیّدی کے باعث ہمارے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ریوالور خود بخود نیچے جھک گئے کیوں کہ یہ آنے والا شخص جیک تھا۔

کسی نہ کسی طرح مکڑّ آدمیوں نے اس پر قابو پا لیا تھا اور اسے گرفتار کر کے ہمارے سامنے لے آئے تھے۔ ایک بات بہت زیادہ تعجّب خیز تھی اور وہ یہ کہ جیک نے ہمیں دیکھ کر بھی خُوشی یا جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی پیشانی پر ایک سفید پٹّی بندھی ہوئی تھی اور اس پٹّی کے بالکل بیچ میں ویسا ہی سنہرا گولا لگا ہوا تھا جیسا کہ کراما کے تاج میں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس گولے میں سے کوئی شعاع نہیں نکل رہی تھی اور نہ ہی وہ چکّر لگا رہا تھا۔ مُجھے یہ سفید پٹّی دیکھتے ہی احساس ہوا کہ مکڑّ آدمیوں کی فوج جب اندر داخل ہوئی تھی تو ان میں سے کُچھ کی چونچوں میں ایسی ہی سفید

پٹّیاں لٹک رہی تھیں۔ تو کیا ہمیں گرفتار کرنے کے لیے محض یہ سفید پٹّیاں ہی کافی ہوں گی!

جیک کو اس بھیانک قوم کے پھندے میں پھنسا ہوا دیکھ کر ہم خاموش ہو گئے اور ہم نے جان کے کہنے پر اپنے ریوالور جیبوں میں واپس رکھ لیے پیلے رنگ والا مکڑّ آدمی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہماری طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس نے جیک سے نہ جانے کیا کہا کہ وہ مکڑّ آدمیوں سے سفید پٹّیاں لے کر ہماری طرف بڑھا اور پھر اس نے باری باری وہ سفید پٹّی ہم میں سے ہر ایک کی پیشانی پر باندھ دی۔ دوسروں کے بارے میں تو میں کُچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جیسے ہی وہ پٹّی میری پیشانی پر بندھی مُجھے یوں محسوس ہوا گویا اندھیرے کی دلدل میں دھنسا جا رہا ہوں۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ اندھیرا۔۔ اور پھر اچانک چمکیلی سی تیز روشنی۔۔۔ مُجھے یوں لگا جیسے میں اس روشنی سے گہری محبّت کرتا ہوں۔ روشنی کے اندر مُجھے کراما نظر آیا اور میرا دِل

بے اختیار اس کی طرف کھنچنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر جاؤں اور اس کا جو بھی حُکم ہو فوراً بجالاؤں۔

کراما مُجھے اپنا آقا اور مالک نظر آتا تھا۔ میرا دِل کہتا تھا کہ کراما ہی سب کُچھ ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور سب اس کے حُکم کے بندے ہیں۔ کراما جیسا خونخوار اور خوفناک جاندار اب مُجھے اپنی ہر شے سے بھی عزیز محسوس ہوتا تھا۔ زرینہ حالانکہ میرے قریب کھڑی ہوئی تھی مگر اب مُجھے اس کی ذراسی بھی پرواہ نہیں تھی۔ اسی کی کیا کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی جیسا کہ مُجھے بعد میں معلوم ہوا۔ ہم سب کراما کے خادم بن چکے تھے اور اس کے ذرا سے اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے بالکل تیّار تھے۔

میرا دماغ اپنے آس پاس کی چیزوں کو پہچان سکتا تھا۔ البتّہ میرا مشن کیا تھا، میں آئندہ کیا کرنے والا تھا۔ میرے دُشمن کون تھے؟ یہ سب باتیں میرے ذہن سے مٹ گئی تھیں۔ میرے ساتھیوں کی بھی وہی حالت تھی

جو میری تھی، میں ان کے لیے اجنبی تھا اور وہ میرے لیے غیر۔۔ ہمارے دماغوں پر خونخوار کراما کی حکومت تھی اور ہم بے بس ولاچار اس کا ہر معمولی سے معمولی حُکم پورا کرنے کے لیے مجبور تھے۔

"دیکھی تُم نے میرے کتاک کی کرامت۔" کراما سیٹی والی آواز میں ہنسا۔ اس کے تاج کے سنہرے گولے میں سے ہلکی سنہری شعاع نکل کر میرے کتاک کے سنہری گولے پر پڑ رہی تھی۔ اور جیسا کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ کتاک اسی سفید پٹّی کو کہا گیا تھا جو میرے اور میرے ساتھیوں کی پیشانی پر باندھی گئی تھی۔

"تم لوگ اب میرے غلام ہو۔۔۔" کراما نے کہا۔ "تم میرے لیے زمین کھود کر کاگی نکالو گے۔ تمہاری مدد کُچھ اور قیدی بھی کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی تم شیفاؤں کو تباہ کرنے کا طریقہ بھی سوچو گے۔ شیفا ہمارے دُشمن ہیں۔ تمھیں بتا دیا جائے گا کہ تم ان سے کس طرح لڑو گے۔۔۔ اب

تم جاؤاور جاکر ہماری قوم کے لیے کاگی کھودو۔“

سیٹی نما ہنسی پھر سُنائی دی اور ہم لوگ بڑے ادب کے ساتھ کراما کے سامنے جھُک گئے میرا دِل چاہتا تھا کہ میرے پَر لگ جائیں، میں اُڑ جاؤں اور کسی بھی طرح کراما کے لیے کاگی نکال لاؤں۔۔ مگر یہ کاگی کیا چیز تھی؟ افسوس یہ اس وقت تک مُجھے معلوم نہ تھا۔

بھیڑ بکریوں کی طرح سے ہانکنے کے بعد مکڑّ آدمیوں کی فوج ہمیں اس غار سے باہر لے آئی۔ (میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ ہم لوگ کتنی دور چلے ہوں گے۔ کیوں کہ اتنی بہت سی باتیں بھی میں نے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر لکھی ہیں۔ بہت سی باتیں تو مُجھے بھی یاد نہیں رہیں۔ میرا دماغ میرا اپنا کہاں تھا جو مُجھے کُچھ یاد رہتا) نہ جانے ہم لوگ کتنی دور چلے۔۔۔ فاصلہ بے شک لمبا تھا مگر تھکن ہمیں بالکل بھی محسوس نہیں ہوئی۔ ہم بڑے آرام سے اس خوفناک قوم کے ساتھ کسی نا معلوم سمت کی طرف

لگا تار چلتے رہے۔

کافی دور چلنے کے بعد مُجھے اوودے رنگ کی کُچھ پہاڑیاں دکھائی دیں۔ ان پہاڑیوں میں سے نیلے رنگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں مکّڑ آدمیوں نے پہاڑیوں کے قریب پہنچ کر ہمیں حُکم دیا کہ ہم نیچے کھڈ میں دیکھیں۔۔۔ ان کا حُکم مانتے ہوئے جب نے نیچے کھڈ میں دیکھا تو کوئی خاص بات مُجھے اس کے سوا محسوس نہیں ہوئی کہ کئی سو فٹ گہرے کھڈوں میں ہمارے جیسے کُچھ انسان ہاتھوں میں عجیب قسم کی درانتی نما ہتھوڑے لیے ہوئے چٹّانوں میں سے کوئی چیز توڑ رہے ہیں، ان سب کی پیشانیوں پر بھی کتاک بندھا ہوا تھا۔ ہمیں اتنی بُلندی پر کھڑے دیکھ کر نہ تو انہوں نے کسی جوش کا اظہار کیا اور نہ ہم نے، ہمیں جب یہ حُکم ملا کہ ہم بھی خاموشی سے نیچے جا کر ان لوگوں میں شامل ہو جائیں تو پھر ہم آہستہ آہستہ اس ٹیڑھی میڑھی اور پتھریلی پگڈنڈی کی طرف بڑھے، جو بل کھاتی ہوئی نیچے کھڈ میں جا رہی تھی۔

زرینہ مُجھ سے آگے تھی مگر اس وقت نہ تو میں اسے پہچانتا تھا اور نہ وہ مُجھے جانتی تھی۔ گو بعد میں مُجھے یہ علم ضرور ہوا تھا کہ اس پگڈنڈی پر سے اُترتے وقت زرینہ کے پیر زخمی ہو گئے تھے۔ مگر اس وقت مُجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میں تو بس کراما کے حُکم کا غلام تھا اور ایک معمول کی طرح اس کا ہر کہنا مان رہا تھا۔ ہمارے محافظ مکڑّ آدمیوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ ہم پگڈنڈی پر چل پڑے تو وہ اپنی آٹھ ٹانگوں پر چلتے ہوئے واپس کراما کے غار کی طرف چلے گئے۔

ہم بالکل مسمریزم کے معمول کی طرح سیدھا مُونہہ اٹھائے ہوئے اُونچے نیچے پاؤں رکھتے، گھاٹی میں اتر رہے تھے۔ میرے دماغ میں صرف ایک ہی حُکم تھا اور بار بار کوئی مُجھ سے کہہ رہا تھا۔

"جاؤ۔۔۔ نیچے جا کر کاگی کھودنا شروع کر دو۔۔۔ جلدی جلدی!"

میں اِس حُکم کو پورا کرنے کی خاطر بڑی تیزی سے نیچے اُترا جا رہا تھا۔ میں

چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرلوں اور پھر اس کے سامنے سرخرو پہونچوں اور کہوں کہ اے میرے آقا، میرے مالک۔۔ دیکھ میں نے تیرا حُکم پورا کردیا ہے۔ لیکن جلدی کا کام ہمیشہ شیطان کا کام مانا گیا ہے۔۔۔۔ میں نے بغیر نیچے دیکھے جب ایک بار اپنا دم بڑھایا، راستے کی ایک چھوٹی سی چٹّان اپنی جگہ سے لڑھک گئی، میرا توازن برقرار نہ رہا اور میں اچانک پھسل گیا۔

میں کافی بُلندی سے نیچے گرا تھا، مگر جس جگہ گِرا تھا وہ زمین نسبتاً نرم تھی اور وہاں ریت جیسی کسی چیز کے ٹیلے تھے، لہٰذا مُجھے چوٹ تو بالکل نہیں آئی۔ البتّہ یہ دیکھ کر میں حیرت زدہ ضرور ہوا کہ اوپر سے آنے والے میری پارٹی کے لوگوں نے نہ تو مُجھے دیکھنے کی کوشش کی اور نہ ہی وہ میری مدد کو آئے۔۔ اچانک مُجھے احساس ہوا کہ وہ تو سب معمولی ہیں۔ ان کے دماغ کراما نے خالی کردیے ہیں اور وہ اب اس کے حُکم کے غلام بن

چکے ہیں۔

اختر اور زرینہ کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ زرینہ نے ایک بار جب اپنا قدم بڑھایا تو میں نے دیکھا کہ اس کے پیروں میں سے خون نکل رہا ہے، کمزوری اور خوف کے باعث اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا ہے اور تقریباً یہی حالت اختر کی بھی ہے۔ غُصّے کے باعث میری مُٹھّیاں بھینچ گئیں، مُونہہ سے کف جاری ہو گئے اور میرا دِل چاہنے لگا کہ ابھی دوڑتا ہوا جاؤں اور خونخوار و ظالم کراما کے ٹکڑے کر ڈالوں۔۔ مگر پھر فوراً ہی میرا دِل لرز کر رہ گیا، میں یہ کیا سوچ رہا ہوں؟ جو کراما کا غلام ہوں، اس کے قتل کے بارے میں کس طرح سوچ سکتا ہوں۔۔؟ کیا میرا دماغ اب میرا اپنا ہے یا پھر میرے اپنے دماغ پر سے کراما نے اپنا دباؤ ہٹا لیا ہے؟

اس کا جواب مُجھے فوراً ہی مل گیا، حیرت اور خُوشی کے باعث میری ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی، کیوں کہ میں نے اب اس کتاک کو دیکھ لیا تھا جو پہلے

میری پیشانی پر ضرور بندھا ہوا تھا لیکن اب میرے گرنے کی وجہ سے سر سے کھُل کر وہیں اُس نرم زمین پر گر پڑا تھا۔ ۔ کتاک کے کھلتے ہی میں اب پھر سے فیروز بن گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے کراما کا غلام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب میرے دِل میں کراما کے خلاف نفرت اور غُصّے کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ میرے لیے یہ بڑا سنہرا موقع تھا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کتاک کو اٹھا کر اس کے بیچ میں لگے ہوئے سنہری گولے کو غور سے دیکھا۔ یہ گولا سنہرے رنگ کے ایک پاؤڈر سے بھرا ہوا تھا۔ اور تو کُچھ میری سمجھ میں آیا نہیں، بس میں نے فوراً سنہری گولے کو پٹّی سے علیحدہ کر لیا۔ ایسا کرتے ہی سنہری پاؤڈر گولے میں سے نکل کر ریت میں گر گیا۔ اب مُجھے یہ فکر ہوئی کہ گولے میں ایسی کون سی چیز بھروں جو سنہری معلوم ہو اور جس سے میرا راز نہ کھلے۔ مُجھے جو کُچھ بھی کرنا تھا فوراً کرنا تھا کیوں کہ میرے ساتھی اب نیچے آنے ہی والے

تھے۔

اچانک مُجھے یاد آیا کہ دواؤں کے بکس میں ایک سنہری پنی کا ہوا بند پیکٹ ہے، اس پیکٹ میں چکر دور کرنے والی گولیاں بھری ہوئی ہیں۔ اگر میں اس پنی کو کام میں لے آؤں تو کیسا رہے۔۔۔؟ یہ سوچنے کی دیر تھی کہ میں نے فوراً اس پر عمل کیا، پنی کا سنہرا رُخ میں نے گولے کے اندر اس خوبصورتی سے لگا دیا کہ وہ دور سے پاؤڈر جیسا ہی نظر آتا تھا۔ گولا دوبارہ میں نے سفید پٹّی میں جڑ دیا اور پھر یہ کتاک خود ہی اپنی پیشانی پر باندھ لیا۔

مجھے کُچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ کتاک بندھے ہونے کے باوجود میں اپنے ساتھیوں کو پہچان سکتا تھا، ان کے اور اپنے بارے میں سوچ سکتا تھا اور کراما کے خلاف بغاوت بھی کر سکتا تھا۔

مجھے ایک احتیاط ضرور کرنی تھی اور وہ یہ کہ کسی بھی حالت میں مُجھے مکرّر آدمیوں کے قریب نہیں پہنچنا تھا، وہ چونکہ خیالات پڑھ لیتے تھے اس لیے

میرے بارے میں یقیناً جان سکتے تھے۔ میں یہ تہیہ کر کے ان سے دور ہی دور رہوں گا فوراً کھڑا ہو گیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف چل پڑا جواب قریب ہی آ چکے تھے۔ ان کے ساتھ میں گھاٹی کی ان چٹّانوں کی طرف بڑھا جہاں مُجھ جیسے ہی دس پندرہ انسان درانتی نما ہتھوڑوں سے چٹانیں توڑ رہے تھے۔

ان میں ایک لڑکی بھی تھی جس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے دیکھا کہ اپنے قد سے ذرا اونچی ایک چٹّان تک پہنچنے کے لیے وہ ایک پتھرّ پر چڑھ رہی تھی کہ پتھرّ کے ہلتے ہی وہ لڑکھڑائی اور پھر زمین پر گر پڑی۔ میں انسانی ہمدردی سے مجبور ہو کر اس کی طرف بڑھا اور جلدی سے اسے اٹھایا۔ لڑکی نے کراہ کر اپنی آنکھیں کھولیں اور ایک بار مُجھے دیکھا۔

ہائے۔۔۔۔ میرا کلیجہ مُونہہ کو آتا ہے جب میں وہ وقت یاد کرتا ہوں! میں نے چیخ مار کر اس لڑکی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ بڑی بے تابی سے اس کے

کتاک سب کی پیشانیوں پر باندھ دیے گئے

اُلجھے ہوئے اور میلے بالوں کو سنوارنے لگا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ کیوں کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنی ہوئی وہ لڑکی اور کوئی نہیں، میری دِل و جان سے پیاری بیٹی نجمہ تھی۔

توقع کے مطابق نجمہ نے مُجھے دیکھ کر کسی بھی جوش یا حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اپنی خاموش اور اداس نگاہوں سے مُجھے دیکھتی رہی اور میں بدستور روتا رہا۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ امجد بھی یہیں کہیں ہو گا، مُجھے اسے بھی تلاش کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میں اپنے تمام ساتھیوں کے کناک اُتارلوں اور ان کے ذہنوں کو کراما کی گرفت سے آزاد کرالوں تو یہ بات ہم سب کے حق میں بہت مفید ثابت ہوگی۔ رہے دوسرے قیدی تو ان کے لیے کوئی اور طریقہ سوچا جائے گا۔ میرا یہ خیال مُجھے بھی معقول لگا لیکن مُشکل یہ تھی کہ میرے پاس وقت بالکل نہ تھا۔

اس گھاٹی میں چار مکّڑ آدمی پہرے کے لیے موجود تھے اور ان کی اگلی دو ٹانگوں میں ایک عجیب سی لکڑی نظر آ رہی تھی جس کے سرے پر سرخ رنگ کی کوئی چیز جل اور بجھ رہی تھی۔ میں ان مکّڑ آدمیوں کو ہوشیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے مُجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ یہ موقع جو خُدا نے مُجھے دیا ہے اس سے نہایت عقل مندی اور سوچ بچار کے بعد فائدہ اٹھاؤں۔ خُدا کا خیال آتے ہی اچانک میرے جسم میں حیرت انگیز قوّت پیدا ہو گئی، میں نے اپنے آنسو خشک کیے اور پھر نجمہ کو سہارا دے کر کھڑا کیا وہ مُجھے ابھی تک حیرت اور تعجّب سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہتھوڑا اسے دے دیا اور پھر یہ کہتا ہوا کہ۔ "معاف کرنا بیٹی، تمہیں دیکھ کر میرا دِل قابو میں نہیں رہا تھا" آگے بڑھ گیا۔

ہمیں اس سیّارے پر آئے ہوئے اپنے دُنیا کے حساب سے تقریباً آٹھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ لہٰذا اب یہاں شام ہو رہی تھی، سورج کا بہت بڑا اور

سُرخ گولہ آہستہ آہستہ شمال میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ (سورج وہاں اسی سمت میں ڈوبتا تھا) مُجھے اب معلوم ہوا کہ یہ سیّارہ کافی چھوٹا ہے اور اس کا دِن صرف نو گھنٹے کا ہوتا ہے۔ سورج کی نارنجی شعاعیں سبز آسمان سے گزرتی ہوئی جب اس گھاٹی میں پڑ رہی تھیں۔ تو ایک عجیب لیکن خوفناک منظر دکھائی دے رہا تھا، کیوں کہ سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں کا رنگ بے حد بھیانک ہو گیا تھا۔ عجیب سا رنگ جسے میں شاید اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ جیسے ہی سورج ڈوبا جنوب کی سمت سے تین کی ٹکڑی والے چاند نمودار ہوئے اور سبز روشنی بکھیرتے ہوئے شمال کی سمت چلے گئے۔ میں سمجھ گیا کہ اب ہر تین گھنٹے کے بعد یہ چاند روشنی پیدا کرتے ہوئے ادھر سے گزریں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کب اور کون سے وقت میں اپنی تجویز کو عملی جامہ پہناؤں؟

یکایک سائرن کی سی ایک ہیبت ناک آواز سُنائی دی۔ اس آواز کو سُن کر

سب قیدیوں نے کام چھوڑ دیا اور پھر کاگی سے بھری ہوئی ٹوکریاں اپنے سروں پر رکھ کر اس ٹیڑھے میڑھے راستے کی طرف بڑھنے لگے جو اونچائی تک جاتا تھا۔ ہمیں چونکہ آج پہلی بار یہ مقام دکھایا گیا تھا اس لیے ہماری ٹوکریوں میں کاگی کم تھی یہ ٹوکریاں کافی تعداد میں وہاں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ میں نے دیکھا کہ میری پارٹی کے لوگوں نے کاگی بالکل نہیں توڑی البتّہ دوسرے قیدیوں کی ٹوکریاں بھری ہوئی تھیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھا کیونکہ میں نے ان چاروں مکڑّ آدمیوں کو دیکھ لیا تھا جو اب اپنی آٹھ ٹانگوں سے رینگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ میں نے بھی جلدی سے ایک ٹوکری اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی اور پھر قطار میں سب سے آگے جانے والے قیدیوں میں شامل ہو گیا۔ ٹوکری چونکہ خالی تھی اس لیے وہ آگے والے آدمی کی ٹوکری سے ٹکرا کر نیچے گرنے لگی۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھالا اور پھر اتّفاقیہ اس آدمی کو دیکھا، حیرت اور خُوشی کے

ساتھ ہی مُجھے یہ دیکھ کر اطمینان بھی بہت ہوا کہ وہ آدمی امجد کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

امجد کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے، اور اس کی کھال جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔۔ میرا دِل خون کے آنسو رونے لگا، مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا، بس میں نے محبّت سے اس کے شانے کو تھپتھپایا اور پھر اسے سہارا دیتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ زرینہ مُجھ سے کُچھ پیچھے تھی، میں بار بار مُڑ کر اسے اور نجمہ کو دیکھ لیتا تھا کہ کہیں راستے کے پتھرّ انہیں زیادہ نقصان تو نہیں پہنچا رہے۔ مگر خُدا کا شکر ہے کہ وہ دونوں بغیر کسی مُشکل کے اوپر چڑھ رہی تھیں۔ راستہ کی باتیں میں کیا بیان کروں، خواہ مخواہ داستان لمبی ہوتی ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ہمیں بعد ایک تنگ سے غار کے اندر دھکیل کر مکرّ آدمیوں نے ایک بہت بڑا پتھرّ غار کے مُونہہ پر لگا دیا تاکہ ہم باہر نہ نکل سکیں۔

غار میں نارنجی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور دور تک ایک ایک چیز اس روشنی میں بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ اسے آپ ایک بہت بڑا غار کہہ لیجیئے۔ قید خانہ کہہ لیجیئے یا پھر ہمارا گھر۔ سب قیدی یہاں آکر جلدی سے لیٹ گئے اور پھر تھکن کے باعث لمبے لمبے سانس لی نے لگے۔ غار کی ناہموار زمین پر لیٹنے کے باوجود انہیں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی، ان کا احساس ہی فنا ہو کا تھا۔ کاگی سے بھری ہوئی ٹوکریاں ہم سے باہر ہی رکھوالی گئی تھیں۔ اور ہمارے چاروں محافظ بھی وہیں رہ گئے تھے۔ اس غار میں اب ہم بالکل اکیلے تھے۔ میں اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ لہٰذا میں نے پہلے تو چاروں طرف گھوم پھر کر اپنا اطمینان کر لیا کہ کوئی کھڑکی یا سوراخ اس غار میں ایسا نہیں ہے جس کے ذریعہ باہر کے مکّڑ آدمی ہماری باتیں سُن سکیں۔ اس کے بعد اس مقام کو دیکھا جہاں سے نارنجی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ ایک چوکور سا خانہ تھا جس میں خود بخود دھواں پیدا ہو رہا تھا اور بعد

میں یہی دھواں اوپر اٹھ کر روشنی بن جاتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اس خانے کے اندر ہاتھ بڑھایا، مگر روشنی، تپش یا جلن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک خدشہ مُجھے یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے یہ روشنی کا خانہ مکّڑ آدمیوں کے لیے کسی ٹرانسمیٹر کا کام بھی دیتا ہو! اگر واقعی ایسا ہوا تو پھر کُچھ ہی لمحوں بعد کے کسی نہ کسی مکّڑ آدمی کو غار کے اندر ضرور آنا چاہیئے۔۔۔ مگر خُدا کا شکر ہے میرا یہ خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا اور غار کا دہانہ اسی طرح بند رہا۔

سب طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد اب میں اپنے ساتھیوں اور قیدیوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ نجمہ اور امجد کے علاوہ قیدی تعداد میں کل دس تھے اور اپنی دہشت کے باعث پھٹی ہوئی بالکل سپاٹ سی آنکھوں سے لگاتار ایک ہی سمت میں گھورے جا رہے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں خوش قسمتی سے ہمارا سامان ابھی تک ہمارے کاندھوں سے بندھا ہوا تھا۔ مکّڑ آدمیوں نے ہمیں مجبور اور بے کس سمجھ کر اسے ہماری پیٹھ

سے الگ نہیں کیا تھا۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کے تھیلوں کو ٹٹولا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ نہ انہوں نے مُجھے دیکھا اور نہ ہی میری اس حرکت کا بُرا مانا۔ میں نے وہ پیکٹ نکال لیے جن کی پنی میں پہلے ہی اپنے کتاک میں لگا چکا تھا۔ پھر میں نے پیکٹ کی گولیاں نکال کر سنہری پنی الگ کر لی اور سب سے پہلے جان کی پیشانی سے اس کا کتاک اتار لیا۔ کتاک کے الگ ہوتے جانے ایک جھرجھری لی، پہلے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر انہیں دوبارہ کھول کر مُجھے غور سے دیکھا۔ مُجھے پہچانتے ہی وہ کُچھ کہنے والا تھا کہ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جان فوراً چپ ہو گیا اور حیرت اور تعجّب سے میری اس کارروائی کو دیکھنے لگا جو میں کتاک کے ساتھ کر رہا تھا۔ یعنی وہی سنہرا پاؤڈر نکالنے اور پھر سنہری پنی لگانے والا کام!

ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ اس طرح میں سب کو کراما

کی گرفت سے آزاد کرتا چلا گیا، وہ منظر بڑا رقّت انگیز تھا جب کہ میں اور زرینہ، امجد اور نجمہ سے گلے مل رہے تھے۔ خُوشی کے باعث نجمہ کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ میں اس وقت کی تفصیل بیان کر کے خواہ مخواہ اس کہانی کو لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ بس یہ سمجھیئے کہ وہ وقت بڑا دردناک تھا، ہمارے علاوہ جو دس قیدی تھے وہ بھی ہمیں تعجّب سے دیکھ رہے تھے۔ کیوں کہ ان کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آسکی تھی کہ وہ واقعی آزاد ہو گئے ہیں، اختر کی حالت بدستور وہی تھی وہ ابھی تک خود کو جرمی کہہ رہا تھا۔ نجمہ جب بھی میرے بھیّا کہہ کر اس سے لپٹنے کی کوشش کرتی وہ اسے ڈانٹ کر دور رہنے کی تاکید کرتا۔ میں نے اس عرصے میں نجمہ اور امجد کو اختر کے بارے میں سب کُچھ بتا دیا تھا۔ اس لیے وہ دونوں اس کی ناز برداری میں لگے ہوئے تھے۔

کافی دیر تک ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے رہے، امجد سے یہ پوچھنے پر کہ

آخر وہ اور نجمہ کس طرح کار سمیت غائب ہو گئے تھے۔ اس نے مختصراً

مُجھے اتنا بتایا کہ جب وہ دونوں بمبئی سے آسٹریلیا جانے کے لیے میرے

محل سے روانہ ہوئے تو اچانک سڑک پر پہنچتے ہی ایک چمکیلی سبز روشنی

آسمان سے ان کی کار پر پڑی اور پھر وہ کار آہستہ آہستہ اس روشنی کے

دائرے میں آسمان کی طرف اٹھنے لگی۔ انہوں نے باہر نکلنے کی کوشش

کی مگر دروازے بالکل جام ہو گئے، کار پھر بڑی تیزی سے خلاء کی طرف

جانے لگی، انہیں ایسا لگا جیسے کہ وہ راکٹ میں بیٹھے ہوئے پرواز کر رہے

ہوں۔ جب کار زمین کی کشش سے نکل گئی تو انہیں ایک قہقہہ سُنائی دیا، کوئی

ان سے کہہ رہا تھا کہ اب وہ بے بس ہیں اور سیّارہ زہرہ کی طرف جا رہے

ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ خود کو سیّارہ زہرہ کے ڈکٹیٹر شا کا قیدی سمجھیں۔

آواز جب سُنائی دینی بند ہو گئی تو اچانک کار کو ایک جھٹکا لگا اور وہ بڑی تیزی

سے اس سبز سیارے کی طرف جانے لگی، ان دونوں کو بڑا ڈر لگا اور وہ

سوچنے لگے کہ شاید کار سیّارے کی زمین سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی، مگر ایسا نہ ہوا، کسی خاص قوّت نے کار کو بڑی آہستگی سے سیّارے پر اتار لیا۔ جس مقام پر کار اتری اس سے کُچھ ہی فاصلے پر مکڑّ آدمیوں کی خوفناک اور بھیانک قوم انہیں گرفتار کرنے کے لیے موجود تھی۔ وہ قیدی بنا کر کا گی کھودنے پر مامور کر دیے گئے اور اس دِن سے لے کر آج تک وہ برابر یہ کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اختر یہ کہانی بڑے شوق سے سُن رہا تھا، اس کا چہرہ غُصّے سے لال ہو رہا تھا آخر کار اس نے غُصّیلی آواز میں کہا۔

"میں ان لوگوں سے ٹکّر لوں گا، بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میرے عظیم آقا کا مشن فیل ہو جائے! جرمی قوم زوک کی مایہ ناز بیٹی ژاما کا بیٹا اور یوں چوہوں کی طرح ان مکڑیوں کے چنگل میں پھنس جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا، ہر گز نہیں ہو سکتا۔"

"تم ہمیں کس طرح آزاد کراؤ گے مسٹر جرمی!" جیک نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مشن ان مکڑیوں کی وجہ سے ہی پورا نہیں ہو سکا ہے۔" اختر نے جواب دیا۔ "درمیان ہی میں سے اس قوم نے ہمارے راکٹ کو اُچک لیا ہے۔ ژاما کی قسم میں انہیں اس حرکت کا مزا چکھاؤں گا۔۔ ضرور چکھاؤں گا۔"

اختر تو نہ جانے کیا اوّل فول بکتا رہا۔ مگراب میں قیدیوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہماری دُنیا کے مختلف ممالک کے سائنس داں ہیں۔ انہیں ان کی کاروں سمیت اغوا کر لیا گیا تھا۔ طریقہ وہی تھا جو امجد اور نجمہ کے ساتھ برتا گیا۔ ان سب کی کاریں اس سبز سیّارے پر ابھی تک موجود ہیں۔ لیکن چونکہ یہاں پٹرول موجود نہیں ہے اس لیے کاریں چل نہیں سکتیں۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے میرا

شکریہ ادا کیا کہ میں نے انہیں مستقل بے ہوشی سے نجات دلائی ہے۔

قیدیوں میں سے جیکسن نامی ایک آدمی زیادہ سمجھدار اور معقول تھا، میں نے جب اس سے کاگی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔

"دراصل کاگی ایک قسم کا چقماق نما پتھرّ ہے۔ اس پتھرّ سے مکڑّآدمیوں کی قوم ایندھن کا کام لیتی ہے۔ کراما کے تاج میں اسی پتھرّ کا جوہر لگا ہوا ہے۔ اس لیے کراما زیادہ طاقت ور مانا جاتا ہے۔ کاگی سے یہاں روشنی پیدا کی جاتی ہے۔ اور اسے ایک خاص قسم کی گھاس میں ملا کر یہ قوم اس سے اپنی غذا بھی بناتی ہے۔ اس پتھرّ میں سے ہلکی ہلکی لپٹیں نکلتی ہیں، مگر ان میں تپش بالکل نہیں ہوتی۔"

"لیکن کیا آپ بتا سکیں گے کہ یہاں سے کافی دور اسی قسم کے پتھرّ کی کُچھ اور چٹّانیں بھی ہیں جو غالباً چلتی بھی ہیں۔ کیا وہ بھی کاگی ہی سے بنی ہیں؟" جان نے پوچھا۔

"کاگی ان میں زیادہ مقدار میں موجود ہے۔ اسی لیے ان چٹّانوں میں حرکت کرنے کی قوّت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے قریب جانے یا انہیں چھونے سے انسان کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ خوش قسمت تھے جو ان سے بچ کر نکل آئے۔"

"مگر وہ چٹّانیں ایک خاص حد کے اندر کیوں رہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "آگے کیوں نہیں آتیں؟"

"سنگِ مرمر جیسی ایک خاص مادّے کی زمین اِن مکّڑ آدمیوں نے اپنے مُونہہ سے نکلنے والے لعاب کی مدد سے تیّار کی ہے۔ کاگی کی زندہ چٹّانیں اس لعاب والے پتھرّ پر نہیں آ سکتیں۔ آئیں گی تو وہ خود بخود پگھلنے لگیں گی۔ اور ان کا پگھلنا ان کی موت کے برابر ہے۔"

"آپ نے بہت کام کی باتیں بتائی ہیں۔ مسٹر جیکسن۔۔۔" جان نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بتائیے کہ جب آپ کی پیشانی

پر کتاک بندھا ہوا تھا تو پھر آپ نے یہ سب چھان بین کس طرح کی؟"

"جب میں یہاں آیا تھا اور ان مکڑّ آدمیوں نے مُجھے پکڑنے کی کوشش کی تھی تو میں فوراً ان کے قابو میں نہیں آیا تھا بلکہ زمینی وقت کے لحاظ سے ایک ہفتے تک ان سے بچتا پھرا تھا اور اس عرصے میں مُجھے یہ سب واقفیت حاصل ہو گئی تھی۔ میرے اس اقدام کے باعث ہی آپ لوگوں کے یہاں آتے ہی گرفتار کر کے آپ کی پیشانی پر کتاک باندھ دیا گیا تھا۔"

"بہت عمدہ۔۔ بہت خوب!" والٹر نے اسے شاباشی دے اور پھر کہا۔ "اچھّا یہ بتائیے کہ اگر کاگی کی زندہ چٹّانیں کسی طرح اس قوم کے پاس آ جائیں تو کیا ہو گا؟"

"چونکہ مکڑّ آدمیوں کے جسموں میں کاگی کافی مقدار میں ہے اس لیے چٹانوں کے آتے ہی ان کے جسم بھڑک اُٹھیں گے۔" جیکسن نے ایک عجیب بات بتانی شروع کی۔ "اسے یوں سمجھئے کہ بجلی کے دو تار جس طرح مل کر

شعلہ پیدا کرتے ہیں ہو بہو وہی معاملہ ہے، منکّڑ آدمیوں کے جسم نیگیٹو ہیں اور زندہ چٹّانیں پوزیٹو۔ جیسے ہی دونوں ایک دوسرے کو چھوئیں گے زبردست شُعلہ پیدا ہوگا اور دونوں فنا ہو جائیں گے بلکہ یہ بھی مُمکن ہے کہ زندہ چٹّانوں کو نقصان کم پُہنچے اور منکّڑ آدمیوں کو زیادہ۔ رہی یہ بات کہ چٹّانیں خود بخود کس طرح منکّڑ آدمیوں کے قریب آ جائیں گی تو یہ ایک قسم کی مقناطیسی کشش ہے۔ جب بھی کوئی زندہ چٹّان منکّڑ آدمی کو دیکھے یا محسوس کرے گی، وہ اپنے آپ ہی اس کی طرف چلنے لگی گی۔ میں یہ بات دعوے سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنی روپوشی کے زمانے میں، میں نے اسی طرح ایک منکّڑ آدمی کو مرتے دیکھا ہے۔"

"شاید ہمارے جسموں میں بھی کوئی چیز ہے، جسے محسوس کر کے زندہ چٹّانیں ہمارا تعاقب کرنے لگی تھیں۔" زرینہ نے خوف زدہ آواز میں پچھلی باتیں یاد کرتے ہوئے کہا۔

"آپ درست سمجھتی ہیں۔" جیکسن نے تسلیم کیا۔ "ابھی تک میں نے کسی زندہ چٹّان کو چھُو کر نہیں دیکھا اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اگر وہ ہم سے ٹکرائے گی تو ہمارا کیا حشر ہو گا؟ ویسے یہ بات ٹھیک ہے کہ چٹّانوں کے لیے ہم میں بھی کوئی مقناطیسی کشش ضرور ہے۔"

"اچھّا یہ فرمائیے کہ اگر کسی طرح ہم چٹّانوں کو اور مکڑّ آدمیوں کو آپس میں ٹکرا دیں تو کیا یہ قوم ختم ہو جائے گی۔" جان نے دریافت کیا۔

"یقیناً ہو جائے گی۔۔؟ مگر اِن دونوں کو قریب لانا بے حد مُشکل ہے۔ زندہ چٹّانوں پر مکڑّ آدمی اپنی چونچ کا لعاب پھینکتے ہیں اور یہ چٹّانیں اس لعاب سے ڈرتی ہیں۔"

میں یہ باتیں سُن کر بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اچانک مُجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں نے فوراً جیکسن سے کہا۔

”مکّڑ آدمیوں کی چونچ سے لعاب نہ نکلے اس کا انتظام میں کرلوں گا۔“

”کیسے۔۔۔۔؟“ سب نے اشتیاق بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ میں بعد میں، یعنی جب وقت آئے گا تب بتا سکتا ہوں۔“

جیکسن سے ملاقات کرنے پر بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ ہم اس غار میں بہت دیر تک آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے۔ پچھلی باتیں دہراتے رہے اور آئندہ کے لیے پروگرام بناتے رہے۔ کنا کوں کے اندر ہم نے پنی لگا دی تھی اور اب یہ کتاک سب نے اپنے اپنے سروں پر باندھ لیے تھے۔ طے یہ پایا کہ تھا کہ جب غار کا پتھّر ہٹایا جائے تو ہم مکّڑ آدمیوں سے دور ہی دور رہیں اور یہی اداکاری کرتے رہیں کہ ہم ابھی تک کراما کے خادم ہیں۔ اپنے دماغوں سے۔۔ ہم یہی سوچتے رہیں۔ ہم نے اگر کوئی اور بات سوچی تو ہمارا بھید کھل سکتا ہے اور پھر کوئی نہ کوئی پریشانی یا مُصیبت نازل ہو سکتی ہے!

سات گھنٹے کے بعد ہمارے غار کی روشنی اچانک نارنجی سے اودی ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی مندر میں بجنے والے گھنٹے سے ملتی جلتی ایک آواز آئی۔ آواز کے بعد ہی غار کے دہانے کا پتھرّ آہستہ آہستہ ایک طرف کھسکنے لگا۔ ہمارے محافظ مکڑّ آدمی باہر کھڑے ہوئے اپنی بھیانک آنکھوں سے ہمیں گھور رہے تھے۔ چونکہ اب ہم لوگ پوری طرح سوچ اور سمجھ چکے تھے کہ ہمیں کیا کرنا ہے، لہٰذا اس اسکیم کے تحت ہم جلدی سے کھڑے ہو گئے اور پھر مسمریزم کے معمول کی طرح باہر نکلنے لگے، امجد اور نجمہ کو میں نے درمیان میں رکھا تھا۔ مکڑّ آدمیوں کی بھیانک آنکھیں ہمارے دِلوں کو ٹٹولنے کے لیے ہماری نگاہوں سے ملی ہوئی تھیں۔ ہم اداکاری کر رہے تھے اور ہماری زبان اور دماغ میں صرف ایک ہی فقرہ بار بار گونج رہا تھا۔

"میں کراما کا غلام ہوں، کراما میرا آقا ہے، میں اس کا حُکم بجا لاؤں گا۔"

غار سے نکلنے کے بعد ہم کھلے میدان میں آئے۔ یہاں ہمارے لیے پپیتے

جیسے پھلوں کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ جیکسن مُجھے بتا ہی چکا تھا کہ اس موقع پر ہمیں دیوانوں کی طرح پھلوں پر ٹوٹ پڑنا ہے۔ لہٰذا ہم نے ایسا ہی کیا۔ اختر چونکہ خود کوژاما کا بیٹا سمجھتا تھا اور خود کو ہم سے زیادہ بڑا اور افضل محسوس کرتا تھا اس لیے وہ اپنے مقام پر ہی کھڑا رہا۔ ہمارا بھید کھلنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ مگر خُدا بھلا کرے سوامی کا اُس نے جلدی سے اختر کو شانے سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا پھلوں کے ڈھیر تک لے آیا۔ مکّڑ آدمی اس موقع پر ہم سے بیس فٹ دور کھڑے تھے اس لیے انہوں نے نہ تو سوامی کی حرکت دیکھی اور نہ ہی ہمارے ذہنوں کو پڑھنے کی کوشش کی، کنگلوں کی طرح پھل کھانے کے بعد ہم لوگ ایک قطار کے اندر اُسی گھاٹی کی طرف چلنے لگے جہاں پہنچ کر ہمیں کاگی کھودنی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں خالی ٹوکریاں اور درانتی نما ہتھوڑے تھے اور ہم نہایت خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

یکایک ہمیں ایک زبردست پھنکار سُنائی دی۔ ایسی پھنکار جیسے کروڑوں
اژدہے ایک ساتھ مل کر سانس لے رہے ہوں۔ یہ آواز ایسی تھی کہ ہمیں
اپنے دِل ڈوبتے ہوئے محسوس ہوئے۔ پھنکار کی آواز کے ساتھ ہی ہمیں
جھٹکا سا لگا اور پیروں کے نیچے کی زمین کپکپائی۔ چونکہ یہ پہلے ہی سے طے
ہو چکا تھا کہ خواہ کوئی واقعہ یا حادثہ ہی کیوں نہ پیش آجائے، ہم میں سے کوئی
چونکے گا نہیں، اس لیے ہم پروگرام کے مطابق سامنے ہی دیکھتے ہوئے
چلتے رہے۔ البتّہ ہم نے محسوس کیا کہ مکّڑ آدمی اس پھنکار کو سُن کر اچانک
گھبرا گئے اور زمین سے دبک گئے۔ ان کی بھیانک آنکھیں خوفزدہ انداز میں
اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ پھنکار کی آواز کُچھ دیر تک ہمیں سُنائی دیتی رہی
اور پھر فوراً ہی ختم ہو گئی۔ کُچھ ہی دیر بعد ہم گھاٹی کے قریب پہنچ چکے تھے۔
میں یہ جاننے کے لیے بہت بے تاب تھا کہ یہ پھنکار کیسی ہے؟ صرف
جیکسن ہی میرے اس سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ مگر مُصیبت یہ تھی کہ

اس گھاٹی میں کام کرتے وقت ہی میں اس سے کُچھ دریافت کر سکتا تھا۔
اس سے پہلے نہیں۔

جب ہم کاگی چٹانوں سے کھود کھود کر نکال رہے تھے تو میں نے جیکسن سے یہ راز جاننے کی کوشش کی، مگر مُجھے بڑا تعجّب ہوا جب اس نے یہ بتایا کہ ایسی پھنکار کبھی کبھار سُنائی ضرور دیتی ہے، مگر وہ کس کی آواز ہے! افسوس یہ وہ کُچھ نہیں بتا سکتا۔ کیوں کہ اس نے آج تک اس چیز کو نہیں دیکھا ہے جو یہ آواز نکالتی ہے میں یہ جواب سُن کر مطمئن نہیں ہوا اور میں نے پکّا ارادہ کرلیا کہ میں اپنے طور پر اس حقیقت کو معلوم کروں گا۔ زرینہ اور نجمہ کے حصّے کی کاگی بھی ہم سب مل کر ہی نکالتے رہے اور ان دونوں کی ٹوکریاں بھرتے رہے۔ کبھی کبھار ہم ایک دوسرے بات کرلیا کرتے تھے۔ ورنہ زیادہ تر خاموش ہی رہتے۔ ہمیں ہر ہر قدم پر یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں محافظ مکڑ آدمی ہمارا راز نہ جان جائیں۔ اس لیے یہ احتیاط بہت

ضروری تھی۔

شام ہو گئی اور ہم پھر پہلے کی طرح واپس اپنے قید خانے میں آ گئے۔ اس قید سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے ہمارا اگلا قدم اب کیا ہونا چاہیئے۔ بس اسی قسم کی باتیں ہم بیٹھ کر سوچتے رہے۔ پھنکار کی آواز کے بارے میں ایک قیدی نے مُجھے یہ بتایا کہ ایک بار چٹّان سے ٹکرا کر اس کے سر کا کتاک کھل گیا تھا اور وہ اچانک ہوش میں آ گیا تھا، تب اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ مکّڑ آدمی قیدیوں کو دھکیلتے ہوئے تیزی سے ایک غار میں داخل ہو رہے تھے اور پھنکار والی آواز بہت قریب سے آ رہی تھی، مکّڑ آدمی اِس آواز سے بُری طرح ڈر رہے تھے اور انہیں اپنی جانیں بچانے کی بڑی فکر تھی۔ ایک مکّڑ آدمی کی نظر اس کے گِرے ہوئے کتاک پر پڑ گئی اور اس نے جلدی سے اسے اٹھا کر اپنی اگلی دو ٹانگوں سے اُس کی پیشانی پر باندھ دیا اور پھر فوراً ہی وہ اس ماحول سے بے خبر ہو گیا اسے بالکل معلوم

نہ ہو سکا کہ پھر کیا واقعہ پیش آیا؟

اگلے دِن کاگی کھودتے وقت میں نے والٹر، جان اور سوامی سے مشورہ کیا کہ اگر ہم اس جگہ سے بھاگ نکلیں تو کیسا رہے۔ مکڑّ آدمیوں کی فوج ہمیں اگر گرفتار کرنے کی کوشش کرے گی تو ہم اپنے ریوالور سے اس وقت تک کام لیتے رہین گے جب تک کہ ہمارے پاس گولیاں موجود ہیں۔

جیکسن نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اِس سیّارے میں عجیب و غریب جانور اور پرندے بھی موجود ہیں، چند پرندے تو ایسے ہی جن کی چونچیں تلوار جتنی لمبی ہیں اور وہ اپنے شکار کے جسم میں چونچ گھسا کر اُس کا خون پی لیتے ہیں۔ درندے اس قسم کے ہیں کہ ان کے ناخن زہریلے ہیں۔ جس کے بھی یہ ناخن لگ جاتا ہے، وہ فوراً دم توڑ دیتا ہے۔ اگر ہم بھاگ کر کہیں چلے بھی گئے تو ان بلاؤں سے کس طرح محفوظ رہیں گے؟“

جیکسن ٹھیک کہہ رہا تھا، میں نے جب جان سے مشورہ کیا تو اس نے بھی جیکسن کی بات کی تائید کی۔ آخر طے یہ پایا کہ کُچھ دِن اس قید میں گزار کر دیکھ لیتے ہیں۔ جلد بازی اچھّی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں بعد میں اپنے آزاد ہونے کا کوئی طریقہ سوجھ ہی جائے۔ شام ہونے سے پہلے اختر کی حالت بہت غیر ہونے لگی۔ کیوں کہ وہ کتاک مٹنے کے بعد اب پھر پہلا جیسا اختر یعنی جرمی بن چکا تھا۔ وہ اپنے آقا کے گُن گا رہا تھا اور بار بار ہمیں دھمکی دے رہا تھا کہ اگر ہم نے چاروں محافظوں کو جان سے نہیں مار دیا تو وہ شور مچانا شروع کر دے گا۔ اور ہمارے راز پر سے پردہ اٹھا دے گا۔ میرے ساتھ زرینہ اور نجمہ نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر سب بے کار، یوں لگتا تھا گویا وہ اپنے آپے میں نہیں رہا ہے۔ اس نے پہلے ہی کی طرح زرینہ کو دھکا دے یا اور نجمہ کا ہاتھ جھٹک کر مکڑ آدمیوں کی طرف بھاگا۔

ہم غُصّے سے دیوانے ہو رہے تھے کیوں کہ اختر ہمارے سب پروگرام برباد کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ میں نے فوراً سوامی کو اشارہ کیا کہ وہ اختر کو پکڑ لے سوامی کے ساتھ ہی جیک نے بھی ایک جست لگائی اور پھر اختر ان کے قابو میں تھا۔ اس نے چلّانے کی کوشش کی تو میں نے جلدی سے اپنی جیب میں پڑی ہوئی ایک شیشی نکالی، اس میں وہی سنہری پاؤڈر بھرا ہوا تھا جو پہلے اصلی کتاکوں میں موجود تھا۔ میں نے سوامی کو حُکم دیا کہ وہ اختر کی پیشانی کا کتاک کھول کر فوراً مُجھے دے دے۔ سوامی نے ایسا ہی کیا۔ تب میں نے جلدی سے کتاک کے درمیانی گولے میں سے پنی نکال کر وہ پاؤڈر بھر دیا اور پھر یہ کتاک دوبارہ اختر کی پیشانی پر باندھ دیا۔ کتاک کے لگتے ہی اختر اچانک خاموش ہو گیا اور پھر سے کراما کی گرفت میں آگیا۔ اب وہ خالی خالی نظروں سے ایک ہی سمت میں دیکھ رہا تھا۔

خلاف توقّع تب یکایک ایک عجیب بات ہوئی۔ چاروں مکّڑ آدمیوں نے

جلدی سے ان لکڑیوں کا رُخ ہماری طرف کر دیا۔ جن کے سروں پر سُرخ رنگ کی کوئی چیز جل اور بُجھ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ رینگتے ہوئے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ حالانکہ وہ ابھی ہم سے کافی دور تھے لیکن میں اس حقیقت کو جان چکا تھا کہ اچانک وہ چاروں کیوں ہوشیار ہو گئے تھے؟ ہم لوگوں کو دراصل مسمریزم کے معمولوں کی طرح رہنا تھا۔ (ہم یہ اداکاری کر بھی رہے تھے) غَلطی یہ ہوئی کہ ہمیں تو اپنے کاموں میں مصروف رہنا چاہیئے تھا۔ جب کہ اختر نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا تھا اور سوامی اسے پکڑنے دوڑا تھا۔ معمول سے یہ توقّع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی چیخنے چلانے یا بھاگ دوڑ والی حرکت کر سکتا ہے! بس اِسی لیے مکّڑ آدمی ہوشیار اور چوکنّے ہو گئے تھے، میں یہ بات اچھّی طرح جانتا تھا کہ جب وہ ہمارے قریب آ جائیں گے تو ہمارے دماغ پڑھ لیں گے اور تب ہمارا بھید یقیناً کھل جائے گا۔

یہ حالت دیکھ کر جان نے فوراً گولی چلانے کا حُکم دیا۔ مگر جیکسن نے چلّا کر کہا کہ خبردار ایسا مت کیجیئے گا۔ ان کے ہتھیاروں کی شعاعیں ہمیں پلک جھپکتے میں جلا کر بھسم کرڈالیں گی۔ یہ گھاٹی بھی ایک طرح کا قید خانہ ہے۔ ہر طرف اونچی اونچی چٹانیں ہیں۔ ہم بھاگ بھی نہیں سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اس کی یہ بات مان لی مگر ایک قیدی نے ڈر کر بھاگنا چاہا تھا کہ اچانک ایک محافظ کے ہتھیار سے سُرخ رنگ کی شعاع نکلی اور پھر وہ قیدی ایک سیکنڈ میں جل کر ختم ہو گیا۔ جس مقام پر وہ کھڑا تھا وہاں اس کی راکھ بھی باقی نہ رہی۔۔ یہ دیکھ کر ہم بُری طرح سہم گئے اور پھر ہم نے مکّڑ آدمیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

مکّڑ آدمی ہمیں اپنے نرغے میں لیے ہوئے واپس کراما کے غار میں لائے۔ شاید اسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ کُچھ دیر پہلے کیا واقعات پیش آئے ہیں۔

دھوئیں دار غبارے زمین پر گھسٹتے ہوئے ہماری
طرف آرہے تھے
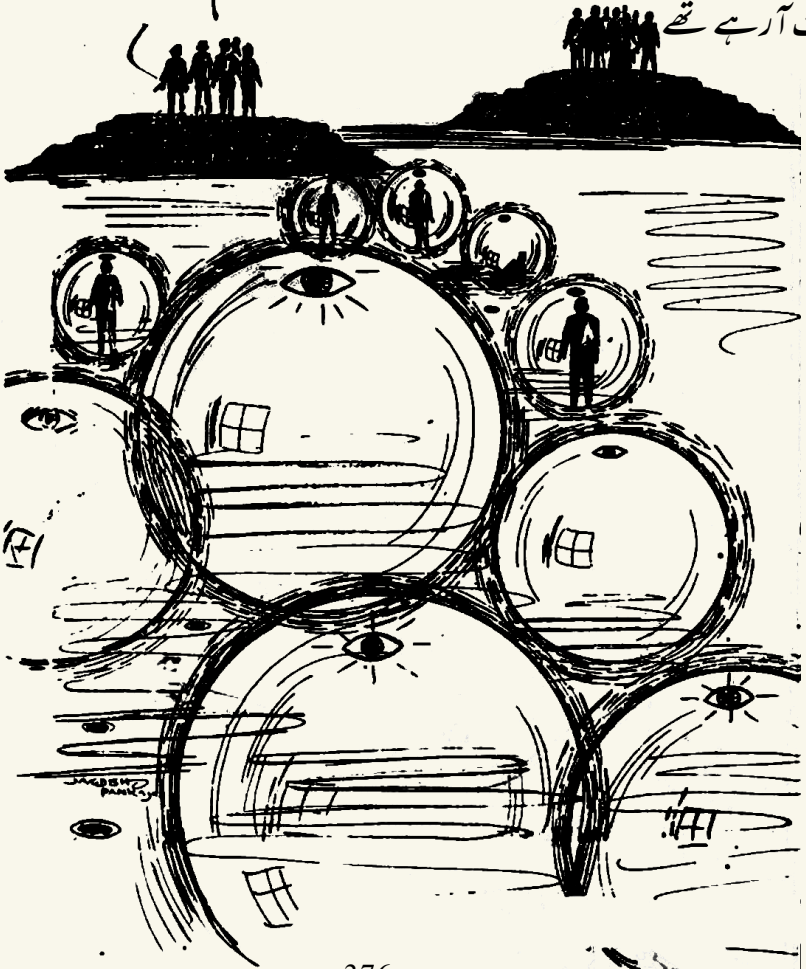
اسی لیے وہ درخت کے نچلے پتے پر بڑی بے قراری سے پھر رہا تھا۔ اس کے چونچ نما مُونہہ سے بدبودار لعاب ٹپک رہا تھا اور آنکھیں غُصّے کے باعث چنگاریاں اُگل رہی تھیں۔۔ چند لمحوں تک وہ ہمیں حقارت بھری نظروں سے گھورتا رہا۔ اس کے دربار کے مکّڑ آدمی سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے تھے۔ اس کی چونچ کھلی اور پھر تیز سیٹی جیسی آواز ہمیں سُنائی دی۔

"حکم عدولی کی سزا بھگتنے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔"

اس نے اپنی اگلی دو ٹانگیں تالی بجانے کے انداز میں پیٹیں، اس آواز کو سُن کر زرد مکّڑ آدمی آگے بڑھے اور پھر کراما نے ان سے کہا۔ "ان بدبختوں کو شیفاؤں کے علاقے میں اُن کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دو۔"

وہ ایک لمبا چوڑا صاف سا میدان تھا جہاں مکّڑ آدمی ہمیں چھوڑ گئے تھے۔

اس میدان میں رات کا اندھیرا ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔ چونکہ سیّارے کے چاند یہاں لگاتار نہیں چمکتے تھے بلکہ تین کی ٹکڑی میں جنوب کی سمت سے نمودار ہوتے تھے اس لیے جہاں تک نظر جاتی تھی، وحشت ناک اندھیرے کی چادر دور تک پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اندھیرے کے ساتھ ہیبت ناک سنّاٹا اور بھیانک خاموشی اس ماحول پر حاوی تھی۔ ویسے تو یہ میدان بالکل چٹیل تھا لیکن اگر اس میں کہیں چٹّانیں موجود تھیں تو وہ ہمیں اندھیرے کے باعث نظر نہ آتی تھیں۔

ہم اُنّیس آدمی بڑی بے بسی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دس قیدی اور نو ہم سب کے سب اس وقت نامعلوم شیفاؤں کے رحم و کرم پر تھے اور سب سے بڑی مُصیبت یہ تھی کہ ہم بالکل نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہیں؟ خُدا کا شکر ہے کہ ہمارا سامان اس وقت تک ہمارے ہی پاس تھا۔ مکڑّ آدمی ہمیں چھوڑ

کر جا چکے تھے اس لیے میں نے جلدی سے اپنے تھیلے کو ٹٹول کر ٹارچ نکالی اور پھر اس کی روشنی گھوم پھر کر ہر طرف ڈالنے لگا۔ جیک نے بھی ایسا ہی کرنا چاہا لیکن جان نے فوراً اسے ٹوکا۔

"نہیں۔۔۔ ٹارچ ایک ہی جلنے دو سب ٹارچیں ایک ساتھ جلانے سے ہمارے سیل جلد ختم ہو جائیں گے۔"

بات معقول تھی اس لیے جیک نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور پھر ٹارچ سے نکلتی ہوئی اس روشنی کی لکیر کو دیکھنے لگا جو اب ایک اونچی سی چٹّان پر پڑ رہی تھی۔ اندازاً یہ چٹّان کوئی بیس میٹر اونچی تھی۔ جان نے یہ دیکھ کر فوراً مُجھ سے کہا۔

"بس ٹھیک ہے، ہم لوگ رات اِسی چٹّان پر بسر کریں گے۔"

"لیکن ایک ہی چٹّان پر اتنے سارے لوگ کس طرح لیٹ سکیں گے؟

"جیکسن نے فوراً اعتراض کیا۔

"اب لیٹنا کس احمق کو ہے!" جان نے خُشک لہجے میں جواب دیا۔ "لیٹ کر ہم شیفاؤں کی خوراک نہیں بننا چاہتے۔ اب عمل کا وقت ہے مسٹر جیکسن، ہمیں ہر قدم ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ اٹھانا چاہیئے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" والٹر نے دریافت کیا۔

"یہی کہ پوری رات جاگ کر گزاری جائے اور ایسی ہی ایک دوسری چٹّان بھی کہیں آس پاس تلاش کی جائے۔ دس آدمی وہاں رہیں اور نو یہاں، اگر ایک پارٹی پر مُصیبت آئے تو دوسری فوراً اس کی مدد کو پہنچ سکے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ جان کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ ہم سب نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا، ویسی ہی ایک چٹّان بھی قریب ہی مل گئی۔ حالانکہ وہ اونچائی میں کم تھی، مگر اوپر سے کافی ہموار تھی، ہم جوں توں کر کے چٹّان پر

چڑھ ہی گئے۔ جیکسن کو ایک پستول دے دیا گیا۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ کو
معلوم ہی ہے قیدی بالکل نہتے تھے۔ اختر ابھی تک کتاک باندھے ہوئے
تھا، جب کہ ہم نے اپنے اپنے کتاک اُتار کر احتیاط سے رکھ لیے تھے۔ اختر
کے لیے کتاک اس لیے ضروری سمجھا گیا تھا ہمیں اب اس پر بھروسہ نہیں
رہا تھا کیوں کہ کسی بھی وقت وہ ہمارے پروگرام میں رکاوٹ ڈال سکتا تھا۔
لہٰذا وہ اسی طرح خاموش بیٹھا ہوا لگاتار ایک ہی سمت میں گھورے جا رہا
تھا۔

پوری رات بغیر کسی پریشانی اور آفت کے گزر گئی۔ چاند آسمان پر سے
بے شک گزرے تھے مگر ان کی روشنی میں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو
سکی تھی۔ اب صُبح کی روشنی میں ہم نے اس بھیانک علاقے کو دیکھا۔ یہ
ایک دلدلی علاقہ تھا اور اس میں پیڑ یا پودے جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتّہ
ایک بات نے ضرور ہمیں حیرت زدہ کر دیا۔ دلدلی زمین پر ہم نے گول

سے نشان دیکھے۔ یہ نشان دس دس فٹ کی دوری پر بنے ہوئے تھے۔
یوں لگتا تھا گویا کسی دیو نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر دلدل پر دس فٹ کی
دوری پر انگلیوں کو دبا دیا ہے۔ نہ جانے یہ نشان کہاں سے آ رہے تھے
اور کس جگہ جا رہے تھے؟ ان نشانوں کے علاوہ اس میدان میں اور کوئی
نشان نہیں تھا جو بھی مقام تھا بالکل صاف اور ہموار، لہٰذا یہ گول نشان (جو
گہرائی میں ڈیڑھ فٹ سے کم ہرگز نہ ہوں گے) اس صاف جگہ پر بڑے
عجیب معلوم ہو رہے تھے!

مصیبت تو یہ تھی کہ ہمیں اپنے نئے دُشمن کے متعلّق ذرا سی بھی واقفیت
نہیں تھی۔ ہم ڈرتے ڈرتے ان نشانوں کے قریب گئے اور انہیں بغور
دیکھا۔ مگر اس کے سوا کُچھ بھی معلوم نہ کر سکے کہ وہ ڈیڑھ فٹ گہرے اور
بیس فٹ قطر کے دائرے ہیں۔ یہ دائرے کس چیز سے پیدا ہوئے ہیں،
کسی انسان سے یا کسی مشین سے؟ افسوس ہمیں یہ علم نہ تھا۔ دِن بھر ہم

چوکنّے بیٹھے ہر طرف دیکھتے رہے مگر کوئی حیرت انگیز واقعہ پیش نہ آیا۔ اب تو ہمیں یہ شُبہ ہونے لگا کہ شاید کراما نے ہمیں ڈرانے کے لیے یہاں بھیجا ہے اور یہ شیفا کوئی خاص شے نہیں ہے۔ لیکن آپ آگے جا کر پڑھیں گے کہ جس خطرے کو ہم نے نظر انداز کر دیا تھا وہ اس طرح ہم پر حاوی ہوا کہ ہمیں موت کی خواہش ہونے لگی!

رات کا گہرا اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا، ہوا رُک گئی تھی۔ اور بھیانک خاموشی نے پورے علاقے کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا، ہم دم سادھے اور ٹکٹکی باندھے سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زرینہ نجمہ کو اپنے سینے سے بھینچے ہوئے بیٹھی تھی اور جیک و سوامی شکاری کُتّوں کی طرح ہوشیار تھے۔ جان خلافِ توقع کُچھ خاموش تھا۔ رہا میں، تو میرا دِل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا ماحول کی سنسانی اور اختر کی سپاٹ سی نگاہوں کو دیکھ کر مُجھے یوں لگ رہا تھا گویا کوئی طوفان پوری رفتار سے ہماری طرف

بڑھ رہا ہے! اچانک مُجھے ایک زبردست پھنکار سُنائی دی۔۔ زبردست لیکن بھیانک!! اس کے ساتھ ہی اس علاقے کی زمین کپکپانے لگی۔ ایسا لگا گویا ایک زبردست زلزلہ آرہا ہے، وہ پھنکار اب بہت ہی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہوشیار مسٹر فیروز۔۔۔۔ شاید یہ شیفا کی پھنکار ہے۔!" دوسری چٹّان سے جیکسن نے چلّا کر کہا۔

اور اس کا یہ چیخنا ہی اس کے لیے مضر ثابت ہوا، وہ پھنکار فوراً بند ہو گئی اور پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی بہت وزنی چیز زمین پر گھسٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے، میرا دِل یوں دھڑک رہا تھا کہ میرے قریب بیٹھی ہوئی زرینہ اس کی آواز صاف طور سے سُن رہی تھی اور مُجھے تسلّی دینے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ میرے دِل پر رکھ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ جو بھی ہونا ہے فوراً ہو جائے، جو بلا اور مُصیبت آنی ہے یکایک آ جائے تاکہ اس

پریشانی اور گھبراہٹ سے کسی طرح چھٹکارا تو ملے!

ہم سب سہمے ہوئے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھسٹنے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی اور اب صرف یہی آواز تھی جو ہمیں سُنائی دے رہی تھی۔ لیکن پھر اچانک دوسری چٹّان سے ہمیں ایک بھیانک چیخ سُنائی دی۔ یہ دِل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی ایک آواز تھی، کوئی بُری طرح چلّا رہا تھا۔ اس کی چیخنے کی آوازوں کے ساتھ ہی لگاتار فائروں کی آوازیں بھی سُنائی دے رہی تھیں۔ یہ فائر یقیناً جیکسن نے کسی نامعلوم چیز کو دیکھ کر کیے تھے۔

آوازیں بڑھتی ہی گئیں۔۔ دردناک چیخیں۔!۔۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی درندہ بیک وقت چار پانچ انسانوں کو پھاڑ کھانے کے لیے جدو جہد کر رہا ہو۔ خطرے کی پروا کیے بغیر میں نے نیچے کودنے کی کوشش کی تو زرینہ نے مُجھے دبوچ لیا اور ساتھ ہی جان نے مُجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کیا کرتے ہو بے وقوف۔۔۔کیا تمہیں اپنی جان پیاری نہیں ہے؟"

"مگر۔۔۔ مگر وہ لوگ نہ جانے کس مُصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں!" میں اُس چٹّان کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹارچ کی روشنی اس طرف ڈالو!"

میں نے جان کا کہنا مان کر چٹّان کی طرف روشنی ڈالی۔ قیدی مُجھے بے بسی سے چِلّاتے ہوئے نظر آئے۔ مگر ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی جس سے وہ سب اچانک خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ہم نے محسوس کیا کہ سانپ کی پھنکار جیسی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بھیانک وجود زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ روشنی میں ہم نے اس چیز کو دیکھنے کی بہتیری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے ہمیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ہاں البتّہ اژدہے کی پھنکار کے ساتھ ہی چند انسانی چیخیں اس مقام سے بتدریج دور ہوتی جا رہی تھیں۔

تمام رات ہم سہمے ہوئے اسی جگہ بیٹھے رہے اور پھر صُبح ہوتے ہی تیزی سے دوڑتے ہوئے برابر والی چٹّان کے پاس پہنچے۔ سوامی اور جیک کو ہم نے اختر، نجمہ اور زرینہ کی حفاظت کے لیے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ دِن کی روشنی میں اب ہم نے دیکھا کہ قیدی تعداد میں کل پانچ رہ گئے ہیں، بقیہ پانچ کہاں گئے، یہ تو جیکسن سے دریافت کرنے پر ہی معلوم ہو سکتا تھا اور پھر جیکسن نے ہمیں ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ بس یوں سمجھیے کہ ایک دھواں سا تھا۔"

"دھواں۔۔۔۔۔؟" والٹر نے تعجّب کے ساتھ کہا۔

"جی ہاں۔۔۔ وہ ایک عجیب سا بدبودار دھواں تھا جو اچانک ہم سب پر چھا گیا اور پھر پانچ آدمیوں کو اٹھا کر لے گیا۔"

"دھواں اٹھا کر لے گیا؟" جان نے بے اعتباری کے لہجے میں کہا۔

"آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر حقیقت یہی ہے۔" جیکسن نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اور وہ پھنکار یا پھر کسی چیز کے گھسٹنے کی آوازیں۔۔۔ وہ سب کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"مسٹر فیروز کیا بتاؤں۔۔۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کسی چیز کو دیکھنے کا ہوش ہی نہ رہا۔" جیکسن نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اس دھوئیں میں سے ہی وہ پھنکار نکلتی ہے۔ وہ دھواں ہی زمین پر چلتے وقت گھسٹنے کی آواز پیدا کرتا ہے اور اس دھوئیں کے اندر ہی سے میرے ساتھیوں کی چیخیں بعد میں بلند ہوتی رہیں۔"

"عجیب بات ہے۔۔ کُچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" جان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مگر سنو مسٹر جیکسن۔۔" میں نے جلدی سے اسے مخاطب کیا۔ "اس

دھوئیں کا نام ہی تو شیفا نہیں ہے؟"

"یہ میں کس طرح کہہ سکتا ہوں۔ ہاں ویسے مُجھے یقین یہی ہے۔"

اتنی گفتگو کے بعد ہم لوگ اس چٹّان کے آس پاس گھومنے لگے، ہمیں یہ اُمّید تھی کہ شاید شیفا کے بارے میں کُچھ اور سُراغ لگ جائے گا ہوا بھی ایسا ہی۔۔۔ چٹّان کی پُشت پر ہمیں وہی گول گول گڑھے نظر آئے، یعنی وہی نشان جو ہم ایک دِن پہلے میدان میں دیکھ چکے تھے۔ یہ گول نشان میدان کے نظر نہ آنے والے سِرے پر جا کر غائب ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ نشان شیفا کے ہی پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مگر شیفا خود کیا ہے افسوس یہ ہم اس وقت تک بھی نہیں سمجھ پائے تھے!

بیان کرنے کو تو میں اپنی یہ کہانی بڑی آسانی کے ساتھ بیان کر رہا ہوں لیکن اس کہانی کا جیتا جاگتا کردار بنتے وقت جتنی، اُلجھن، جتنی پریشانی اور جس قدر ہیبت مُجھ پر طاری تھی۔ اس کا اندازہ آپ لوگ یعنی اس داستان کے پڑھنے

والے ہرگز نہیں لگا سکتے۔ میں اب اچھّا خاصا صحت مند انسان ہوں مگر تب سوکھ کر بالکل مریل سا کھچی جیسا انسان بن گیا تھا۔ لہٰذا اپنی اس وقت کی صحت کے لحاظ سے وہ نشانات دیکھ کر سچ مانئے کہ مُجھ پر رعشہ طاری ہو گیا تھا، میں اپنی بے بسی اور نااُمّیدی کو سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اگر ایسے وقت جان وہاں موجود نہ ہوتا تو سچ مانئے میں ضرور پاگل ہو جاتا۔ اس باہمّت انسان نے ایسے آڑے وقت میں میری ڈھارس بندھائی اور مُجھ سے کہا۔

"فیروز!۔۔ ہم جس مُصیبت میں گرفتار ہیں، اس سے بچ نکلنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم خُدا کی مدد سے کبھی اور کسی حالت میں بھی نااُمّید نہ ہوں۔ اس نے ابھی تک ہمیں زندہ رکھا ہے۔ اور یقیناً آئندہ بھی رکھے گا۔ اگر ہماری قسمت میں یہی شیفاؤں کی تکلیف دہ موت لکھی ہے تو پھر کُچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔"

بہت دیر کے سوچ بار کے بعد یہ طے پایا کہ ہم خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی شیفاؤں سے بچنے کا کوئی طریقہ بھی سوچیں۔ مگر طریقہ تو اس وقت سوچا جاتا جب کہ ہمیں شیفاؤں کے بارے میں پوری واقفیت ہوتی۔۔۔! بہر حال ہم نے یہ تہیّہ کر لیا کہ اس آفت سے کسی نہ کسی طرح نپٹیں گے ضرور۔ ہمیں اس آفت کے بارے میں شاید کبھی معلوم نہ ہوتا اگر ایک حیرت انگیز واقعہ پیش نہ آتا اور وہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ والٹر نے اچانک ہی یہ پکّا ارادہ کر لیا کہ وہ ان گول نشانوں کا تعاقب کرتا ہوا اس مقام تک ضرور جائے گا جہاں تک یہ گڑھے نظر آ رہے ہیں۔ ہم نے اس بہت منع کیا مگر وہ دُھن کا پکّا انسان اپنی ہٹ سے باز نہیں آیا۔ ہمارے بہت منع کرنے کے بعد بھی اس نے یہی جواب دیا۔

"میری ایک زندگی آپ جیسے اتنے لوگوں کے مقابلے میں قیمتی نہیں ہے،

مُجھے جانے دیجیے، خُدا نے چاہا تو میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔"

ہم بڑے شش و پنج میں تھے، آخر ہمیں اس کی ضد کے آگے جھکنا ہی پڑا۔ ایک پستول، گولیاں، ماچس اور ٹارچ اپنے ساتھ لیے وہ خُدا کا نام لے کر میدان میں اُترا اور ان گول نشانوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ہم یہ جانتے تھے کہ وہ جان بوجھ کر موت کے مُونہہ میں جا رہا ہے، مگر بالکل بے بس تھے۔ اس لیے کہ اگر وہ نہیں جاتا تو پھر ہم میں سے کوئی دوسرا اُس کی جگہ جاتا، آہستہ آہستہ وہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہمیں اب یہ پکّا یقین ہوگیا تھا کہ وہ گول گول گڑھے دراصل اس نامعلوم شیفا کے قدموں کے نشان ہیں جو رات کے اندھیرے میں ہمارے قیدیوں کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوا تھا۔ والٹر کو جاتے دیکھ کر جان کا دِل اس قدر پسیجا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"نہیں۔۔ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے۔"

والٹر جلد ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کہ دیکھئے پردۂ غیب سے اب کیا ظہور میں آتا ہے۔ اسے ہمارے پاس سے گئے ہوئے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے کہ ہمیں بائیں جانب سے وہی اژدہے کی پھنکار سُنائی دینے لگی۔ والٹر حالانکہ شمال کی سمت گیا تھا مگر یہ آواز اب مغرب کی سمت سے آرہی تھی۔ ہمیں تو یہ توقّع تھی کہ شاید شیفا رات میں ہی حملہ کریں گے۔ مگر اب دِن میں ان کی پھنکاریں سُنائی دینے کا یہی مقصد تھا کہ ان کے حملے کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔

جیکسن تو اُسی چٹّان پر موجود رہا مگر ہم لوگ بھاگتے ہوئے اپنے علاقے کی طرف آ گئے۔ زرینہ اور نجمہ بُری طرح ڈری ہوئی تھیں۔ ہاں البتّہ اختر اسی انداز میں بیٹھا ہوا تھا جیسے کہ اسے ان تمام باتوں سے کوئی سروکار ہی نہ ہو! جیک اور سوامی بے تابی کے ساتھ اس طرح دیکھ رہے تھے جہاں سے اب ایک غُبار سا اُٹھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور ساتھ ہی زمین بھی لرزتی

ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے مختصر لفظوں میں سوامی اور جیک کو وہ باتیں بتائیں جو کُچھ ہی دیر پہلے ہو چکی تھیں۔ میں نے ان دونوں کی آنکھوں میں مایوسی صاف طور سے دیکھ لی تھی اور اب اپنے وفاداروں کو نا اُمّید دیکھ کر میرا دِل بھی آپ ہی آپ بیٹھنے لگا تھا۔

کُچھ ہی دیر بعد آخر کار وہ خطرہ سامنے آ ہی گیا جس کے لیے ہم پریشان تھے اور کم از کم میں چاہتا تھا کہ وہ فوراً پیش آ جائے تاکہ جو کُچھ بھی ہونا ہے فوراً ہو اور ہمیں یوں گھُل گھُل کر مرنے سے نجات ملے۔ ہم نے دیکھا کہ مغرب کی سمت سے دس ویسے ہی دھوئیں دار غُبارے زمین پر گھسٹتے ہوئے ہماری طرف آ رہے ہیں، یہ غُبارے ایک بار زمین سے چھوتے تھے اور شاید ان کے چھونے سے ہی وہ گڑھے پیدا ہوتے تھے۔ اس کے بعد وہ پھُدک کر آگے بڑھ آتے تھے۔ یہ غبارے ایسے تھے جیسے کہ بچّے پانی کے بُلبُلے بنا کر ہوا میں چھوڑتے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ یہ بُلبُلے بہت بڑے تھے۔

اتنے بڑے کہ آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے اور ان بُلبُلوں کے اندر ہمیں کُچھ انسانی جسم نظر آ رہے تھے۔ جوں جوں وہ دھوئیں والے بُلبُلے قریب آتے جا رہے تھے، اژدہے جیسی پھنکاریں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ اب یہ بُلبُلے اتنے قریب آ چُکے تھے کہ میں انہیں صاف صاف دیکھ سکتا تھا اور پھر جو کُچھ بھی میں نے دیکھا، وہ میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا!

میں نے دیکھا کہ واقعی وہ صاف شفّاف غُبارے جیسی کوئی چیز ہے۔ اتنی صاف شفّاف کہ اُس کے آر پار ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ اِس غُبارے کے اوپر ایک بڑی بھیانک آنکھ تھی۔ جب وہ چیز زمین پر گھسٹتی تھی تو غُبارے کے نچلے حصّے میں لچک پیدا ہوتی تھی اور دو گول پیر نظر آتے تھے، یہی وہ دو پیر تھے جو زمین پر گڑھے پیدا کرتے تھے۔ زمین میں اپنے پیر گڑونے کے بعد وہ بے ہیبت چیز اچانک اُچھل کر آگے بڑھ آتی تھی اور یوں وہ پھنکار پیدا ہوتی تھی اور تب ہی گھسٹنے کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ

جس بات نے مُجھے سب سے زیادہ خوفزدہ کیا وہ دراصل قیدی تھے وہ غُبارے کے اندر اِس طرح ہاتھ لگائے کھڑے تھے جس طرح کُچھ لوگ شیشے کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی سطح کو دونوں ہاتھوں سے دبا لیں۔ قیدیوں کا جسم پیلا پڑا ہوا تھا اور مُجھے یوں محسوس ہوا گویا اُن کا گوشت بھی گل سڑ کر نیچے لٹکنے لگا ہے۔

"فیروز۔۔۔ کیا یہی وہ شیفا ہیں؟" جان نے بے جان آواز میں اچانک مُجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"تم ان قیدیوں کو دیکھ رہے ہو جو ان کے اندر مُجھے صاف نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"ان کے رنگ چھپکلی کے پیٹ جیسے ہو گئے ہیں اور ان کا گوشت بھی شاید گل رہا ہے!"

"ہاں۔۔ میں نے جواب دیا۔ "مگر اب یہ بتائیے کہ ان بلاؤں سے نمٹنے کا کیا طریقہ ہو؟"

"کوئی طریقہ نہیں۔۔۔ بس اب یہ دیکھو کہ یہ بلائیں کیا کرتی ہیں۔"

جان اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور جیک سوامی سے کُچھ باتیں کرنے لگا میں سمجھ گیا کہ شاید وہ دونوں بھی والٹر کی طرح اِن بلاؤں سے ٹکر لینے کے لیے چٹّان سے نیچے کُودنا چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً سوامی کو تنبیہہ کی کہ خبردار ایسا ہرگز نہ کرنا، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سوامی اور جیک میرے جاں نثاروں میں سے تھے اور وہ ہر خطرے کے موقع پر ہمیشہ میرے آگے آ جاتے تھے۔ لہٰذا اس وقت بھی انہوں نے میری اجازت کے بغیر ایسا کرنا چاہا تھا۔ مگر پھر میرے منع کرنے پر رُک گئے۔

بھیانک شیفا اسی انداز میں گھسٹے ہوئے اس چٹّان کے قریب آنے لگے جہاں جیکسن اپنے بچّے کھچے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا، چونکہ شیفا تعداد میں کل دس تھے اس لیے جیکسن گھبرا گیا اور ہماری طرف امداد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اپنے ساتھیوں کو لے کر یہیں آجاؤ۔ ۔ جلدی کرو۔ ۔" جان نے چلّا کر کہا۔

اور شاید جیکسن اسی بات کا منتظر تھا وہ اپنے چاروں ساتھیوں کو لے کر جلدی جلدی چٹّان سے نیچے اُترنے لگا۔ شیفا دیکھنے میں تو جان دار نظر نہیں آتے تھے۔ بس وہ اندر سے خول جیسے تھے اور اس وقت ہر خول میں ایک قیدی موجود تھا۔ اگر آپ خول کو شیفاؤں کا جسم یا معدہ کُچھ بھی سمجھ لیں تو بہتر ہے۔ میں کُچھ بتانے سے اس لیے مجبور ہوں کہ میں خود بھی آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کا جسمانی نظام کس طرح کام کرتا تھا۔ ان کا معدہ کہاں تھا اور مُونہہ کس طرف تھا۔ ۔ ؟ میں جیسا کہ پہلے بتا آیا ہوں بس وہ صرف بُلبُلے

جیسے تھے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ بُلبُلا اندر سے کھوکھلا ہوا کرتا ہے۔
لیکن اندر سے کھوکھلا جسم رکھنے والے یہ شیفا شاید سُونگھنے سمجھنے اور دیکھنے
کی قوّت ضرور رکھتے تھے۔ لہٰذا جیسے ہی جیکسن کود کر ہماری طرف آنے
لگا، شیفاؤں کا وہ رُخ ہماری طرف ہو گیا جس میں بھیانک اور سُرخ سی
ایک آنکھ پیوست تھی۔

وہ قیدیوں کو ہماری چٹّان پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے، اور ان کے
جسموں کے اندر کھڑے ہوئے قیدی ہمارے انجام سے بے خبر کسی
خوفناک اذیّت میں مُبتلا، بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے
کہ کسی طرح وہ اس خول سے باہر آ جائیں مگر انہیں یہ ناممکن ہی نظر آتا
تھا۔ ان کے کھال لٹک کر پھٹ چکی تھی اور جسم لہولہان ہو گئے تھے۔
یوں لگتا تھا جیسے اندر سے وہ بے جان ہو گئے ہوں۔ میرے دیکھتے دیکھتے
اُن میں سے ایک خول کے پیندے میں گر پڑا اور پھر یہ دیکھ کر تو میرے

رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ وہ قیدی اب پگھل رہا تھا۔ جیسے کہ وہ موم کا بنا ہوا ہو۔ وہ اتنی تیزی سے پگھلا کہ جلد ہی خول کے پیندے میں تھوڑا سا گاڑھا گاڑھا پانی جمع ہو گیا۔

اف میرے خدا۔۔۔۔ یہ انجام تھا ایک انسان کا!

میری روح تک لرز گئی اور میں حسرت بھری نظروں سے زرینہ اختر اور نجمہ کو دیکھنے لگا۔ کون جانے کہ ان کا بھی یہی حشر ہونے والا ہو! جان کے کہنے پر ہم سب نے اپنے اپنے پستولوں کو کام میں لاتے ہوئے شیفاؤں پر فائر کرنے شروع کر دیئے، مگر یہ گولیاں اُن کے غُبارے جیسے جسم سے آر پار گزر جاتی تھیں اور ان کا ذرا بھی بال بیکا نہ ہوتا تھا۔ ہاں البتّہ اتنا ضرور ہوا کہ گولیوں سے ان کی پیش قدمی کُچھ دیر کے لیے ضرور رُک گئی۔ جان کے حُکم پر ہم گولیوں کی دوسری باڑھ چلانے ہی والے تھے کہ اچانک نجمہ نے ایک بھیانک چیخ ماری اور اس طرف اشارہ کیا جدھر سے

ہم لوگ چند دِن پہلے ان چٹّانوں تک آئے تھے۔

کیا کہوں میں نے کیا دیکھا۔۔ میں نے دیکھا کہ مکڑآدمیوں کی پوری فوج کراما سمیت آہستہ آہستہ ہماری طرف آرہی تھی۔ حالانکہ وہ ہم سے ابھی بہت دور تھے مگر میں انہیں صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ کراما دو مکڑ آدمیوں کی کمر پر سوار تھا، اور جہاں تک میں اس وقت سمجھ پایا تھا وہ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے آیا تھا۔ اس کے خیال میں شیفا ہمیں کُچھ لمحوں کے اندر نگلنے ہی والے تھے، اور کراما اپنی حُکم عدولی کرنے والوں کے اس عبرتناک اور بھیانک انجام پر مسرّت کا اظہار کرنے کے لیے خود وہاں آرہا تھا۔

اچانک پھر میں نے دیکھا کہ کراما اور اس کی فوج کی پیش قدمی فوراً رُک گئی اور وہ گھبرا کر مشرق کی طرف گردن گھما کر دیکھنے لگا۔ اس کی فوج میں افراتفری مچنے لگی اور مکڑآدمی اس طرح سکڑنے لگے جیسے کسی سے بچنے

کے لیے کوئی دُبکنے کی کوشش کرتا ہے۔ مکّڑ آدمیوں کے ساتھ ہی میں نے شیفاؤں میں بھی ایک ہل چل محسوس کی۔ ان کی ایک ایک آنکھ بھی مشرق کی طرف سے کسی آنے والی بلا کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ اور پھر جیسے میرا دم ہی نکل گیا۔۔ ہاتھ پیر اچانک ٹھنڈے پڑ گئے اور دِل نے مُجھ سے یہی کہا کہ بس اب اللہ ہی حافظ ہے! ہم لوگ تین طرف سے گھِر چکے تھے۔۔ بائیں طرف شیفا تھے، پشت کی سمت مکّڑ آدمی اور دائیں طرف سے کاگی کی زندہ مگر آتشیں چٹّانیں آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی بالکل صاف نظر آ رہی تھی!

سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں اپنی اس قوّت کی حالت بیان کروں! میں نے بڑے برے خطروں سے ٹکر لی ہے، بڑی بڑی آفتوں سے دوچار ہوا ہوں، مگر اس وقت کی مُصیبت کُچھ ایسی ہی تھی کہ میں ناامیدی کے باعث

کچھ عجیب سے جانور اُن کا تعاقب کر رہے تھے

اپنا سر پکڑ کر دھب سے چٹّان پر بیٹھ گیا۔ جان کے بھی چھکّے چھوٹ گئے تھے۔ وہ بھی شش و پنج کی حالت میں چٹّان کا سہارا لیے کھڑا رہا اور کاگی کی زندہ چٹّانوں کو آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ زندہ آتشیں چٹّانیں لپٹیں اڑاتی ہوئیں ہماری طرف آرہی تھیں۔

اور کراما یقیناً اِن چٹّانوں کو اِس طرف آتے دیکھ کر ہی چونکا تھا۔ جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں، جیکسن ہی نے مُجھے بتایا تھا کہ کاگی کی زندہ چٹّانوں کے لیے متکّبر آدمیوں میں ایک مقناطیسی کشش ہے۔ مگر اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جیسے ہی چٹّانیں متکّبر آدمیوں کے قریب پہنچیں گی، وہ اپنی چونچ سے بدبودار لعاب اُن پر پھینکیں گے اور چٹّانیں پگھلنی شروع ہو جائیں گی۔ لیکن اگر اتّفاق سے کوئی چٹّان کسی متکّبر آدمی کے بہت زیادہ قریب پہنچ گئی تو پھر وہ دونوں فنا ہو جائیں گے۔

جیکسن کے کہے ہوئے یہ الفاظ سوامی نے بھی سُنے تھے اور سوامی پھر اِس

آڑے وقت میں اچانک ہمارے کام آیا، کیوں کہ اس سے پہلے کہ ہم میں
سے کوئی اُسے روک سکتا، اُس نے ایک جست لگائی اور چٹّان سے نیچے کود
گیا۔ ساتھ ہی وہ تیزی سے دوڑتا ہوا زندہ چٹّانوں کی طرف جانے لگا۔ سچ
مانیۓ، خوف کے مارے ہماری چیخیں نکل گئیں، کیوں کہ سوامی کی جان
ہمارے لیے بے حد قیمتی تھی۔ والٹر اسمتھ کو ہم اُس کے جنون کی وجہ سے
کھو چکے تھے اور اب سوامی محبّت اور وفاداری کے جذبے سے سرشار ہو
کر ہم سب پر نثار ہونے کے لیے بڑی بے خوفی سے موت کے مُونہہ میں
کود پڑا تھا۔

شیفاؤں کے غُبارے جیسے جسم ہِل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا گویا کاگی کی
زندہ چٹّانوں کو قریب آتے دیکھ کر اِن پر لرزہ طاری ہو گیا ہے۔ اِن کے
خول نما جسم بار بار پھول اور پچک رہے تھے، اب وہ ہماری طرف نہیں
بڑھ رہے تھے، بلکہ ایک ہی جگہ رُکے ہوئے اپنی بھیانک آنکھ سے

چٹّانوں کو دیکھ رہے تھے۔ رہے مکڑّ آدمی تو وہ برابر سہمتے اور سکڑتے رہے۔ وہ سب کے سب ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ البتّہ ان کے بھیانک چہروں پر اتنا زبردست خوف دکھائی دے رہا تھا جو میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ سوامی کو چٹّانوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر ان کا یہ خوف اور بڑھ گیا۔ کیوں کہ چٹّانوں کا رُخ پہلے ہماری طرف تھا۔ یعنی جس چٹّان پر ہم لوگ چھُپے ہوئے تھے، پہلے وہ اِسی طرف آ رہی تھیں، لیکن اب سوامی کو مکڑّ آدمیوں کی طرف کھڑے دیکھ کر وہ اپنی ہیبت ناک رفتار سے اسی سمت بڑھنے لگیں۔

سوامی ان سے صرف پندرہ بیس میٹر دور کھڑا ہوا تھا۔ چٹّانوں کے لیے مکڑّ آدمیوں میں تو کشش تھی ہی، لیکن سوامی کی موجودگی سے یہ کشش اور بڑھ گئی اور وہ تیزی سے سوامی کی جانب بڑھنے لگیں۔ سوامی نے تب ایک عجیب حرکت کی، وہ مکڑّ آدمیوں کی سمت اُلٹے قدم چلنے لگا۔۔۔ سوامی کا ارادہ

اب ہم سب کو معلوم ہوا، دراصل وہ چاہتا تھا کہ کاگی کی آتشیں چٹّانیں مکّڑ آدمیوں کی طرف متوجّہ ہو جائیں۔۔ ایسا بھی ہو گیا، مگر سوامی شاید یہ بھول گیا تھا کہ جب چٹّانیں اور مکّڑ آدمی آپس میں ٹکرائیں گے تو وہ دونوں بھسم ہو جائیں گے اور تب بے چارے سوامی کا جو حشر ہو گا وہ سب ہم اچھّی طرح جانتے تھے!

چٹّانیں اب مکّڑ آدمیوں سے صرف تیس میٹر دور تھیں اور سوامی ان دونوں کے درمیانی فاصلے پر کھڑا تھا، اچانک میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ سوامی نے ایک پھر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی، مگر اِس بار وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یوں لگتا تھا گویا زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں، اس نے ہاتھ ہلانے کی بھی کوشش کی مگر سب بے کار! میں بہت غور سے سوامی کو دیکھ رہا تھا اور پھر یہ دیکھ کر تو میری روح لرز گئی کہ سوامی گوشت پوست کے انسان سے آہستہ آہستہ

پتھرّ کے بت میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ ویسے ہی رنگ کے پتھرّ میں جس رنگ کی چٹّانیں تھیں۔۔ اور پھر چند لمحوں کے اندر اندر سوامی وہی پتھرّ کا بُت بن کر کھڑا رہ گیا۔

خوف اور دہشت کی وجہ سے زرینہ اچانک بیٹھ گئی اور نجمہ اس کی ڈھارس بندھانے لگی۔ میں ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے سوامی کا حشر دیکھ رہا تھا۔ میں کیا ہم سب ہی دیکھ رہے تھے۔ سوامی اب بالکل بے حس و حرکت اس مقام پر کھڑا رہ گیا تھا اور زندہ چٹّانیں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مکرّر آدمیوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ امجد اور جیک شاید ابھی تک اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی چٹّان سے نیچے کود جائیں اور سوامی کی مدد کو پہنچیں مگر اس کی مدد کرنا اب بے کار ہی تھا۔ مُجھے یقین تھا کہ سوامی اب کسی بھی طرح اپنی اصلی حالت میں نہیں آ سکتا۔ جیکسن نے بالکل ٹھیک کہا تھا، بد قسمتی سے اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا تھا کہ چٹّانوں کو چھونے سے انسان کا

کیا حشر ہوتا ہے؟ مگر کاش اسے معلوم ہوتا! اگر اسے معلوم ہوتا تو میں اپنے ایک بہترین جاں نثار سے اس طرح ہاتھ نہیں دھو سکتا تھا!!

جان شیفاؤں کو غور سے دیکھ جا رہا تھا، میں نے اسے اس سمت دیکھتے پا کر خود بھی شیفاؤں کو دیکھا۔ بڑے تعجّب کی بات تھی کہ شیفا پسپا ہو رہے تھے، ان کے غبارے جیسے جسم لرز اور سکڑ رہے تھے، ان کی ایک بھیانک آنکھ بار بار زندہ چٹّانوں کو دیکھ رہی تھیں، میں نے اندازہ لگایا کہ شیفا کسی نہ کسی طرح اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ مگر میں دِل سے چاہتا تھا کہ وہ وہیں موجود رہیں تاکہ میں ان کا انجام دیکھ سکوں! اور پھر والٹر اسمتھ کی تلاش میں جا سکوں۔ یہ حقیقت تھی کہ اس مُصیبت کے وقت بھی مُجھے والٹر کا خیال ضرور تھا۔ حالانکہ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ والٹر یقیناً اب تک گاڑھے گاڑھے پانی میں تبدیل ہو چکا ہو گا۔ مگر نہ جانے مُجھے کیوں یہ اُمّید تھی کہ والٹر ضرور واپس آئے گا۔ خواہ ہمارا انجام کُچھ ہی کیوں نہ ہو!

میں والٹر کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ جیک نے مُجھے ٹھوکا دیا اور ساتھ ہی مُجھ سے کہا کہ میں مکّڑ آدمیوں کی طرف دیکھوں، میں نے اُدھر گردن موڑی ہی تھی کہ دھماکوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ یہ دھماکے دراصل زندہ چٹّانوں کے مکّڑ آدمیوں کے قریب پہنچنے سے پیدا ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب ایک چٹّان مکّڑ آدمیوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچی تو وہ بُری طرح کپکپانے لگے۔ ان میں سے یکایک دھواں پیدا ہوا، چٹّانوں کی آتشیں لہریں بڑھ گئیں اور پھر ایک زبردست دھماکہ پیدا ہوا۔۔۔ مکّڑ آدمیوں کی ایک ٹولی میں کل دس مکّڑ آدمی تھے اور چٹّان محض ایک۔۔ مگر اب نہ وہ چٹّان موجود تھی اور نہ وہ ٹولی۔ دونوں جگہوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، جیکسن کی یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی تھی کہ جب بھی کوئی زندہ چٹّان مکّڑ آدمی کے قریب آئے گی تو چونکہ دونوں میں کاگی کی مقدار کافی ہے لہٰذا وہ دونوں بھڑک اٹھیں گے اور اس طرح ان کا خاتمہ ہو

جائے گا۔

البتّہ ایک بات میں نے اس وقت کہی تھی کہ میں کوشش کروں کہ مکّڑ آدمیوں کی چونچ سے لعاب نہ نکلے (کیوں کہ چٹّانیں اس لعاب سے ڈرتی تھیں) مگر افسوس ہے مُجھے اس کا موقع ہی نہ مل سکا، میں نے سوچا یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح مکّڑ آدمیوں کی چونچیں کسی مضبوط رسّی یا تار کی مدد سے جکڑ دوں گا۔۔۔کیسے جکڑ دوں گا؟ یہ تو وقت ہی بتاتا۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ مُجھے اس کا موقع ہی نہ مل سکا اور مکّڑ آدمی اپنے آپ ہی مرنے لگا۔

کراما بہت زیادہ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا اور اب ان مکّڑ آدمیوں کی کمر پر سے اتر آیا تھا جن پر وہ پہلے سوار تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھ میں خُون اُترا ہوا ہے۔ اس نے اُسی آنکھ سے ہم سب کو دیکھا اور پھر بجلی کی سی

تیزی سے ہماری طرف آنے لگا۔ پہلے تو میری سمجھ میں کُچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ مگر اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے دماغ میں آگیا اور پھر میں نے چلّا کر کہا۔

"سب ہوشیار ہو جائیں۔۔ وہ مردود کراما اسی طرف آرہا ہے۔"

"مگر۔۔۔ مگر اس کا ارادہ کیا ہے؟" امجد نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں سمجھ چکا ہوں کہ اُس کا ارادہ کیا ہے۔" جان نے غُصّیلے لہجے میں کہا۔ "وہ چاہتا ہے کہ ہمارے قریب رہے تاکہ زندہ چٹّانیں اِس طرف کا بھی رُخ کریں۔ کراما خود تو ختم ہو گا ہی مگر ساتھ ہی ہمیں بھی سوامی کی طرح پتھرّ کا بنوا دینا چاہتا ہے۔"

"لیکن اگر ہم کراما پر اپنے پستولوں کی گولیاں ختم کر دیں تب وہ ایسا کس طرح کر سکے گا؟" جیک نے پوچھا۔

"ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔۔۔"جیکسن نے جلدی سے کہا۔"کراما سب سے زیادہ خطرناک ہے، میں جانتا ہوں وہ گولیوں سے نہیں مرے گا۔"

"پھر۔۔پھر کس طرح مرے گا؟" جان نے پوچھا۔

"اِس کم بخت نے ایک خاص قسم کی کھال اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھی ہے، آپ گولی چلا کر دیکھ لیجئے۔ وہ اِس پر اثر نہیں کرے گی۔ یہ بات اُس نے مُجھے اس وقت بتائی تھی جب میں پہلی بار اس کے سامنے ایک قیدی کی حیثیت سے پیش ہوا تھا۔"

"ارے بھئی، تو پھر جلدی سے بتاؤ نا یہ کم بخت کس طرح مرے گا؟" جان جھنجھلا گیا۔

"اُس کے کہنے کے مطابق اُس کے سر پر ایک گول لیکن ہلکے سُرخ رنگ کا گڑھا ہے، اگر کسی طرح اِس گڑھے میں خنجر بھونک دیا جائے تو کراما مر

سکتا ہے۔" جیکسن نے جواب دیا۔

دراصل جیکسن نے بالکل الف لیلہ والی کہانی سُنائی تھی۔ یعنی بالکل ایسی ہی جیسی شہرزاد بادشاہ کو سناتی ہے کہ اے بادشاہ دیو بولا کہ فلاں پہاڑ کے فلاں غار میں ایک طوطا ہے اور طوطے کی دُم میں میری جان ہے، کوئی اگر اس کی دُم اکھیڑ لے تو میں مر سکتا ہوں۔

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر چہ جان لبوں پر تھی، مگر جیکسن کی یہ بات سُن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ مُجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا، اس نے شاید یہ بات محسوس کرلی اور بولا۔ "یقین کیجیے فیروز صاحب! کراما نے خود ہی یہ بات مُجھے بتائی تھی اور پھر دعویٰ کیا تھا کہ اگر مُجھ میں یا میرے ساتھیوں میں ہمّت ہے تو وہ اسے ختم کر کے دکھائیں۔"

جان نے اس بحث میں حصّہ لیتے ہوئے ہمیں زیادہ باتیں کرنے سے منع

کیا اور پھر موقع کی نزاکت کی طرف ہماری توجّہ دلائی۔ کراما اب ہمارے قریب آچکا تھا، اس کی سُرخ آنکھ میں ہمارے لیے حقارت چھُپی ہوئی تھی، اور غُصّے کے باعث وہ کپکپا رہا تھا، کیوں کہ یہ تمام آفت دراصل ہماری ہی وجہ سے آئی تھی۔ نہ وہ ہمیں شیفاؤں کی خوراک بننے کے لیے اِس جگہ بھیجتا اور نہ یہ مُصیبت اس پر اور اس کے ساتھیوں پر نازل ہوتی۔

ہم جس چٹّان پر کھڑے تھے، کراما اُس سے کافی نیچے تھا، اور پھر ہم نے جو سوچا تھا وہی ہوا، کراما کی بُو سونگھ کر یا پھر مقناطیسی کشش کی وجہ سے ایک زندہ چٹّان ہماری طرف بھی بڑھنے لگی۔ چٹّان کو اِدھر آتے دیکھ کر شیفا ویسی ہی اژدہے جیسی پھنکار نکالتے ہوئے اُس طرف جانے لگے جہاں اُن کے گول پیروں کے نشان ختم ہوتے دکھائی دیتے تھے، البتّہ کراما اسی جگہ پر جما رہا اور زندہ چٹّانوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا رہا۔

جان کا خیال بالکل درست تھا، کراما چاہتا تھا کہ چٹّانیں اِس طرف کا رُخ

کریں اور ہمیں سوامی کی طرح پتھرّ کا بنا دیں، میں نے جب یہ بات سب کو بُلند آواز میں بتائی تو امجد سے نہ رہا گیا اور اُس نے چلّا کر کہا۔ "نہیں۔۔۔ میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ میں اسے ختم کر دوں گا۔"

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اُسے روکتا، وہ ایک چھلانگ مار کر چٹّان سے نیچے کود چکا تھا، جیسے ہی وہ کودا ایک دِل دوز چیخ وہاں گونجی۔ میں نے دوڑ کر نجمہ کو پکڑ لیا، کیوں کہ یہ چیخ اُسی کی تھی اور وہ بھی امجد کے پیچھے پیچھے نیچے کودنا چاہتی تھی۔ چٹّان کو کراما تک پہنچنے میں ابھی کافی وقت درکار تھا اور امجد شاید اسی وقت سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ جیک نے جلدی سے اپنا پستول نکال کر کراما پر گولی چلانا چاہی، مگر اب امجد کراما کے نزدیک پہنچ چکا تھا، لہٰذا گولی چلانے کا وقت نہیں تھا۔ جان نے چلّا کر اُسے ایسا کرنے سے روکا اور جیک نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا۔

نجمہ لگاتار چیخ رہی تھی اور میرے ساتھ ہی زرینہ بھی اُسے قابو میں کرنے کی

کوشش کر رہی تھی۔ میں امجد کی بہادری کا قائل تھا۔ لہٰذا اُسی جگہ کھڑا ہوا یہ دیکھنے لگا کہ امجد کرتا کیا ہے؟ کراما اسے قریب پا کر ایک لمحہ کے لیے تو بوکھلا گیا، لیکن پھر اچانک وہ آٹھ ٹانگوں پر سختی سے جم گیا اور ایسا کرنے سے وہ زمین سے کافی اوپر اُٹھ گیا۔ امجد دیوانوں کی طرح اس کے چاروں طرف پھر رہا تھا۔ بالکل یوں لگتا تھا گویا دو پہلوان ایک دوسرے پر وار کرنے سے پہلے پینترے بدل رہے ہوں۔ جس طرف امجد پہنچتا کراما بھی فوراً اسی طرف گھوم جاتا۔ اُس کی چونچ سے گاڑھا گاڑھا لعاب نکل رہا تھا اور چونچ بار بار کھل کر بند ہو رہی تھی۔

میں بے بسی سے اوپر کھڑا ہوا یہ لڑائی دیکھ رہا تھا اور دِل میں یہ تہیّہ کیے ہوئے تھا کہ جیسے ہی امجد کو پسپا ہوتے یا خطرے میں گھِرے ہوئے دیکھوں گا خود بھی اُس کی مدد کے لیے نیچے کود پڑوں گا۔ امجد قد میں کراما سے بہت چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ کیوں کہ اپنی ٹانگوں پر سختی سے جم جانے کے بعد

کراما اور بھی اونچا ہو گیا تھا۔ امجد شاید چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اُس کی کمر پر سوار ہو جائے اور غالباً اِس وقت کراما کو ختم کرنا آسان بھی ہو جاتا۔ مگر مُشکل یہ تھی کہ امجد کو یہ بالکل معلوم نہ کہ کراما کا کون سا حصّہ نازک ہے اور وہ کسی جگہ خنجر مارنے سے ختم ہو سکتا ہے!

امجد جب بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا، کراما فوراً لپک کر اس کی طرف بڑھتا، میں جانتا تھا کہ امجد کسی بھی طرح اس کی کمر پر سوار نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے میں نے چلّا کر امجد سے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، امجد۔۔ زمین پر پڑے ہوئے درخت کی وہ لمبی سی ٹہنی اُٹھا لو جو تمہارے بائیں طرف پڑی ہے۔۔ پھر دور سے دوڑتے ہوئے آؤ اور بڑی چھلانگ لگانے والے کھلاڑیوں کی طرح اُچھل کر اس مردود کی کمر پر سوار ہو جاؤ۔"

خُدا کا شُکر ہے کہ امجد نے میری بات سُن لی اور اس نے وہی کیا جو میں چاہتا تھا جیسے ہی اس نے چار فٹ لمبی ٹہنی اٹھائی کراما نے اپنی چونچ کا لعاب

اس کی طرف پھینکا، یہ لعاب دراصل وہی جالا تھا جو اس سیّارے پر آتے
ہی منحّرٓ آدمیوں نے ہمیں گرفتار کرتے وقت ہم پر پھینکا تھا۔ امجد شاید
جالے میں پھنس گیا ہوتا، اگر اتّفاق سے اس نے کراما کی یہ حرکت دیکھ نہ
لی ہوتی۔ کراما نے دو تین بار ایسا ہی کیا۔ مگر امجد ہر بار جھکائی دے کر نکل
جانے سے صاف بچ گیا۔ اور پھر اس نے میرے کہنے کے مطابق دور
سے بھاگنے کے بعد ایک لمبی چھلانگ لگائی اور فوراً کراما کی کمر پر سوار ہو گیا۔
کراما کی ٹانگیں چونکہ نیچے کی طرف جھُکی ہوئی تھیں اس لیے وہ کسی بھی طرح
امجد کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے مگر امجد کو دبوچنے
میں ناکام رہا۔ امجد کو تو صرف موقع کا انتظار تھا اور یہ موقع ملتے ہی اس نے
اپنا خنجر کراما کی پیٹھ میں جگہ جگہ اُتارنا شروع کر دیا، اتنے حملوں کے باوجود
جب کراما ذرا بھی نہ ڈگمگایا تو جیکسن اب خاموش نہ رہ سکا اور اُس نے چلّا کر
امجد کو وہ ہدایت دی جو وہ کچھ دیر پہلے مجُھے بتا چکا تھا۔

کراما نے جیکسن کی آواز سُن لی اور اب پہلی بار گھبرا کر اس نے خود کو ہلانا جُلانا شروع کر دیا، وہ بار بار اپنی کمر کو جھٹکے دے رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح امجد نیچے گر پڑے، مگر امجد نے بڑی مضبوطی سے اُس کی کمر کے بال بائیں ہاتھ سے پکڑ رکھے تھے اور دائیں ہاتھ والے خنجر کو اب وہ کراما کے سر کے گول اور ہلکے سُرخ رنگ کے گڑھے میں داخل کرنا چاہتا تھا، بڑے زبردست دھماکے سُنائی دے رہے تھے۔ کافی فاصلے پر متحرّک آدمی اور زندہ چٹّانیں ایک دوسرے سے مل کر آواز پیدا کر رہی تھیں، میدان تقریباً صاف ہو چکا تھا، صرف کراما باقی رہ گیا تھا اور ایک وہ چٹّان جو اب کراما سے تقریباً پندرہ میٹر دور تھی اور کھسکتی ہوئی لگاتار آگے ہی آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

اچانک مُجھے کراما کے بدن سے دھواں سا اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ خنجر نے اپنا کام کر دیا تھا اور کراما تھر تھرا رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں، چونچ پوری

طرح کھل گئی تھی وہ ڈگمگا رہا تھا، ایک بار جیسے ہی وہ ڈگمگایا تو امجد سمیت بائیں طرف گِر گیا مگر گِرا اِس طرح کہ کراما نے اپنی ٹانگوں میں امجد کو جکڑ لیا اور پھر اپنی چونچ سے امجد کی بوٹیاں نوچنے لگا۔ ہم لوگ کراما کو مرتے دیکھ کر اتنے خوش تھے کہ نجمہ کی طرف سے ہمارا ذہن بھٹک گیا تھا اور اُس موقع کو غنیمت جان کر ہی نجمہ نے بھی تیزی سے چٹّان سے چھلانگ لگا دی تھی، ہمیں ہوش تو اس وقت آیا جب وہ دوڑتی ہوئی کراما کے نزدیک پہنچ کر امجد کو اُس کے چنگل سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے لگی، ہم لوگ بھی اس کی مدد کی خاطر نیچے اترنے ہی والے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ امجد نے تھوڑی سی جدوجہد کرنے کے بعد خود کو کراما کی گرفت سے آزاد کرا لیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑ کھینچنے میں نجمہ بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔

امجد بُری طرح خون میں نہایا ہوا تھا اور اُس کی کمر اور رانوں سے کافی گوشت غائب تھا۔ کراما سے زور آزمائی کے بعد وہ غالباً اِس قدر نیم جاں ہو گیا تھا کہ

فوراً زمین پر گر پڑا۔

اب ہم نے اس کی طرف جانا ضروری سمجھا، چٹّان سے اُتر کر جیسے ہی نیچے آئے تو ہم نے دیکھا کہ زندہ چٹّان کراما سے بہت قریب آ چکی تھی۔ جیکسن نے چلّا کر مُجھ سے کہا کہ میں نجمہ اور امجد کو وہاں سے اُٹھا کر زندہ چٹّان سے دور لے جاؤں، کیوں کہ چٹّان اور کراما کے آپس میں ملنے سے دھماکہ پیدا ہو گا اور شُعلے کافی دور تک پھیلیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کراما کے قریب رہنے پر امجد اور نجمہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے، جیکسن نے بر وقت ایک عمدہ بات سوچی تھی۔ لہٰذا جیک اور دوسرے چند قیدیوں کی مدد سے ہم نے امجد کو کراما کے پاس سے اُٹھا لیا اور نجمہ سے بھی ہمارے قریب پہنچنے کے لیے کہا۔

نجمہ جب چلنے لگی تو اُس نے جلدی سے جھُک کر زمین پر سے کوئی چیز اُٹھا لی اور پھر اسے اپنے گلے میں پہن لیا، پہلے تو میری سمجھ میں کُچھ نہیں آیا کہ وہ کیا چیز تھی؟ مگر بعد میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ لڑکیوں کو نت نئے ہار

پہننے کا شوق ہوتا ہی ہے، اس لیے وہ بھی ایسا ہی کوئی ہار ہو گا۔ کراما کے پنجوں کے نشانات نجمہ کے بدن پر بھی موجود تھے، لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے جتنے امجد کے جسم پر تھے۔ امجد کا خون اتنا نکل چکا تھا کہ اب وہ بے ہوش ہوا ہی چاہتا تھا۔

جان جلدی سے امجد کے زخموں کو دیکھنے لگا اور زرینہ نے نجمہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر وہ دونوں بھی امجد کی تیمارداری کرنے لگیں۔ اختر البتّہ اسی طرح تمام باتوں سے بے پروا ایک ہی سمت میں گھورتا رہا۔ ادھر ہم اس دھماکہ کے منتظر رہے جو زندہ چٹّان اور کراما کے ملنے سے پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ مگر کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی ایسا کوئی دھماکہ سُنائی نہیں دیا۔ میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا جِدھر کراما مرا پڑا تھا۔ مگر پھر یہ دیکھ کر میرا رواں رواں لرز گیا کہ چٹّان کراما کی طرف نہیں بلکہ اب ہماری ہی طرف بڑھ رہی ہے۔

یہ نئی مُصیبت تھی۔ اب میں جان چُکا تھا کہ چٹّان کے قریب آنے کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا؟ سوامی کی طرح ہم سب بھی پتھرّ کے ہوجائیں گے۔ مگر پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کراما کو چھوڑ کر وہ چٹّان ہماری طرف کیوں بڑھنے لگی تھی؟ بات معمولی سی تھی، لیکن میرا دماغ اس وقت اتنا خراب تھا کہ فوراً ہی کُچھ نہ سوچ سکا، کراما اب مر چکا تھا۔ لہٰذا وہ کاگی بھی مر چکی تھی جو اس کے جسم میں موجود تھی۔ چٹّانیں زندہ متحرّک آدمیوں کا ہی پیچھا کرتی تھیں۔ مُردہ کا نہیں۔ میری طرح شاید جان نے بھی یہ بات سوچ لی تھی۔ لہٰذا اس نے بُلند آواز میں کہا۔

"سب لوگ اِن چٹّانوں پر پہنچنے کی کوشش کریں جہاں ہم کُچھ دیر پہلے کھڑے تھے۔"

جان کا کہنا مان کر جیسے ہی ہم نے پلٹ کر پیچھے جانا چاہا، ہمارے قدم وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔ جو کُچھ بھی ہم نے دیکھا۔ اس سے ہمارے ہوش

اُڑ گئے۔ تین زندہ چٹّانیں ہماری پُشت کی طرف سے بھی اب آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہی تھیں اور پھر اِس حقیقت نے تو ہماری رہی سہی ہمّت بھی توڑ دی کہ دس بارہ زندہ چٹّانوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور ہم ان کے گھیرے کو توڑ کر کسی بھی طرح نہیں بھاگ سکتے۔

نا اُمّیدی اور بے اندازہ رنج کے باعث جیک زمین پر بیٹھ گیا اور غُصّے کی حالت میں زمین پر مُکّے مارنے لگا۔ آتشیں چٹّانوں سے بچنے کا کوئی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ لہٰذا ہم نے زرینہ، اختر، امجد اور نجمہ کو بیچ میں لے لیا اور پھر چٹّانوں کی طرف مُونہہ کر کے ایک دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے۔ چٹّانیں ہم سے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ قریب اور قریب۔۔۔ بہت ہی قریب!

میں سمجھ چکا تھا کہ بس اب زندگی کا چراغ بُجھنے ہی والا ہے۔۔ صرف چند لمحے اور ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور پھر اِس کے بعد موت کے بھیانک پنجے ہوں گے اور ہمارے گلے۔ میں نے بے بسی کے عالم میں ایک آخری نظر اپنی بیوی اور بچّوں پر ڈالی اور پھر آنکھیں بند کر کے آنے والی موت کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

اچانک مُجھے دھب سے ایک آواز سُنائی دی، اور میں نے دیکھا کہ میرے برابر کھڑے ہوئے دو قیدی اس صدمے کی تاب نہ لا کے بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑے۔ اُن کے گِرتے ہی نجمہ نے گھبرا کر چٹّانوں کی طرف دیکھا جو اب اس حلقے کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ یکایک اِس سمت والی زندہ چٹّان چلتے چلتے رُک گئی۔ میں نے دیکھا کہ چٹّان میں تھرتھری سی پیدا ہو گئی، اُس میں سے نکلنے والی آتشیں لہریں فوراً ہی دھویں میں تبدیل ہونے لگیں۔ چٹّان کا سُرخ رنگ بالکل سفید راکھ جیسا ہو

گیا، شُوں سے ایک آواز آئی اور وہ چٹّان اُسی مقام پر جم کر رہ گئی!

جان نے شاید کوئی بات نوٹ کی تھی، لہٰذا وہ نجمہ سے بولا۔ "نجمہ بیٹی! غالباً تمہارے جسم میں کوئی خاص چیز ہے جس کے باعث یہ چٹّان بے جان ہو گئی ہے۔ لہٰذا تُم فوراً اِس حلقے کے باہر آ جاؤ اور باری باری ہر چٹّان کی طرف مُونہہ کر کے کھڑی ہوتی جاؤ۔"

نجمہ میرے ساتھ پچھلے ایک سفر میں نہایت بھیانک اور لرزہ خیز واقعات سے دو چار ہو چُکی تھی۔ لہٰذا اب وہ ڈرپوک نجمہ نہیں رہی تھی۔ جان کا کہنا مان کر وہ جلدی سے دائرے کے باہر آ گئی اور ہر آگے بڑھنے والی چٹّان کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔ مُجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجّب ہوا کہ اب سب ہی چٹّانوں میں تھرتھری پیدا ہونے لگی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگیں۔ جان نے نجمہ کو اور ہدایات دیں، اس نے کہا کہ نجمہ ہر چٹّان کے قریب پہنچنے کی کوشش کرے اور ڈرے بالکل نہیں۔

شاید خُدا کو ہمیں زندہ رکھنا مقصود تھا، جو نجمہ میں اتنی ہمّت اور بے خوفی پیدا ہو گئی، کیوں کہ اس نے جان کی ہر بات مانی اور نتیجے کے طور پر بارہ کی بارہ چٹّانیں کُچھ ہی دیر میں بالکل بے جان ہو کر رہ گئیں۔ احتیاطاً ہم نے چٹّانوں کے پاس جا کر اور انہیں چھُو کر بھی دیکھ لیا، مگر اب وہ بالکل ہی مُردہ تھیں۔ ہم حیران تھے کہ آخر یہ معجزہ ہوا کیسے؟ اور پھر جلد ہی میری حیرت دور ہو گئی۔ نجمہ نے بتایا کہ یہ سب کُچھ آفاقی ہار کا کرشمہ ہے۔ وہی آفاقی ہار جو سیّارہ زہرہ سے وہاں کے سائنس داں نے ہمارے دوسرے سفر کے دوران بھجوایا تھا اور جس کے دانوں میں زبردست قوّت پوشیدہ تھی۔ نجمہ نے بتایا کہ جب وہ مکڑ آدمیوں کی قید میں تھی تب اس نے یہ ہار اپنے کپڑے میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔ شاید وہ اب بھی ظاہر نہ ہوتا اگر نجمہ امجد کو بچانے کی خاطر مرتے ہوئے کراما کے نزدیک نہ پہنچتی۔ وہیں پر یہ ہار اُس کے کپڑوں میں سے نکل کر گِر پڑا تھا اور جلدی میں اس نے یہی بہتر سمجھا

تھا کہ دوبارہ کپڑوں میں رکھنے کی بجائے اسے گلے میں پہن لے۔

نجمہ کو یہ بات کس طرح سوجھی۔۔ میں تو اب بھی اسے خُدا کی طرف سے بھیجی گئی مدد ہی سمجھتا ہوں!

چٹّانیں ختم ہو چکی تھیں، شیفا بھاگ چکے تھے اور مکڑّ آدمیوں کی قوم تباہ ہو چکی تھی۔ اس بھیانک سیّارے پر ہم اب بالکل اکیلے تھے۔ بہت دیر تک ہم آپس میں صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ آخر یہ طے پایا کہ ہمیں اب سیّارے کو چھوڑ دینا چاہیئے اور پھر جلد سے جلد اپنی اصل منزل یعنی زہرہ کی طرف روانہ ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ہمارا ایک بہترین آدمی اور لاجواب سائنس داں والٹر کسی نامعلوم جگہ پر شیفاؤں کو تلاش کرنے گیا تھا۔ ہمیں اس کا بھی انتظار تھا۔ والٹر کا جب ذکر چلا تو جیکسن نے کہا۔

"میرے خیال میں اب وہ نہیں آئیں گے اور یقیناً وہ شیفاؤں کی غذا بن

گئے ہوں گے۔"

"مگر انہیں ڈھونڈنا ہمارا فرض ہے، آخر وہ ہمارے ساتھی تھے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن اسے ڈھونڈے گا کون؟" جان نے کہا۔ "اور پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ جو اسے ڈھونڈنے جائے وہ خود بھی صحیح سلامت واپس آ جائے گا؟"

"کچھ بھی ہو۔ ہمیں یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

میری بات سب نے مان لی۔ اور پھر جیکسن کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ شیفاؤں کے علاقے میں جائے اور والٹر کو تلاش کرے۔ اسے کافی سے زیادہ اسلحہ بھی دے دیا گیا اور ہدایت کی گئی

کہ خطرے کی بُو سونگھتے ہی وہ تیزی سے واپس آ جائے۔ اُسے بتا دیا گیا کہ ہمارا راکٹ کس سمت میں کھڑا ہوا ہے۔ جیکسن نے سب باتیں غور سے سُننے کے بعد ہم سب سے رخصتی ہاتھ ملایا اور پھر اس طرف روانہ ہو گیا جدھر والٹر گیا تھا۔

امجد کے جسم پر پٹّیاں باندھ دی گئی تھیں، چند قیدیوں نے اُسے اپنے کاندھوں پر سوار کر لیا تھا۔ اور ہم لوگ اب اپنے راکٹ کی سمت جا رہے تھے۔ اُدھر جانے کے لیے ہمیں اس مقام سے ضرور گزرنا پڑتا جہاں سوامی پتھرّ کا بُت بنا کھڑا تھا۔ ہم پتھرّ کے سوامی پر اپنے آنسوؤں کے ہار چڑھانا چاہتے تھے۔۔ اِس وفادار سوامی پر جو ہمیشہ اور ہر وقت ہم پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیّار رہتا تھا اور آخر نثار ہو ہی گیا۔ سوامی کا خیال کرتے ہی جیسے میں نے اس کی پتھرّ کی مورتی کو دیکھا تو خوف اور مسرّت کے ملے جلے جذبات کے باعث میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں

دوڑتا ہوا اس طرف بڑھا جدھر سے سوامی ہماری طرف آ رہا تھا۔

جی ہاں سوامی زندہ تھا! اور مُجھے یقین ہے کہ اس کی زندگی آفاقی ہار کی بدولت ہی اُسے واپس ملی تھی۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر سب نے باری باری اُسے چھُو کر دیکھا۔ وہ اب گوشت پوست کا سوامی تھا۔ جب ہم نے اس سے دریافت کیا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا تو وہ الٹا ہمیں سے پوچھنے لگا کہ اُسے کیا ہوا تھا؟ اُس نے بتایا۔ "میں کہہ نہیں سکتا کہ کیا بات ہوئی تھی بس مُجھے یوں لگا تھا گویا اچانک میں خوابوں کی وادی میں پہنچ گیا ہوں۔ مُجھے ہر طرف دُھند ہی دُھند دکھائی دینے لگی تھی اور پھر میں سو گیا تھا۔ جب میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ آپ سب میری ہی طرف آ رہے ہیں۔ لہٰذا میں بھی آپ کی جانب بڑھنے لگا۔"

جان کے خیال کے مطابق آتشیں چٹانوں کے مرتے ہی اس کا پتھرّ کا جسم دوبارہ گوشت پوست میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ سوچنے کی سمجھنے کی قوّت

اس میں پھر سے پیدا ہو گئی تھی اور وہ زندہ ہو گیا تھا۔ راستے بھر ہم والٹر اور جیکسن کے بارے میں ہی باتیں کرتے ہوئے راکٹ تک آئے۔ ہمارا راکٹ اسی طرح کھڑا ہوا تھا اور زندہ چٹانوں نے یا کسی اور چیز نے اسے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ راکٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد جان نے تمام آلات کا دوبارہ معائنہ کیا۔ ہر پرزہ اپنی جگہ درست تھا اور ایک خاص بٹن دباتے ہی راکٹ کسی بھی وقت اڑنے کے لیے تیّار تھا۔

اختر نے راکٹ میں آنے کے بعد ہمیں ذرا توجّہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ چونکہ کراما مرچُکا ہے، لہٰذا اب یہ کتاک نامی شے بالکل بے کار ہے۔ کتاک تو دراصل کراما کے سر پر بنے ہوئے تاج کی لہروں کا غلام تھا۔ وہ تاج جب کراما کے ختم ہونے سے بے کار ہو گیا تھا تو کتاک کو بھی اصولاً ناکارہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ جیک نے اختر کی حالت دیکھ کر اس کی نگرانی کا کام اپنے ذمّہ لے لیا۔ پھر ہم سب اپنے اپنے کیبنوں میں بیٹھ کر

کھڑکیوں کے اندر سے اس مقام کی طرف دیکھنے لگے جِدھر سے جیکسن اور والٹر کو آنا تھا۔ مگر لگاتار دو دِن تک انتظار کرنے کے باوجود ان میں سے کوئی اِدھر آتا ہوا دکھائی نہ دیا۔

ہم لوگ نااُمّید ہو گئے تھے اور اب یہ مشورہ کرنے لگے تھے کہ کیا ہمیں اِن لوگوں کے بغیر ہی راکٹ کو اُڑا دینا چاہیئے؟ زیادہ لوگ اِسی بات کے حق میں تھے اور جان کو مجبوراً ان کا کہنا مان کر راکٹ کو اُڑانے والا بٹن دبانے کے لیے اپنا ہاتھ اس طرح بڑھانا ہی پڑا۔ بٹن دبنے ہی والا تھا کہ سوامی نے چیخ کر ہمیں بتایا کہ وہ لوگ آ رہے ہیں۔ ہم نے جلدی سے کھڑکیوں میں سے باہر جھانکا۔ کافی دُور کے فاصلے پر ہمیں تین انسان راکٹ کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ یقیناً وہ جیکسن اور اُس کے ساتھی تھے لیکن وہ اتنی بے تابی اور عجلت کے ساتھ کیوں دوڑ رہے تھے؟

جلد ہی یہ بات بھی ظاہر ہو گئی۔ اِن تینوں کا تعاقب دراصل کُچھ عجیب قسم

کے ہیبت ناک جانور کر رہے تھے۔ یہ جانور ٹانگوں اور دھڑ سے تو بالکل ہرن معلوم ہوتے تھے مگر ان کی گردنیں اونٹ جیسی اور اتنی ہی لمبی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اِن گردنوں پر شیر جیسا سر لگا ہوا تھا۔ میں نے تو لفظی تصویر کھینچ دی ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ وہ کتنے بھیانک اور ہیبت ناک دکھائی دیتے ہوں گے؟ ہرن کے مقابلے میں اِن کی رفتار بہت ہلکی تھی، اور وہ بار بار اپنی لمبی گردنوں کو آگے بڑھا کر بد نصیب جیکسن اور اس کے ساتھیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جیکسن اب راکٹ کے کافی قریب آ چکا تھا۔ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے اور اس کے جسم پر خراشیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ شیر جیسے مُونہہ نے یقیناً اسے بھنبھوڑنے کی کوشش کی ہو گی اور یہ خراشیں تب ہی پیدا ہوئی ہوں گی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جیکسن کے ایک ساتھی نے ٹھوکر کھائی، اور مُونہہ کے بل زمین پر گِر پڑا۔ وہ درندے، جو

اب تعداد میں آٹھ دکھائی دے رہے تھے فوراً اُس پر ٹوٹ پڑے اور ایک لمحہ ہی میں انہوں نے اس کی تِکّا بوٹی کر دی۔ جیکسن اب پوری قوّت سے دوڑ رہا تھا اور جیکسن کو بھاگتے دیکھ کر درندوں نے دوبارہ اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا تھا۔ جیکسن اب قریب آچکا تھا اور سوامی نے جان کے حُکم کے مطابق راکٹ کی سیڑھی نیچے لٹکا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اور جیک پستول لیے ہوئے راکٹ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے۔

جیکسن اور اس کے ایک ساتھی نے سیڑھی پر جلدی جلدی چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اتنی دیر میں جیک ہوائی فائر کرتا رہا۔ وہ بھیانک درندے فائر کی آواز سُن کر ذرا ٹھٹھک گئے۔ میں نے ایک گولی ماری بھی، مگر گولی اُس پر لگی اور اُچٹ کر کسی اور طرف چلی گئی۔ دہشت کے باعث میرا ہاتھ لرزنے لگا اور نشانہ خطا ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے جیکسن کو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ مگر

اتنی ہی دیر میں ایک درندے نے جھنجھلا کر نیچے لٹکی ہوئی سیڑھی پر حملہ کر دیا۔ جیکسن کا دوسرا ساتھی ابھی سیڑھی پر ہی تھا کہ درندے سے اسے دبوچ لیا۔

اچانک ایک زبردست شور سُن کر میں چونک اٹھا۔ لیکن یہ شور دراصل ایک راکٹ کا تھا۔ جان نے غالباً پرواز والا بٹن دبا دیا تھا اور ہمارا راکٹ اب آہستہ آہستہ سبز سیّارے کی زمین سے بُلند ہو رہا تھا۔

میں کھڑکی سے ابھی تک نیچے جھانک رہا تھا۔۔ اور پھر میں نے جو کُچھ دیکھا دراصل بہادر سے بہادر انسان بھی اسے دیکھ کر غش کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں نے دیکھا کہ وہ خوفناک درندے فولاد کی سیڑھی کو اِس طرح چبا رہے ہیں جس طرح کوئی اونٹ ببول کے کانٹوں کو چبا ڈالتا ہے۔

سپاہیوں نے پنجرے اس دیوزاد کے سامنے رکھ دیے

سبز سیّارے سے پرواز کیے ہوئے ہمیں کئی دِن ہو چکے تھے اور اب ہمارا خاص راکٹ زہرہ کی طرف بڑی تیز رفتاری سے اُڑا جا رہا تھا۔ پچھلے دنوں جو خوف ناک واقعات پیش آ چکے تھے، انہوں نے ہمیں اتنا سہما دیا تھا کہ ہمیں چُپ سی لگ گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو بڑی خاموشی اور افسوس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ہمارے لباس اب بالکل تار تار تھے اور جسم سوکھ کر کانٹا بن گئے تھے۔ نجمہ زرینہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور اختر کو محبّت بھری نظروں سے لگاتار دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن اختر نے ایک بار بھی اس کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھا تھا بلکہ اس نے اپنی پیشانی پر بندھے ہوئے کتاک کو بھی کھول کو پھینک دیا تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی اس پر احتجاج نہیں کیا تھا۔ ہم اچھّی طرح جانتے تھے کہ سبز سیّارے سے اُڑنے کے بعد اب کتاک میں کوئی قوّت باقی نہیں رہ سکتی! اختر اب پھر سے چاق و چوبند نظر آنے لگا تھا اور ہمیں پھر اسی انداز سے دیکھنے لگا تھا جیسے کہ ہم اُس

کے غُلام ہوں اور وہ ہمارا آقا۔ جوں جوں زہرہ سیّارہ قریب آ رہا تھا، اختر کی بے نیازی اور لاپرواہی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بڑے غُرور کے ساتھ ہم سے بات کرتا تھا۔ اور اِس غُرور میں حقارت زیادہ ہوتی تھی۔ ہم نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور آپس میں یہ مشورہ کرنے لگے کہ اب آگے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

کراما کے قیدیوں میں سے اب صرف دو باقی رہ گئے تھے۔ جیکسن اور اس کا ساتھی۔ جیکسن کے بقیہ ساتھی، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ایک ایک کر کے ختم ہو چکے تھے۔ مُجھے ان لوگوں سے بڑی ہمدردی تھی لیکن اب ہمدردی جتا کر میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ ہماری خود کی حالت ایسی تھی کہ جو بھی ہمیں دیکھتا ہم سے ہمدردی ضرور جتاتا، بہر حال۔۔۔! میں غیر ضروری باتوں میں آپ کو اُلجھانا نہیں چاہتا اور اب یہ بتاتا ہوں کہ آگے ہمارے ساتھ کیا بھیانک واقعات پیش آئے؟

سیّارہ زہرہ سورج کے کافی قریب ہے اور سورج کے گرد وہ تقریباً ایک سو پچھتر دنوں میں ایک چکّر پورا کرتا ہے، جیسے کہ ہماری زمین سورج کے گرد تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک چکّر پورا کرتی ہے۔ زمین سے دیکھنے پر سیّارہ زہرہ ہمیں بادلوں سے ڈھکا نظر آتا ہے ہمارے سائنس داں آج تک یہ نہیں دیکھ سکے کہ اس کا رنگ کیسا ہے اور بادلوں سے پرے اِس کی زمین کیسی ہے؟ اسی لیے انگریزی میں اس سیّارے کو Shy lady یعنی شرمیلی دُلہن کہا جاتا ہے جو اپنا گھونگھٹ شرم کے مارے کبھی ہٹاتی ہی نہیں۔ زہرہ پر چھائے ہوئے یہ بادل اب ہمیں صاف نظر آنے لگے تھے۔ ہمارے راکٹ کے وژن اسکرین پر زہرہ ایک گیند کی طرح بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب مُجھ پر اِس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ جنہیں ہم بادل سمجھتے ہیں دراصل وہ گیسیں ہیں جو بادل کی شکل میں زہرہ کے سب طرف لگاتار چکّر لگا رہی ہیں۔

ان گیسوں کے بادلوں میں سے زہرہ کی زمین دِکھائی دینے لگی تھی۔ بالکل ہماری زمین کی طرح، بھوری، بادامی، اور سبز رنگ کی زمین! کہیں کہیں ہمیں بہت اُونچے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جان نے ان پہاڑوں کو دیکھ کر مُجھ سے کہا۔ "فیروز یہ کتنے عجیب پہاڑ ہیں، ایک دم سیدھے اور مخروطی!"

اس سے پہلے کہ میں جان کی بات کی تائید کرتا، اختر، جیک کو ایک طرف دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور جان سے تحکمانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"اب تُم کنٹرول پر سے ہٹ جاؤ بُڈّھے۔۔۔ تُم اِس راکٹ کو میرے آقاؤں کی زمین پر آسانی سے نہیں اُتار سکتے بلکہ یہ کام صرف میں۔۔" اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "یعنی ژاما کا بیٹا ہی انجام دے سکتا ہے۔"

جان جواب میں کُچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اسپیکر میں سے ایک سراٹا بُلند ہوا جو بعد میں آواز بن گیا۔ کسی نے نہایت خوفناک لیکن بھاری لہجے میں

میں کہنا شروع کیا۔ "جرمی ٹھیک کہتا ہے مسٹر جان، تُم ہمارے قیدی ہو اور کوئی قیدی جرمی کا آقا نہیں بن سکتا۔ کنٹرول جرمی کے سپُرد کردو۔ وہ تمہیں آہستگی سے ہماری دُنیا میں اُتار دے گا۔ ورنہ تمہارا راکٹ زمین سے ٹکرا کر پاش پاش بھی ہوسکتا ہے۔"

اب یہ تو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم نے کیا کِیا؟ ظاہر ہے کہ آواز کا کہنا مان کر ہم نے خود کو اختر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اختر کی آنکھوں میں ایک سفّاکانہ چمک تھی اور وہ بار بار ہم پر ایک طنزیہ نظر ڈالتا تھا اور پھر زہریلی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل جاتی تھی۔ اُس نے ہمیں حُکم دیا کہ ہم اپنے ہتھیار اُس کے حوالے کردیں۔ ساتھ ہی نجمہ کے گلے کا وہ ہار بھی جو درحقیقت سیّارہ زہرہ ہی سے ہماری زمین پر بھیجا گیا تھا۔ نجمہ نے ہار اُتارنے میں پہلے پس و پیش کیا مگر جان کے کہنے پر اس نے مجبوراً وہ اتار کر اختر کو دے دیا۔ زرینہ ڈبڈبائی نظروں سے اختر کی یہ کارروائی

دیکھتی رہی۔ وہ ہماری تمام چیزیں راکٹ میں کنٹرول روم کے پاس ہی ایک چھوٹے سے خانے میں رکھ رہا تھا۔

اچانک راکٹ کی کھڑکیوں میں سے گہرے زرد رنگ کی روشنی اندر آنے لگی۔ درحقیقت یہ سورج کی دھوپ تھی جو مختلف قسم کی گیسوں کے بادلوں میں سے گزرنے کے بعد یہ رنگ اختیار کر گئی تھی۔ اور اختر مختلف بٹن اتنی پھرتی سے دبا رہا تھا کہ خود مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا اختر زمین کا رہنے والا نہیں بلکہ زہرہ کا ہی باسی ہو اور زہرہ کے سائنس دانوں کے بتائے ہوئے فارمولے سے تعمیر کردہ اس راکٹ کو اچھی طرح جانتا ہو!

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک عجیب سی زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ زمین بڑی سخت تھی۔ دور مخروطی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ پہاڑیاں اہرامِ مصر جیسی تھیں مگر اونچی اتنی تھیں کہ ان کی چوٹیاں بادلوں میں جا کر غائب ہو

گئی تھیں۔ جس مقام پر ہمیں اُتارا گیا تھا اس کے آس پاس بے حد اُونچی
لیکن گول عمارتیں تھیں۔ ان عمارتوں کے دروازے ہوا میں لٹکے ہوئے
پُلوں کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اگر کوئی ایک عمارت سے
دوسری میں جانا چاہے تو اسے زمین پر قدم رکھنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ
وہ اِن پلوں کے ذریعے جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ دروازے غیر معمولی طور
پر لمبے تھے۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ دروازے اتنے اُونچے کیوں ہیں؟
آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سیّارہ زہرہ کے رہنے والے بڑے قد آور
تھے۔ ان کے قد اتنے اُونچے تھے کہ ہم لوگ ان کی ایک ہتھیلی پر آسانی
سے کھڑے ہو سکتے تھے۔ اس وقت بھی وہ ہم سے کُچھ ہی فاصلے پر
کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے سر آسمان کو چھو رہے تھے ان کی صورتیں
بڑی خوفناک تھیں۔ لباس ان کے جسم پر صرف کالی لنگوٹی کے علاوہ اور
کُچھ نہ تھا۔ ہاتھوں میں تین انگلیاں تھیں اور شکل بڑی ڈراؤنی! سر لمبوترا

تھا۔ پیشانی کے اوپر ہی دو بڑی بڑی لیکن بغیر پُتلی کی سبز آنکھیں تھیں۔ ناک سِرے سے ندارد تھی اور اس کی جگہ صرف چوہے جیسی تھوتھنی سی تھی۔ تھوتھنی کے نیچے مچھلی جیسا مُونہہ اور چہرہ بالکل سُرخ!

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ زہرہ کے موجود ڈکٹیٹر شاکا کی فوج کے چند اعلیٰ افسر ہوں گے اور یقیناً ہمیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ تعداد میں وہ کل تیرہ تھے۔ ایک جو اُن میں سب سے آگے کھڑا ہوا تھا اُس کی لنگوٹی دوسروں کے مقابلے میں سنہری رنگ کی تھی۔ اسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ غالباً اِن کا افسر ہے۔ وہ لوگ ہمیں بڑی حقارت سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک افسر نے اپنا ہاتھ نیچے بڑھایا اور ہمارے سامنے ہتھیلی پھیلاتے ہوئے بولا صرف ژاما کا عظیم بیٹا جرمی اِس پر کھڑا ہو جائے۔ افسر کا حُکم سُن کر اختر فوراً ہتھیلی پر چڑھ گیا (حالانکہ وہ بڑی مُشکل اور محنت کے بعد ہتھیلی کے اوپر پہنچ سکا تھا) افسر پھر فوراً اُسے اُٹھا کر اوپر ایک عمارت کے دروازے تک لے

گیا۔ اختر جلدی سے ہتھیلی پر سے کودا اور اس عمارت کے دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔

اس کے بعد بارہ زہروی سپاہیوں میں سے نَو نے ایک عجیب سی چیز ہماری طرف بڑھائی۔ میں ٹھیک ٹھیک تو بیان کر سکتا نہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ مچھلی پکڑنے کی چھڑی جیسی کوئی لمبی سی لکڑی تھی۔ پیچھے سے موٹی اور آگے سے پتلی۔ اِس میں لچک بھی تھی۔ چھڑی میں جہاں ڈور کے ذریعہ کانٹا لگا ہوتا ہے، اُس لکڑی میں وہاں طوطے کے پنجرے جیسا ایک بہت بڑا گنبد نما کمرہ لٹک رہا تھا۔ آپ اسے ایسا کمرہ سمجھ لیجئے جس کے ہر طرف لوہے کی لمبی لمبی سلاخیں لگی ہوں۔ ہمیں اشارہ کیا گیا کہ ہم دروازہ کھول کر اس کمرے میں داخل ہو جائیں۔ ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم نَو کے نَو آدمی ایک ہی پنجرے میں سما سکتے تھے۔ لیکن وہ شاید ہمیں الگ الگ قید کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے پنجرے ہمارے سامنے

رکھے تھے۔ میں نے جان کی طرف اس طرح دیکھا گویا اس کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے بڑی بے بسی کے ساتھ اپنے کندھے جھٹکے اور کہا اب اِس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمیں فی الحال تواِن دیوزادوں کا حُکم بلاچون وچرا ماننا ہی پڑے گا۔

لٹکتے ہوئے پنجروں والی یہ لکڑیاں اٹھا کر وہ ہیبت ناک قوم لمبے لمبے قدم اُٹھاتی ہوئی ہمیں کسی نامعلوم سمت میں لے چلی۔ ہم نے پنجروں کی سلاخیں بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں ورنہ یقیناً اِن کے ہلنے سے ہمارے سر اور جسم ضرور زخمی ہو جاتے۔ دیوزادوں کے قدم چوتھائی فرلانگ کے برابر اُٹھ رہے تھے۔ چونکہ ان کا قد زمین سے کوئی سوفٹ اونچا تھا۔ لہٰذا ہمیں یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی اُونچے سے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کا منظر دیکھ رہے ہوں!

زرد رنگ کے آسمان پر عجیب قسم کے پرندے اُڑ رہے تھے۔ یہ پرندے

بہت ہی بڑے تھے۔ اِن کی شکلیں بھی خوفناک تھیں۔ لمبی لمبی ٹانگیں اور لمبی سی گردن کے بعد لمبی چونچ۔ سب سے زیادہ تعجّب والی بات یہ تھی کہ اِن پرندوں کے چار چار بازو تھے۔ ہماری دُنیا کے ہر پرندے کے دو بازو ہوتے ہیں جنھیں پھیلا کر اور اُوپر نیچے کر کے وہ اُڑا کرتے ہیں۔ لیکن یہ پرندے پہلے نیچے والے بازو اوپر کرتے تھے اور پھر فوراً ہی اوپر والے بازو نیچے۔ اس لحاظ سے ان کی رفتار غیر معمولی تیز تھی۔ اور ساتھ ہی ایک زبردست شوں کی آواز بھی ان کے پروں سے پیدا ہوتی تھی۔ ہمیں یہ پرندے اس طرح دیکھتے ہوئے اُڑ رہے تھے جیسے کوئی چیل گوشت کی ننّھی سی بوٹی کو نیچے دیکھ کر آسمان پر منڈلانے لگتی ہے۔

دیوزاد ہمیں اٹھائے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک بہت بڑا ڈبّہ چار پہیّوں پر کھڑا ہوا تھا۔ یہ ڈبّہ ریل کے مال ڈھونے والے ڈبّے سے بہت ملتا جلتا تھا۔ وہ تیرہ کی تیرہ اِس ڈبّے کے اندر بیٹھ گئے۔ اسی سے

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سو سو فٹ لمبے تیرہ آدمی جس ڈبّے میں بیٹھ جائیں۔ وہ ڈبّہ کتنا بڑا ہو گا۔ میں نے غور سے دیکھا کہ شاید اندر کوئی مشین یا بٹن نما چابی ہی دِکھائے دے۔ مگر مُجھے ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ البتّہ ان دیوزادوں کے بیٹھتے ہی وہ ڈبّہ زمین پر بڑی تیزی سے دوڑنے لگا۔

راستے میں ہمیں سوائے اِن گول گول آپس میں ملی ہوئی عمارتوں کے اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔ شاید اس زمین پر درخت یا پودے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جب ہی تقریباً ایک گھنٹے تک سفر کرنے کے باوجود ہمیں ہریالی دور دور تک بالکل نظر نہ آئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ڈبّہ اب نشیب میں اتر رہا ہے اور پھر جلد ہی وہ ایک بہت بڑے غار میں داخل ہو گیا۔ اس غار میں اندھیرا اتنا تھا کہ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے مگر کُچھ نظر نہ آتا تھا۔ اچانک پھر فوراً ہی اودی روشنی سے وہ غار روشن ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ غار بہت بڑا ہے اور اس کے بیچوں بیچ ایک بہت ہی خوبصورت تخت

بچھا ہوا ہے۔ تخت پر ایک دیو زاد اوودے کپڑوں میں ملبوس، بڑی رعونت اور اکڑفوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ اس تخت کے پیچھے چند دیو زاد عجیب سے ہتھیار پکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ لباس کی جگہ اُن کے جسم پر بھی ایک لنگوٹی ہی تھی۔ تخت کے بالکل پیچھے ایک اونچا دروازہ تھا جو شاید کسی اور غار کے اندر کھلتا تھا۔

غار کی فضا بالکل ویسی ہی تھی جیسے کسی بادشاہ کے دربار کی ہوتی ہے۔ ڈبّہ تخت سے کافی دور تک گیا۔ اور پھر سپاہیوں نے اپنی اپنی چھڑوں میں سے پنجرے نکال کر اس دیو زاد کے سامنے رکھ دیے، پنجروں میں ہمیں چلتے پھرتے دیکھ کر دربار میں ایک بھنبھناہٹ گونج اٹھی۔ غار میں موجود سپاہی ہمیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے اور آپس میں ہلکی آواز سے باتیں کرنے لگے تھے۔

"آخر کار!" تخت پر بیٹھے ہوئے آدمی نے مُسکرا کر کہا۔ "ہم اپنے مقصد میں

کامیاب ہو گئے۔ کیوں مسٹر فیروز! میں نے کیا کہا تھا؟ تم سے اپنے عزیز
لیڈر جیگا کا انتقام ضرور لیا جائے گا۔ دیکھ لو، اب تُم میرے یعنی شاکا کے
سامنے ہو اور ابھی اسی وقت سے شاکا کا انتقام شروع ہوتا ہے۔"

جیسا کہ آپ اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ ہم لوگ دیو کے مقابلے میں خود کو
چیونٹی جیسا محسوس کر رہے تھے۔ یہ لوگ دیو زاد تھے اور نہایت خوفناک
اور بد صورت۔ شاکا کی صورت بالکل ویسی تھی جیسی کہ میں بمبئی میں دیوار
کے اوپر دکھائی دینے والی تصویر میں دیکھ چکا تھا۔ دیکھنے میں وہ بھی ویسی
ہی لمبوتری تھوتھنی اور مچھلی کے مُونہہ والا انسان تھا۔ میں اب اچھّی طرح
جانتا تھا کہ شاکا اپنی کہی ہوئی بات کو پورا ضرور کرے گا اور ہم سے انتقام
ضرور لے گا۔ اس نے مُجھے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے تالی بجائی
اور بولا۔

"میرا ایک انتقام تو وہ ہے جو تمہاری دُنیا ہی میں لیا جا چُکا ہے، یعنی

تمہارے چہیتے اور ہونہار بیٹے کا تم سے متنفّر ہونا اور میرے تابع ہو جانا۔ وہ اب جرمی ہے اور ژاما کا بیٹا۔ اور دوسرا انتقام اب شروع ہی ہونے والا ہے۔۔"

اتنا کہہ کر اس نے اس سمت میں دیکھا جہاں سے کُچھ سائے بھدّی چال کے ساتھ ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جب وہ سائے روشنی میں آئے تو خوف و دہشت کے باعث میری ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔ نجمہ اور زرینہ بھی سہم کر مُجھے دیکھنے لگے۔ اور میرے بقیہ ساتھی بھی گھبرا کر ایک دم دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ دراصل وہ خوں خوار جکاریوں کا ایک غول تھا جو اپنی بھدّی چال کے ساتھ آہستہ آہستہ ہماری طرف آرہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ویسا ہی چابک تھا جو میں اب سے پہلے اپنی دُنیا کے ایک سنسان اور ویران جزیرے میں دیکھ چکا تھا۔ جکاری قد میں ہم سے کُچھ ہی بڑے تھے۔ ان کی ایک آنکھ میں نفرت اور ظلم مُجھے

صاف نظر آ رہا تھا اور اگلے دانتوں سے رال ٹپک رہی تھی۔ شاکا کے سامنے آ کر وہ ادب سے جھکے اور پھر اس کے حُکم کا انتظار کرنے لگے۔

"وفادار جکاریوں!" شاکا نے کہا۔ "اِن انسانوں کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دو۔"

کاش میں آپ کو بتا سکتا کہ اس وقت ہماری کیا حالت ہوئی جب جکاریوں کے ہنٹر ہمارے جسم پر پڑنے شروع ہوئے۔ انسان بہت مجبور ہو کر ہی موت کی خواہش کرتا ہے اور میری بھی اس وقت یہی آرزو تھی کہ موت آئے اور ہم سب کی مُشکل آسان ہو۔ جکاری پوری قوّت سے ہمارے جسموں کے پرخچے اُڑا رہے تھے۔ مجھے اپنا نہیں مگر اپنی پیاری بیٹی نجمہ اور اس کی ماں زرینہ کی فکر تھی، حالانکہ سوامی اِن دونوں کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہوا تھا۔ اور جکاریوں کے ہنٹر اپنے جسم پر برداشت بھی کر رہا تھا۔ مگر ظالم شاکا نے جکاریوں کو فوراً ہدایت دی کہ وہ دونوں عورتوں پر بھی ہنٹر برسائیں۔

میرے خُدا! میرے لیے وہ وقت قیامت سے کم نہ تھا۔ جب کہ زرینہ اور نجمہ بُری طرح چلّا رہی تھیں۔ امجد نے دوڑ کر اس طرف بڑھنا بھی چاہا تھا مگر ایک جکاری نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ جکاریوں کے جسم میں جو برقی قوّت تھی اس نے اتنا زبردست جھٹکا دیا کہ امجد بے ہوش ہو کر وہیں زمین پر گر پڑا۔ مگر اس کے باوجود ہنٹر اس کے جسم پر لگاتار پڑتے رہے۔ جو حضرات میری یہ داستان پہلی بار پڑھ رہے ہیں ان کو سمجھانے کے لیے میں اتنا عرض ضرور کروں گا کہ جکاریوں کے جسم میں ایک پوشیدہ برقی قوّت تھی۔ یہ قوّت ہم نے اس وقت بھی محسوس کی تھی جب ہماری ان خوفناک قوم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ مُجھے معلوم تھا کہ ان کو چھونے سے ایک زبردست جھٹکا لگتا تھا۔ معلوم تو امجد کو بھی تھا مگر وہ غریب جوش میں آ کر یہ حرکت کر ہی بیٹھا تھا۔

شاکا ہم سے یہ دوسرا انتقام لے رہا تھا۔ ہماری چیخیں بُلند ہو رہی تھیں اور

وہ کم بخت مُسکرا رہا تھا۔ ہمیں زیادہ ذہنی تکلیف پہنچانے کے لیے اس نے ایک اور حرکت کی۔ اس نے آہستہ سے کسی سے کُچھ کہا اور پھر فوراً ہی غار کے ایک کونے میں سے ایک شخص نمودار ہوا۔۔ آہ۔۔۔! میں کیا بتاؤں کہ مُجھے کتنی تکلیف ہوئی ہے کیوں کہ آنے والا شخص اختر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ادب سے شاکا کے سامنے آ کر جھُکا اور پھر ہمیں تڑپتے اور پِٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہمیں بلکتے اور روتے دیکھ کر وہ خود بھی مُسکرا رہا تھا اور ساتھ ہی کم بخت جکاریوں کو ہدایات دیتا جاتا کہ فلاں شخص کو زیادہ زور سے پیٹا جائے اور فلاں کی کمر پر زیادہ ہنٹر برسائے جائیں۔ اس کی ہدایات جاری رہیں مگر شاید خُدا کو یہ منظور نہ تھا کہ میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو ایک ظالم شخص کے روپ میں دیکھوں۔ کیوں کہ تکلیف کی تاب نہ لا کر میں بے ہوش ہو چکا تھا اور مُجھے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ میرے دوسرے ساتھیوں پر کیا عالم گزر گیا تھا۔

جب مُجھے ہوش آیا اور میری آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں تو میں نے دیکھا کہ شیشے کے ایک بہت بڑے کمرے میں لیٹا ہوا ہوں اور میرے ساتھی خوفزدہ نظروں سے کسی نظر نہ آنے والی چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ میں چونکہ لیٹا ہوا تھا لہٰذا اس چیز کو فوراً ہی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جان جیک، سوامی اور امجد کے جسموں پر لاتعداد زخم ہیں۔ اور اِن زخموں سے خون رِس رہا ہے۔ زرینہ اور نجمہ ایک پروں والی کھال اپنے بدن کے گرد لپیٹے بیٹھی تھیں۔ ان کے جسم لاغر ہو گئے تھے اور گالوں کا گوشت اندر پچک گیا تھا۔ جیسا کہ مُجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اُن دونوں کے کپڑے ہنٹروں کی مار سے بالکل پھٹ گئے تھے اور وہ خود کو چھپانے کی کوشش کرنے لگیں تھیں۔ جب زخموں کی تاب نہ لا کر وہ بے ہوش ہو گئیں اور انہیں دوبارہ ہوش آیا تو انہوں نے سب کو ایک کمرے میں پایا۔ میں اور جان اس وقت تک بے ہوش تھے۔ زرینہ نے مُجھے بتایا کہ اسے بڑی

شرم آرہی تھی کیوں کہ اس کے اور نجمہ کے بدن پر کپڑے برائے نام ہی رہ گئے تھے۔ اچانک پھر ایک عجیب بات ہوئی تھی، اس کمرے میں یکایک اندھیرا ہو گیا تھا۔ کُچھ دیر بعد یہ اندھیرا برقرار رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی روشنی ہوئی تھی وہ دونوں یہ دیکھ کر چونک گئیں کہ ان کے بالکل سامنے وہ پروں والی کھالیں پڑی ہوئی تھیں۔ اِن کھالوں پر کسی نے ایک پرچہ بھی انگریزی زبان میں لکھ کر رکھ چھوڑا تھا۔ پرچے پر لکھا تھا۔ "آپ یہ کھالیں اپنے جسموں کے گرد لپیٹ لیں۔"

زرینہ نے مُجھے بتایا کہ اسے یہ پرچہ پا کر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس اجنبی دُنیا میں ہمارا دوست یا ہم درد کوئی نہ تھا۔ پھر آخر وہ کون تھا جس نے ان دو عورتوں پر رحم کیا؟ جیک نے بھی یہی کہا کہ وہ سب تقریباً تیرہ گھنٹے تک بے ہوش رہے تھے۔ ان کے ہوش میں آنے کے بعد چند جکاری کُچھ زوک لوگوں کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے اور ان کے زخموں پر

انہوں نے کوئی عرق چھڑک دیا تھا۔ لہٰذا زخموں کی تکلیف تو بالکل ختم ہو گئی البتّہ خون کہیں کہیں سے لگاتار رِس رہا ہے۔

میرے پوچھنے پر سوامی نے بتایا کہ جکاری اور زوک انہیں ایک بہت بڑے پنجرے میں قید کر کے اس مقام پر لے آئے تھے اور اس شیشے کے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ مُجھے ابھی چند منٹ پہلے ہی ہوش آیا ہے اور اب ہم زہرہ کے لوگوں کے رحم و کرم پر ہیں۔

میں آہستہ سے اُٹھا اور اُس سمت میں دیکھنے لگا جِدھر میرے ساتھی خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُف میرے خُدا! میں نے دیکھا کہ ہم کسی بہت بڑے اسٹور میں ہیں اور لاتعداد زہروی لوگ ہمیں قریب آکر دیکھ رہے ہیں۔ ان کی سبز آنکھیں اور بھیانک چہرے شیشے کے کمرے سے بھی بڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ میں نے غور سے دیکھا یہ لوگ ایک بہت بڑے ہال میں جمع تھے۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ

سو سو فٹ کے لوگ جس ہال میں جمع ہوئے ہوں گے وہ ہال کتنا بڑا ہو گا؟ کمرے کے بائیں طرف چند جکاری کھڑے تھے اور اُن کے پاس ہی زہروی آدمی جس کے ہاتھ میں لکڑی کی ایک ہتھوڑی تھی۔ اس ہتھوڑی کو وہ بار بار میز پر بجاتا تھا اور اپنے بھیانک لیکن سمجھ میں نہ آنے والے لہجے میں اُن لوگوں سے کُچھ کہتا تھا۔ اس کی بات سُن کر ہجوم میں سے کوئی اپنا ہاتھ اٹھا کر تین انگلیوں میں سے ایک یا دو انگلیاں دکھاتا تھا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر ہتھوڑی کے میز پر بجنے کی آواز آتی تھی اور ہتھوڑی بجانے والا پھر بولنے لگتا تھا۔

اب بھی یاد کرتا ہوں وہ وقت تو یقین جانئے جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ دراصل ہم لوگ نیلام گھر میں تھے اور لوگ ہماری بولی لگا رہے تھے۔ ذرا تصوّر میں وہ منظر لانے کی کوشش کیجئے۔ ایک میز پر چوکور پیپر ویٹ کے اندر ہم کیڑے مکوڑوں کی طرح بند تھے اور لوگ ہماری بولی بول رہے

تھے۔ چونکہ ہم ایک نئی اور نرالی دُنیا کے جیتے جاگتے کھلونے تھے۔ لہٰذا لوگوں میں زبردست جوش اور بے تابی پائی جاتی تھی۔ ہر ایک بڑھ چڑھ کر بولیاں لگا رہا تھا۔ زرینہ یہ منظر دیکھ کر اتنی سہمی کہ اس نے میرے کاندھوں پر اپنے ہاتھوں کا زور دے دیا اور خوفزدہ آواز میں بولی۔ "فیروز اب ہمارا کیا ہوگا؟"

نجمہ بھی حیران و پریشان امجد کو لگاتار دیکھے جا رہی تھی۔ شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ بس ہمارا بس اب خُدا ہی حافظ ہے۔ جان، سوامی اور جیک سے کہہ رہا تھا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں ہر خطرے کا مردانہ وار مُقابلہ کرنا چاہیئے۔ اگر اِن میں سے کسی نے ہم کو اس بولی میں چھڑا بھی لیا تو یقیناً وہ ہمیں ختم کرنے کی نہیں سوچے گا کیوں کہ وہ ہمیں ایک معقول رقم کے عوض خریدے گا اور اتنی بڑی رقم کوئی کسی کو جان سے مارنے کے لیے نہیں خرچ کیا کرتا۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔" جیکسن نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن قصائی بکروں کو بلاوجہ نہیں خریدا کرتے ہیں۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو مسٹر جیکسن۔" زرینہ کانپ گئی۔

"انکل کا خیال درست ہے۔" میں نے کمزور آواز میں کہا۔ "وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ ہمیں زیادہ رقم دے کر کوئی جان سے مارنے کے لیے نہیں خریدے گا۔ ہمیں یہی بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیئے۔"

"لیکن۔۔۔۔ لیکن اگر اس نے ہمیں خرید کر الگ الگ اور دور دراز مقامات پر بھیج دیا۔۔۔تب؟" نجمہ نے گھبرا کر کہا۔

کہنے کو خیر ہم نے اس سب کی ڈھارس بندھائی تھی لیکن سچ پوچھئے تو خدشہ مُجھے بھی تھا کہ یہ مخلوق ہمیں خریدنے کے بعد نہ جانے ہم سے کیا سلوک کرے اور شاید یہ بھی شاکا کے انتقام کی ایک کڑی ہو! زہرہ کے سابق

ڈکٹیٹر شا گو کا ابھی تک کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا تھا۔ نہ ہمیں کسی نے بتایا اور نہ ہی ہمیں پوچھنا یاد رہا، کیوں کہ ہمارا سیّارہ زہرہ تک آنے کا پہلا مقصد تو شا گو کو شا کا کی قید سے رہا کرانا اور پھر سے زہرہ میں جمہوریت کو بحال کرنا تھا۔ لیکن یہاں آتے ہی ہم پر ایسی بپتا پڑی کہ ہم سب کُچھ بھول گئے تھے۔

ہتھوڑی کی ایک زور دار آواز کے ساتھ ہی اچانک لوگوں کا زبردست شور سُنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دیوزاد ہمیں مُسکرا کر دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ شیشے کے کمرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تین انگلیوں میں کپڑے کی تین لمبی دھجیاں تھیں۔ یہ دھجیاں اس نے نیلامی کرنے والے کو دے دیں۔ شاید یہ کپڑے کی دھجیاں وہاں کا سِکّہ تھا۔ نیلام والے نے بڑی خُوشی کے ساتھ یہ دھجیاں لے کر اپنی لنگوٹی میں اُڑس لیں اور آنے والے کو اشارہ کیا کہ وہ شیشے کا کمرہ لے جا سکتا ہے۔ وہ دیوزاد اب آگے

بڑھا اور کمرے کے پاس آ کر چند لمحوں تک ہم سے ہر ایک کو باری باری دیکھتا رہا۔ پھر بڑی صاف اور عمدہ انگریزی میں بولا۔ "مبارک ہو مسٹر جان اب میں نے آپ کو خرید لیا ہے۔"

اُس کی انگریزی سُن کر جان کے ساتھ ساتھ مُجھے بھی تعجّب ہوا، کیوں کہ مُجھے ایسا لگا گویا میں یہ آواز پہلے بھی سُن چکا ہوں اور بار بار سُن چکا ہوں۔ جان حیرت زدہ نظروں سے اس دیوزاد کو دیکھ رہا تھا، آخر وہ اس سے پوچھ ہی بیٹھا۔ "کون ہو تم۔۔۔ مُجھے کیسے جانتے ہو؟"

اجنبی دیوزاد مُسکرایا اور پھر اس نے کوئی چیز اپنی ہتھیلی میں سے نکال کر مُونہہ میں رکھ لی۔ شاید وہ کوئی دوا تھی جس کے اثر سے وہ دیوزاد اچانک چھوٹا ہونے لگا۔ چھوٹا۔۔۔ چھوٹا۔۔۔ اور چھوٹا۔۔ بہت ہی چھوٹا۔۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے قد کے برابر ہو گیا۔ اُس کی صورت میں بھی تبدیلی ہونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری طرح کا ایک انسان بن گیا۔

میرے مُونہہ سے حیرت اور خوف کی ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے سامنے امریکہ کا بہترین سائنس داں والٹر اسمتھ کھڑا ہوا مُسکرا رہا تھا۔

وہ کسی اور ہی دنیا کا انسان تھا

غصّے کے باعث میں بڑی طرح کپکپا رہا تھا۔ میرے ساتھیوں کی بھی تقریباً یہی

حالت تھی۔ جان ایک تو تھا ہی بُوڑھا، دوسرے اُس وقت کا صدمہ! پہلے تو وہ ڈگمگایا، اور پھر شاید بے ہوش ہونے ہی والا تھا کہ جیک نے جلدی سے اُسے سہارا دیا اور اس سے کہا کہ وہ اِن بدلتے ہوئے حالات کا ثابت قدمی اور ہمّت سے مُقابلہ کرے۔ والٹر ہماری حالت دیکھ کر مُسکرا رہا تھا اور سینے پر اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر ہمیں اِس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی کسی کا مذاق اُڑاتا ہے۔

"تُم۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔کمینے انسان۔۔۔۔ تُم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔" جان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں انسان نہیں ہوں، اِس لیے کمینہ ہو ہی نہیں سکتا۔" والٹر نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دوسری بات یہ کہ مُجھ پر

ناراض ہونے کی بجائے آپ حضرات کو میرا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ میں نے آپ کو خرید لیا ہے۔"

"یہ کون سی شُکر گزاری کی بات ہے؟"

"اگر میں آپ کو نہ خریدتا تو پھر آپ علاقہ نمبر چار میں پھینک دیتے جاتے جہاں آپ لمبی گردن والے سارسوں کی خوراک بن جاتے۔ میں نے آپ کو بچایا ہے میرے عزیز دوست۔"

"خبردار!" جان نے غُصّے سے کہا۔ "مُجھے دوست کہہ کر نہ پکارو۔ یہ لفظ تمہارے مُونہہ سے اچھّا نہیں لگتا۔

"چلیے، اچھّا نہیں لگتا تو نہ سہی۔" والٹر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "لیکن اتنا ضرور جان لیجیئے کہ اب میں آپ سب کا مالک ہوں اور آپ کو اپنی ایک خاص دُنیا میں قید کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں ایسی دُنیا جو آپ کے زمینی حساب سے

صرف ایک سینٹی میٹر لمبی اور اونچی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ مانا کہ ہم یقین نہ آنے والے حالات سے گُزر رہے ہیں مگر ایسی بے پَر کی بھی کیا ہے؟"

جان کی یہ بات سُن کر والٹر پھر مُسکرایا اور کہنے لگا کہ اُس کی بہت سی باتوں پر اب تک کسی کو یقین نہیں آ سکا ہے۔ اُس نے خود ہی اپنے رازوں پر سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا اور ہمیں وہ باتیں بتانے لگا جو واقعی حیرت انگیز تھیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ شروع ہی سے امریکہ میں مقیم تھا اور ایک عظیم سائنس داں کی حیثیت سے وہ جان سے ملا تھا۔ جلد ہی دونوں میں دوستی ہو گئی تھی۔ بعد میں یہ دوستی اتنی بڑھی کہ خود جان کو راکٹ کے سِلسلے میں اُس سے مدد لینی پڑی تھی۔ والٹر نے مدد بھی کی مگر بیچ میں وہ کُچھ رخنے بھی پیدا کرتا گیا تھا۔۔۔ مثلاً بمبئی میں میرے محل کی دیوار پر جو عکس نظر آیا تھا وہ والٹر کی مدد سے ہی وہاں تک آیا تھا۔ والٹر نے ہی

پرندوں اور جانوروں کو بڑا کر دیا تھا اور اُسی نے اختر کے دماغ کو سمندر کے
اندر والی لیبارٹری میں لے جا کر صاف کیا تھا۔ وہی کُچھ خاص مشینوں کی مدد
سے سبز روشنی آسمان سے پھینکا کرتا تھا اور اختر اُس روشنی میں جا کر کھڑا
ہوا کرتا تھا۔ اُسی نے فارمولا چوری کرایا تھا اور اُسی نے زمین سے راکٹ
کے اُڑنے میں رکاوٹ پیدا کی تھی۔ اختر کے دماغ پر قبضہ کرنے والا بھی
وہی تھا۔ البتّہ سبز سیّارے کی کشش کے بارے میں اُسے کُچھ معلوم نہیں
تھا۔ اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ سیّارے پر مکڑ آدمی والی کوئی مخلوق رہتی
ہے۔ جب ہم نے اُسے شیفاؤں کے علاقے کی طرف جاتے دیکھا تھا تو
دراصل وہ گھوم کر ہمارے راکٹ کی طرف آگیا تھا۔ راکٹ چوں کہ اُسی
کی نگرانی میں تیّار ہوا تھا، اِس لیے اُس نے راکٹ کے پیندے میں خود کو
چھپانے کے لیے ایک محفوظ جگہ پہلے ہی سے بنوائی تھی اور وہ اُسی جگہ جا کر
چھُپ گیا تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ شیفاؤں کی خوراک بن گیا ہے لیکن

دراصل وہ ہمارے راکٹ میں چھُپا رہا تھا اور سبز سیّارے سے اُڑنے کے بعد بڑے آرام سے سیّارہ زہرہ پر اُتر گیا تھا۔

یہ تھا والٹر۔۔۔ یہ تھا وہ آستین کا سانپ جسے ہم نے دودھ پلا کر پالا تھا! میں اپنے دانتوں سے ہونٹ کاٹتا رہا اور اس کی یہ باتیں سُنتا رہا۔ دِل ہی دِل میں خود کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ میاں فیروز! تُم تو خود کو بڑا عقل مند سمجھتے تھے، لیکن آج ثابت ہوا کہ تُم سے بڑا احمق شاید ہی دُنیا میں کہیں ہو! امجد اور سوامی بالکل خاموش کھڑے تھے۔ جیک خُوں خوار نظروں سے والٹر کو دیکھ رہا تھا۔ جیکسن اور اُس کا ساتھی کُچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی والٹر کو گھور رہے تھے۔ نجمہ اور زرینہ بالکل چُپ تھیں، جیسے انہیں اِن حالات سے ذرا بھی دِل چسپی نہیں ہو۔ شاید اِس کی وجہ یہ تھی کہ اب وہ اُکتا چُکی تھیں اور چاہتی تھیں کہ جو کُچھ بھی ہونا ہے جلد سے جلد ہو جائے۔

"مجھے بعد میں کوس لیجیۓ گا۔" والٹر نے کہا۔ "آئیے، ذرا اِس دُنیا کو دیکھ

لیجئے جہاں اب آپ کو جانا ہے۔"

"کون سی دُنیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اُسی ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں۔" والٹر نے کہا۔ "یہ دُنیا میرے مکان میں رکھی ہے۔ وہاں جانے کے لیے آپ کو صرف دِل میں ارادہ کرنا ہوگا اور آپ میرے مکان میں ہوں گے۔ صرف اپنے اپنے دِلوں میں یہ سوچ لیجئے کہ آپ کو میرے مکان پر جاتا ہے، بس اتنا کافی ہے۔ لیکن ایک بات غور سے سُن لیجئے۔ میں انسانوں کے اتنے قریب رہا ہوں کہ اُن کی کُچھ عادتیں مثلاً رحم، محبّت، خلوص وغیرہ تھوڑا سا مُجھ میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا برتاؤ آپ لوگوں سے بُرا نہ رہے۔ لیکن یہ اُسی وقت مُمکن ہے جب آپ میرا کہا مانیں۔ یقین کیجئے آپ کو کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اچھّا اب آپ سب اپنے دِلوں میں ارادہ کیجئے کہ آپ کو میرے مکان پر پہنچنا ہے۔"

میرے ساتھ ہی غالباً اور سب نے بھی دِل میں یہی ارادہ کیا تھا۔ اور پھر اچانک میں یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گیا کہ ہم ایک عالی شان اور بہت ہی اُونچے محل کے ہال میں کھڑے ہوئے ہیں اور والٹر بھی ہمارے ساتھ ہی وہاں موجود ہے۔ جہاں ہم کھڑے تھے اُس سے کُچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا سنگِ مرمر کا چبوترا تھا اور اس چبوترے پر فیروزی رنگ کا غالباً پلاسٹک کا بنا ہوا ایک چوکور ڈبّا بڑی احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ اور یہ ٹکڑا صرف ایک سینٹی میٹر مربّع تھا۔

"لیجئے۔۔۔۔ یہ ہے وہ انوکھی دُنیا۔" والٹر نے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب آپ اِس میں داخل ہونے کے لیے تیّار ہو جائیے۔"

"کیا بے وقوفوں کی سی باتیں کرتے ہو؟" جان نے کہا۔ "ہم اِس چوکور پلاسٹک کے ڈبّے میں بھلا کس طرح داخل ہوں گے۔"

"بے حد آسان ترکیب ہے۔" والٹر نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "آپ میری قوّت اور عِلم سے واقف ہونے کے بعد بھی اِس قسم کی باتیں کرتے ہیں! مُجھے اِس پر بڑا تعجّب ہوتا ہے۔۔۔۔ اپنے سر کی طرف دیکھئے، اِس ہال میں آپ کو عجیب ساخت کے کُچھ قُمقُمے نظر آ رہے ہیں۔ اب بائیں طرف دیکھئے۔ یہ میری ایجاد کردہ ایک انوکھی مشین ہے۔ جیسے ہی میں اِس مشین کا ایک خاص بٹن دباؤں گا، قُمقُموں میں سے کُچھ شُعاعیں نکلیں گی اور آپ سب کو مختصر کرنا شروع کر دیں گی۔ اِتنا مختصر کہ آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ صرف میں ہی آپ کو خُردبین کی مدد سے دیکھ سکوں گا۔ جب آپ بے حد چھوٹے ہو جائیں گے تو یہ شعاعیں آپ کو خود بخود اِس دُنیا میں پہنچا دیں گی، اور یقین مانئے، وہاں جا کر آپ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کریں گے، بلکہ مُجھے داد ہی دیں گے کہ میں نے وہ کام کر دکھایا جو آپ کی دُنیا یا کسی بھی سیّارے کے کسی سائنس داں نے آج تک نہیں کیا۔"

اِتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ ظالم کتنی بے دردی سے ہنس رہا تھا! جی چاہتا تھا کہ اِس کم بخت کے مُونہہ پر تھوک دوں، لیکن اِس وقت ہم اِس کی قید میں تھے اوراس کے رحم وکرم پر ہی ہماری آئندہ زندگی کا دارومدار تھا۔ اُس کی یہ باتیں سُن کر جیسے ہمیں سانپ سونگھ گیا۔ ہم پتھرّ کے بُتوں کی مانند خاموشی سے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ مشین کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زرینہ نے اب تک اِن حالات کا بڑے سکون اور بڑی ہمّت کے ساتھ مُقابلہ کیا تھا، مگراچانک اُس وقت وہ رو پڑی اور چیخ چیخ کر کہنے لگی کہ اختر کے بغیر وہ کہیں نہیں جائے گی۔ "محترمہ میں آپ کی عزّت کرتا ہوں۔" والٹر نے نہایت ادب کے ساتھ کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ساتھ کوئی گُستاخی کروں۔ اختر کو اب آپ بھول جائیں۔ وہ اختر نہیں بلکہ جرمی ہے۔۔۔۔ ژاما کا بیٹا جرمی۔۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔ وہ میرا بیٹا ہے۔" زرینہ نے چلّا کر کہا۔ "وہ میرے جِگر کا ٹکڑا

ہے۔ کم بختو تُم نے اُسے مُجھ سے چھین لیا ہے۔ لیکن یاد رکھو تمہیں اِس کی سزا ضرور ملے گی۔ خُدا صرف ہماری زمین کا ہی خُدا نہیں بلکہ اِس پوری کائنات، اس پورے نظام شمسی کا خُدا ہے۔ وہ میری دُعا ضرور سُنے گا۔ تمہارے حق میں ایک ماں کے دِل سے جو بد دُعا نکل رہی ہے، اُس سے ڈرو والٹر۔ یاد رکھو میرا خُدا ضرور تُم سے اِس کا بدلہ لے گا۔ ضرور بدلہ لے گا۔

زرینہ لڑکھڑانے لگی تھی کہ نجمہ نے جلدی سے اُسے سہارا دیا۔ نجمہ کے گالوں پر بھی آنسو بہہ رہے تھے اور فریادی نگاہوں سے وہ والٹر کو دیکھ رہی تھی۔ زرینہ نے جس طرح والٹر سے صاف صاف بات کی تھی، اِس سے وہ سہم گیا تھا۔ اُس کی مُسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی تھی۔ اور وہ فرش کو لگاتار دیکھتے ہوئے کُچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اُس نے ایک نظر اُنھیں دیکھا اور پھر جلدی سے مشین کا بٹن دبا دیا۔ ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ

سُنائی دی اور ہال کی چھت میں لگے ہوئے قُمقُموں میں سے ایک سرّاٹا بُلند ہونے لگا۔ میری نظریں بے ساختہ چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ قُمقُمے جلدی جلدی رنگ بدل رہے تھے۔ اچانک مُجھے یوں لگا گویا میرے جسم کی ہڈّیاں چیخ رہی ہیں۔ ایک عجیب سی کیفیّت، عجیب سا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ میں اپنی اِس کیفیّت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں مُجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اِس ہال کی ہر چیز بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ اتنی بڑی کہ مُجھے جلد ہی اِن چیزوں سے خوف محسوس ہونے لگا جو میرے آس پاس تھیں۔ مثلاً میرے قریب ایک کرسی پڑی تھی۔ یہ کرسی مُجھے ہمالیہ پہاڑ سے بھی اُونچی نظر آنے لگی اور میں اِس ڈر سے ایک طرف جھُک گیا کہ کہیں یہ کُرسی مُجھ پر نہ آ پڑے۔ اِسی لحاظ سے اس ہال کے فاصلے بھی بڑھ گئے۔ فرش پر جو چوکور سے خانے بنے ہوئے تھے اور پہلے

جس ایک خانے کے برابر میرا صرف پیر تھا، اب یہی چوکور خانہ مُجھے ہزار

میٹر سے بھی بڑا نظر آ رہا تھا!

بات صرف اتنی تھی کہ سب کُچھ اپنی اصلی حالت میں تھا۔ میں ہم لوگ ہی چھوٹے ہو گئے تھے۔ اچانک ایسا معلوم ہوا جیسے کسی طاقت نے مُجھے اپنے ساتھیوں سمیت اُٹھا کر کسی اور زمین پر ڈال دیا ہے۔ کُچھ لمحے پہلے جو کیفیّت رہی تھی اُس کے باعث ہمارے جسم کا ایک ایک جوڑ دُکھنے لگا تھا۔ نہ جانے کب تک ہماری یہ حالت رہی۔ میں گویا غنودگی کے عالم میں یہ سب کُچھ دیکھتا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جیسے میں ہوش میں آ گیا اور پھر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ویسا ہی ہال تھا، ویسا ہی کمرہ اور وہی مشین۔ ہم لوگ اِس ہال میں کھڑے ہوئے تھے اور مشین کے قریب ایک اور شخص کھڑا ہوا تھا۔ پہلے تو میں اسے والٹر ہی سمجھا لیکن پھر غور سے دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ کسی اور ہی دُنیا کا انسان ہے۔ اُس کا رنگ سُرخ تھا۔ دیکھنے میں رنگ کے

علاوہ اُس میں اور کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی۔ البتّہ اِس عجیب انسان کے چار ہاتھ تھے، دو پاؤں اور ہاتھوں میں چار چار اُنگلیاں۔ اُس کے سر پر جو بال تھے وہ گھوڑے کی ایّال سے مِلتے جُلتے تھے۔ ہمیں ہال میں کھڑے دیکھ کر وہ شخص بہت زور سے ہنسا اور پھر بولا۔ "ہماری اِس نئی دُنیا میں آنے والو! خُوش آمدید!"

اِس عجیب اور حیرت انگیز انسان کو دیکھ کر نجمہ اور زرینہ گھبرا کر میرے پیچھے ہو گئیں۔ اُن کے چہروں سے خوف جھلک رہا تھا اور وہ پلک جھپکائے بغیر اس آدمی کو دیکھے جا رہی تھیں، جان نے پہلے تو اُسے تعجّب سے دیکھا اور پھر نڈر ہو کر بولا۔ "تُم کون ہو اور اِس ہال میں کیا کرنے آئے ہو۔ والٹر کہاں گیا؟"

"آقا والٹر بیرونی دُنیا میں ہیں اور آپ بیرونی دُنیا والے اِس ہال سے مُنتقل ہو کر ایک سنٹی میٹر والی دُنیا کے اِس ہال میں آ گئے ہیں۔ دیکھنے میں دونوں

ہال ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ لیکن اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے کے لیے ایک ہی قسم کے دو ہال اور دو مشینوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔ رہا میں، تو میں بھی آقا والٹر کا ایک قیدی ہوں اور دراصل مرّیخ کا باشندہ ہوں۔۔۔۔۔"

"نہیں شاید تُم جھوٹ بولتے ہو؟" جیک نے کہا۔ "ہم ابھی تک اُسی سیّارہ زہرہ والی دنیا میں ہیں۔ یہ ہال ویسا ہی ہے اور اِس میں سوا تمھارے اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔"

"آپ بے شک یقین نہ کریں۔" چار ہاتھ والا انسان بولا۔ "لیکن حقیقت یہی ہے۔ جلد ہی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ ویسے میں آپ حضرات سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے یہاں رُکا تھا کہ آقا والٹر نے آپ کو مکمّل آزادی دی ہے۔ آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ کوئی آپ کو روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ اِس دُنیا میں آپ کو پہاڑ، ندی، نالے، درخت،

گھاس وغیرہ سب کُچھ نظر آئیں گے البتّہ ایک چیز نئی ہوگی اور وہ ہوں گے یہاں کے لوگ! آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔ مُجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں اب ایک ضروری بات اور کہنی ہے۔ اِس دُنیا میں آپ کو اپنی حفاظت خود ہی کرنی ہوگی۔ آپ کو نہ تو کوئی ہتھیار ملے گا نہ کوئی اور چیز۔ ویسے آپ اگر چاہیں تو یہ چیزیں بنا سکتے ہیں، آپ کو اِس سِلسلے میں کوئی نہیں روکے گا بس مُجھے اتنا ہی عرض کرنا تھا۔"

اِس سے پہلے کہ میں اُس سے کُچھ اور دریافت کرتا، وہ حیرت انگیز انسان آسٹریلیا کے کینگرو کی طرح پھُدکتا ہوا ایک سیکنڈ میں ہال سے باہر چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے پہل میں بھی یہی سمجھا تھا کہ ہمیں بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ ہال وہی ہے، مگر ہم سے کہا یہ جارہا ہے کہ ہم ایک سینٹی میٹر کی دُنیا والے ہال میں ہیں، لیکن اب اِس آدمی کو یوں پھُدکتے دیکھ کر تعجّب ہوا اور کُچھ کُچھ یقین ہوگیا کہ شاید والٹر کی بات ٹھیک ہی ہے۔

ڈرتے ڈرتے ہم اِس ہال کے دروازے سے باہر آئے۔ باہر کا منظر دیکھ کر میں بھونچکا وہ گیا۔ سبز گھاس پر مختلف جسامت کے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے لڑرہے تھے۔ یہ لوگ عجیب عجیب رنگوں کے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو اپنی ہی دُنیا کے چند انسان بھی وہاں نظر آئے۔ ان لوگوں سے ہاتھی کے سے کانوں والے کُچھ پستہ قد لوگ لڑرہے تھے۔

"یہ کیا ہورہا ہے فیروز صاحب؟"جیکسن نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم واقعی ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں ہیں اور یہ دُنیا والٹر کے نزدیک ایک قسم کا چھوٹا سا عجائب گھر یا پھر چڑیا گھر ہے۔"

"تُم ٹھیک کہہ رہے ہو فیروز!" جان نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ "دراصل ہمارے نظامِ شمسی کے تمام سیّاروں کی مخلوق یہاں لا کر جمع کر دی گئی ہے۔ دُنیا، مِرّیخ، زہرہ، زحل، عطارد وغیرہ سیّاروں کے انسان یہاں لا کر قید کر دیے گئے ہیں اور شاید اِس دُنیا میں جو مصنوعی فِضا پیدا کی گئی ہے،

وہ لوگوں کو آپس میں لڑنے کے لیے اُکساتی ہے۔“

”اِسی لیے لوگ بلا کسی مطلب اور غرض کے آپس میں لڑ رہے ہیں!“ زرینہ کی سہمی ہوئی آواز سُنائی دی۔

”اور شاید اِسی لیے وہ چار ہاتھ والا انسان ہم سے یہ کہہ کر گیا ہے کہ ہمیں اپنی حفاظت خود کرنی ہوگی۔“ امجد جلدی سے بولا۔

بہت دیر تک ہم آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ ہم ابھی تک ہال کے دروازے میں ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اِس لیے ہم خواہ مخواہ لڑتے ہوئے انسانوں کی بھیڑ میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور حاصل کرنا تھا، یا پھر خود بنانا تھا۔ میں دوسروں کو بلا وجہ مارنا نہیں چاہتا تھا، لیکن ہتھیار کی اس لیے ضرورت تھی کہ دوسروں کے وار سے خود کو بچانا بھی ضروری تھا۔
جان نے کُچھ دیر پہلے ہم کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہم لوگوں کی نظروں سے بچتے

ہوئے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔ پھر وہاں جا کر پتلے پتلے درختوں کی مضبوط شاخوں کی کمانیں بنا لیں۔ اِن کمانوں میں پتھرّ رکھ کر تیر کی طرح دوسروں پر پھینکیں۔ یہ ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہو گا، کیوں کہ جتنے بھی لوگ وہاں آپس میں لڑ رہے تھے وہ یا تو ہاتھوں سے لڑ رہے تھے، یا پھر درختوں کی لکڑیاں ایک دوسرے پر برسا رہے تھے۔

جان کا اشارہ پاتے ہی ہم قطار بنا کر درختوں اور چٹاّنوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں صرف اِتنا کہوں گا کہ ہم نے ایسی نو کمانیں تیاّر کر لیں۔ بہت سارے پتھرّ بھی جمع کر لیے اور پھر یہ تہیّہ کر کے کہ جب تک کوئی خود ہمیں نہ چھیڑے گا، ہم بھی کسی کو کُچھ نہ کہیں گے، باہر آ گئے۔ لوگ لڑتے لڑتے تھک جاتے تھے، لہولہان ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور جب تھکن اُتر جاتی تھی تو پھر دوبارہ اُٹھ کر لڑنے لگتے۔ دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اِس دُنیا کے راز جان

لوں تاکہ ہر نئی آنے والی آفت سے وقت پر بچا جا سکے۔ مگر اِس کا موقع تو اُسی وقت مل سکتا تھا جب کہ میں اِس لڑتے ہوئے غول سے بچ کر نکل جاتا!

ہمارے باہر آتے ہی کُچھ لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ ہم سے یوں ہی تفریحاً لڑنے کے لیے ہماری طرف لپکے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم نے پتھّروں کی ایک باڑھ اُن کی طرف ماری۔ چوں کہ پتھّر کمان کے ذریعے قوّت کے ساتھ پھینکے گئے تھے، لہٰذا وہ لوگ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ہم اُن سے بچتے بچاتے اور کبھی کبھار اُن کی طرف پتھّر پھینکتے جلد ہی وہاں سے کافی دور آ گئے۔ ہمیں بھاگتے دیکھ کر جنگ جُو قوم نے بھی ہمیں دوڑ کر پکڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ دیکھ کر میں نے خُدا کا شُکر ادا کیا اور پھر ایک گنگناتے ہوئے چشمے کے کنارے بیٹھ کر میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"اِس دُنیا کے عجیب رسم و رواج ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ والٹر نے ہمیں

یہاں کیوں بھیجا ہے؟"

"سوال یہ نہیں کہ ہمیں یہاں کیوں بھیجا گیا ہے؟" جان نے کہا۔ "بلکہ اہم سوال یہ ہے کہ یہاں سے ہم واپس سیّارہ زہرہ میں کس طرح جائیں؟"

"سیّارہ زہرہ میں تو ہم موجود ہی ہیں۔" جیکسن نے جلدی سے کہا۔ "ہاں دیکھا جائے تو ہم زہرہ کی دُنیا کی ایک چھوٹی سی دُنیا میں ہیں۔" امجد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"والٹر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہم واقعی ایٹم سے بھی چھوٹے ہو گئے ہیں۔" میں نے جان کو مخاطب کیا۔ "یہی وجہ ہے کہ صرف ایک سینٹی میٹر مربّع دُنیا ہمیں ہزاروں اور لاکھوں میل لمبی دُنیا نظر آ رہی ہے۔"

"بے کار باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔" زرینہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "خُدا کے لیے یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب سوچو۔"

"تُم فکر نہ کرو بیٹی، ترکیب میں جانتا ہوں۔" جان نے مُسکرا کر جواب دیا۔ ہم لوگوں کی حیرت زدہ نظریں ایک ساتھ اُس کی طرف اُٹھیں۔

"ہاں میں۔۔۔۔" جان نے فخریہ کہا۔ "جس وقت والٹر اُس مشین کے بٹن دبا رہا تھا، جس کے ذریعہ ہم ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں آتے ہیں، تو میں نے بٹنوں کی ترتیب اپنے دماغ میں بِٹھالی تھی۔ ایسی ہی ایک مشین یہاں یعنی اِس دُنیا میں بھی موجود ہے۔ اگر میں بٹنوں کی ترتیب کو اُلٹ دوں تو مُجھے پکّا یقین ہے کہ ہم واپس اُسی ہال میں اپنی اصلی جسامت میں پہنچ جائیں گے جہاں والٹر موجود ہے۔"

بے پناہ خُوشی کے باعث ہمارے چہرے دمکنے لگے مگر یہ خُوشی عارضی تھی کیونکہ جب ہم نے یہ سوچا کہ واپس جانے کے بعد شاکا کے سامنے پیش ہونا پڑے گا اور خُدا جانے وہ کم بخت ہم سے کیا سلوک کرے تو ہماری اُمّیدوں پر اوس پڑ گئی۔ لیکن مُصیبت میں انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے اور

صرف خُدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ یہ بات ہم اچھّی طرح جانتے تھے۔ اِس لیے ہم نے یہ پکّا اِرادہ کر لیا کہ فی الحال تو اِس دُنیا کے عجائبات دیکھتے ہیں، جب خُدا کو منظور ہو گا ہمیں خود ہی اِن بلاؤں سے نجات مل جائے گی۔

میں نے اِس دُنیا کو اب غور سے دیکھا۔ دراصل مصنُوعی دُنیا تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا کسی نے یہ دُنیا آرام سے بیٹھ کر بنائی ہے۔ درخت اور گھاس وغیرہ قدرتی طور سے آگے ہوئے نظر نہیں آتے تھے، اِسی طرح زمین، پہاڑ، ندی نالے سب مصنُوعی دِکھائی دیتے تھے۔ مُجھے یوں لگا جیسے میں بمبئی کے کسی فلم اسٹوڈیو میں پہنچ کر وہاں پر لگا ہوا کوئی فلمی سیٹ دیکھ رہا ہوں۔ اِس دُنیا کے آسمان پر کُچھ پرندے بھی اُڑ رہے تھے اور وہ پرندے شاید وہی چار بازو والے پرندے تھے جنھیں میں اب سے بہت پہلے دیکھ

چکا تھا یعنی وہی لمبی گردنوں والے سارس۔ والٹر بتا چکا تھا کہ یہ سارس بہت خطرناک ہیں اور انسانوں کو آسانی سے چونچ میں دبا سکتے ہیں۔ اِسی سے آپ اُن کی جسامت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آسمان پر مُجھے ایک چمک سی بھی نظر آتی تھی اور یہ چمک یقیناً پلاسٹک کی اِس دُنیا کی چھت کی تھی!

ہم مختلف گھاٹیاں اور چٹّانیں پھلانگتے جلد ہی ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے ایک بھیانک اور خوف ناک جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ اِس جنگل کے سِرے ہی پر ہمیں کچھ انسان آپس میں لڑتے ہوئے نظر آئے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ پہلے کی طرح ہماری طرف لپکے مگر ہم اپنے کمان والے ہتھیار کو پہلے ہی استعمال کر چکے تھے۔ وہ لوگ زخمی ہو کر گِرے اور ہمیں دیکھتے ہوئے کراہنے لگے۔ چوں کہ تعداد میں وہ کل چار تھے، اِس لیے ہمیں اِن سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جان اور جیک جلدی سے اُن کے پاس پُہنچے اور انہیں بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ان میں سے ایک انسان تھا یعنی

ہماری اپنی دُنیا کا رہنے والا آدمی۔ باقی تین مختلف سیّاروں سے تعلّق رکھتے تھے۔ اِن کے جسم کے رنگ بھی الگ الگ تھے۔ ایک سُرخ رنگ کا تھا دوسرا زرد رنگ کا اور تیسرا بالکل سفید۔ ہمارے پتھرّوں نے انھیں زیادہ چوٹ نہیں پہنچائی تھی۔ جب ہم نے اِن سے ہمدردی جتائی اور اِن کے زخمی اعضاء کو تھپتھپایا تو وہ ممنون اور احسان مند ہو گئے۔ شاید اِس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں ایک خاص صفت یہ بھی تھی کہ خواہ کوئی کسی زبان میں بولے، دوسرا اِس کا مطلب فوراً سمجھ لیتا تھا۔ اس لیے جب وہ بولے، تو ہم اُن کا ایک ایک لفظ سمجھتے رہے۔

"آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہمیں اُٹھایا۔۔۔۔ مگر آپ نے ایسا کیوں کیا؟" زرد رنگ والے نے، جو زحل کا باشندہ تھا اور جس کے کان ہاتھی جیسے تھے، پوچھا۔

"ہم انسان ہیں اور ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے کی مدد کرے۔"

میں نے جواب دیا۔

"آپ بھی انسان ہیں!" سفید رنگ والا، جو غالباً سورج کے قریبی سیّارے عطارد کا باسی تھا، حیرت سے بولا۔ "مگر یہاں پر یہ لڑائی تو انسانوں نے ہی آ کر شروع کرائی ہے۔ آپ کیسے انسان ہیں جو صلح صفائی کی باتیں کرتے ہیں!"

"ہاں۔۔۔ اور یہ انسان کہتا ہے!" سُرخ رنگ والے نے زمین کے انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کہ اِس کی اپنی دُنیا میں یہی ہوتا ہے۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہے اور جب تک وہ کسی کو کسی سے لڑوا نہ دے اِسے چین ہی نہیں ملتا۔"

"یہ بُرے انسانوں کی فطرت ہے دوست۔ اچھّے انسانوں کا کام یہ نہیں ہے۔" میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

بڑی دیر تک ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ یہ راز اب کھلا کہ وہاں کے لوگ آپس میں کیوں لڑتے رہتے تھے۔ در حقیقت زمین کے چند انسانوں نے جو ہماری طرح شاکا کے اور پھر والٹر کے قیدی بنے تھے۔ اس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں یہ افراتفری مچائی تھی۔ انہوں نے ہی سب کو آپس میں لڑوایا تھا۔ بہر حال جب زحل، عطارد اور مرّیخ کے انسانوں کو یقین ہو گیا کہ ہم ایسے نہیں ہیں تو وہ ہم میں گھُل مل گئے۔ ہم نے ان سے بہت سی کام کی باتیں معلوم کیں۔ اُن سے بات چیت کے دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سب شاکا سے نفرت کرتے ہیں اور زہرہ کے پہلے ڈکٹیٹر شاگو کی بہت عزّت کرتے ہیں۔ وہ دِل سے چاہتے ہیں کہ شاگو اگر قید میں ہے تو آزاد ہو جائے، کیوں کہ شاگو کے آزاد ہونے کے بعد ہی وہ اپنے اپنے سیّاروں کو واپس جا سکتے ہیں۔

ہم اِس قدر تھک چُکے تھے کہ اب ہماری آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ چوں

کہ اس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں ہمیشہ دِن ہی رہتا تھا، لہٰذا ہمیں یہ تو پتہ چلا نہیں کہ کب رات ہوئی؟ تھکن سے ہی ہم سمجھ گئے کہ ہمیں اب آرام کر لینا چاہیے۔ جنگل کے ایک محفوظ گوشے میں ہم نے سونے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک شخص کو پہرے پر تعینات کر کے جلد ہی ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ پتہ نہیں ہم کب تک سوتے رہے اور کس کس نے باری باری پہرہ دیا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب میری باری آئی تو امجد نے مُجھے جگایا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "سنئے، مُجھے کسی کے کراہنے اور چیخنے کی آواز آرہی ہے۔"

میں جلدی سے اُٹھ گیا اور کان لگا کر وہ آواز سُننے لگا۔ واقعی کوئی شخص ہم سے بہت ہی قریب کراہ رہا تھا۔ میں نے امجد کی مدد سے فوراً سب کو اُٹھایا اور پھر کہا کہ جو کوئی بھی وہ شخص ہے اُسے تلاش کیا جائے۔ جنگل میں اندھیرا کافی تھا اور جگہ جگہ اونچی چٹّانیں بھی تھیں۔ جیسے ہی ہم ایک چٹّان

کے قریب پہنچے تو چٹّان کے غار میں سے وہ آواز بہت صاف سُنائی دینے لگی۔ خُدا کا شُکر ہے کہ ہمارے پاس ایک ٹارچ اب بھی موجود تھی۔ میں نے غار میں اُترنے کے بعد ٹارچ کی روشنی سامنے کی طرف ڈالی۔

اچانک میں چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ غار کی دیوار سے لگا ہوا اور چند موٹی موٹی زنجیروں سے جکڑا ہوا ایک شخص کھڑا ہے۔ وہ شخص دیکھنے میں زہرہ کا باشندہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جو زنجیریں بندھی ہوئی تھیں وہ غار کی دیوار میں بہت اونچی جگہ پیوست تھیں۔ ہمیں اندر آتے دیکھ کر وہ شخص بھی ہمیں حیرت سے دیکھنے لگا۔ مُجھے اُس کی شکل جانی پہچانی معلوم ہوئی اور اِس سے پہلے کہ میں کُچھ کہتا جان جلدی سے آگے بڑھا اور بے تابی سے اُس شخص سے لپٹتے ہوئے بولا۔

"تُم۔۔۔۔ یہ تُم ہوشاگو۔۔۔۔ یہ تمھاری کیا حالت ہوگئی ہے۔"

قیدی نے بھی اِسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور پھر حیرت سے ہمیں دیکھتے

ہوئے کہا۔

"ہاں یہ میں ہوں مسٹر جان۔۔۔۔ میں جانتا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ مُجھے آپ کے وعدے پر پورا بھروسہ تھا۔"

"مگر۔۔۔ مگر یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔" جان نے پوچھا۔

"میں آپ کو سب کُچھ بتاؤں گا۔ ایک ایک بات بتاؤں گا۔ پہلے آپ اطمینان سے یہاں بیٹھ جائیں۔" شاگو نے ہمیں باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں اطمینان سے بیٹھنے نہیں آئے عزیز دوست۔" جان نے اُس کے ہاتھوں سے بندھی ہوئی زنجیروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہیں آزاد کرانے آئے ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کس طرح آزاد کرایا جا سکتا ہے؟"

"یہ فی الحال مُشکل نظر آتا ہے۔" شاگو نے نا اُمیدی کے لہجے میں کہا۔

بارہ آدمیوں نے وہ جال اُٹھا کر
کندھوں پر رکھ لیا

"اِسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ آپ یہاں زمین پر بیٹھ جائیں، پہلے میری داستان سُنیں پھر اپنی مُصیبت بیان کریں۔"

شاگو بھی بے بس تھا اور ہم بھی لاچار و مجبور تھے۔ اِس لیے ہم خاموشی سے پتھرّ کی زمین پر بیٹھ گئے۔ میرے ذہن میں کُچھ سوالات کلبلا رہے تھے جو میں شاگو سے دریافت کرنا چاہتا تھا۔ مثلاً اُسے زہرہ کی بڑی دُنیا میں قید کرنے کی بجائے اِس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں کیوں قید کیا گیا۔ دوسرے اُس کا پہاڑ جیسا قد سُکڑ کر ہمارے قدوں کے برابر کس طرح ہو گیا اور تیسرے اُسے کس نے یہاں قید کیا؟ میں مصلحتاً خاموش رہا، کیوں کہ یقین تھا کہ جب جان اور شاگو کی باتیں ہوں گی تو یہ جواب مُجھے خود بخود مل جائے گا۔

"مجھے یہ اچھّا نہیں لگتا کہ میں تو یہاں اطمینان سے بیٹھا رہوں اور تُم دیوار سے زنجیروں کے ذریعے جکڑے رہو۔" جان نے کُچھ دیر کی خاموشی کے

بعد شاگو سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تمہیں جلد سے جلد اِس قید سے آزاد کرا دوں۔“

”یہ کام آسان نہیں مسٹر جان۔“ ”شاگو نے کہا۔ ”آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میرا قد کِس قدر چھوٹا کر دیا گیا ہے اور یہ قد اسی لیے چھوٹا کیا گیا ہے کہ میں زور لگا کر دیوار میں سے یہ زنجیریں نہ نکال لوں۔ بڑے قد کی وجہ سے مُجھ میں طاقت بھی بہت زیادہ ہوتی مگر قد گھٹ جانے سے طاقت بھی کم ہو گئی ہے۔“

”لیکن اگر ہم سب لوگ مل کر کوشش کریں تو کیا یہ زنجیریں دیوار میں سے نہیں نکال سکتے؟“ جان نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ یہ زنجیریں ایک خاص دھات کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ کسی چیز سے نہیں کٹ سکتیں سوائے ایک چیز کے۔“

"وہ کون سی چیز ہے؟"

"یہی سب بتانے کے لیے تو میں نے کہا ہے کہ آپ آرام سے بیٹھ کر میری داستان سُنیں مگر آپ اُلٹے سوال ہی کیے جا رہے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔۔!" جان صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

شاگو نے ہمیں غور سے دیکھنا شروع کیا۔ شاید وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں آپ حضرات میں سے تقریباً سب ہی کو جانتا ہوں، مگر یہ پانچ نئے آدمی کون ہیں؟" اُس نے جیکسن اور اُس کے ساتھی اور تین نئے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ مختصر طور پر اُسے اپنے سبز سیّارے پر اُترنے اور وہاں پر پیش آئے ہوئے خطرات کے بارے میں جان نے تفصیل سے سب کُچھ بتا دیا۔ نجمہ اور امجد کی گُمشدگی اور اُن کا دوبارہ سبز سیّارے پر ملنا۔ مکڑ

آدمیوں اور کاگی کی زندہ چٹّانوں سے جنگ کے بارے میں سُن کر شاگو کو بڑی حیرت ہوئی۔ جیکسن اور اُس کے ساتھیوں کا معلوم ہو کر اُسے بہت افسوس ہوا اور آخر کار وہ جان سے کہنے لگا۔

"یہ تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا کہ میں جیگا سے پہلے اِس سیّارے کا ڈکٹیٹر تھا۔ میں امن پسند ہوں اور جیگا شیطانی طبیعت کا مالک تھا۔ جیگا آپ کی زمین پر گیا اور مارا گیا۔ اُس کا نائب شاکا اس کا انتقام لینے کی خاطر اچانک یہاں کی سیاست میں داخل ہو گیا۔ اس نے عوام کو میرے خلاف بھڑکایا۔ لوگ میرے مخالف ہوتے گئے اور شاکا اُن کے دِل میں گھر کرتا گیا۔ آخر ایک دِن شاکا کی مختصر سی فوج نے مُجھے قید کر لیا اور وہ زہرہ کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ ڈکٹیٹر بنتے ہی اُس نے جیگا کا انتقام لینے کی ٹھانی اور جب اُسے عِلم ہوا کہ جیگا کو ختم کرنے میں آپ اور آپ کے بچّوں کے علاوہ آپ کے ساتھیوں کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے تو اس نے فوراً اپنا ایک نمائندہ آپ کی

دُنیا میں بھیج دیا۔"

"آپ کا مطلب شاید والٹر اسمتھ سے ہے۔" جان نے درمیان میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ ویسے اس کا زہروی نام کوراک ہے۔ یہ بہت زیادہ قابل، عقل مند اور ہمّت والا ہے۔ اِس نے زمین پر جا کر جو گُل کھلائے وہ آپ سب ہی جانتے ہیں۔ انہیں دہرانے سے کیا حاصل۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہوا۔ میں اِس زمانے میں زہرہ کی بڑی دُنیا ہی میں قید تھا۔ کوراک کے زمین پر جانے کے کافی عرصے کے بعد مُجھے علم ہوا کہ اس کے اور شاکا کے ارادے کیا ہیں؟ میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے کُچھ جان نثاروں کی مدد سے آپ کو راکٹ کا فارمولا بھجوایا۔ کیوں کہ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ اگر آپ یہاں زہرہ میں نہ آئے اور یہاں آکر آپ نے شاکا کو ختم نہیں کیا تو پھر شاکا اور اُس کا نائب کوراک آپ کی زمین کو تباہ کر دیں گے۔"

"ہاں، اُن کا ارادہ یہی تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"مسٹر فیروز یہ بات مُجھے کسی حال میں منظور نہیں تھی۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ مسٹر جان اور ان کے دو ساتھی یعنی سوامی اور جیک ہی یہاں آئیں مگر کُچھ ایسے اتّفاقات پیش آئے کہ سب ہی کو آنا پڑ گیا۔"

"چلیئے اِسے چھوڑ یئے، یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں آپ کی کُچھ خدمت کرنے کا موقع ملا۔" میں نے کہا۔ "اب آپ یہ فرمائیے کہ پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا۔ مُجھے بتایا گیا کہ آپ کے یہاں تک پہنچنے کے درمیان میں بڑی رکاوٹیں پیدا کی گئیں اور قدم قدم پر آپ کو روکا گیا۔ اِس عرصے میں مُجھ پر بے حد سختیاں کی گئیں۔ مُجھے جکاریوں سے پٹوایا گیا۔ اب بھی ایک خاص وقت میں جکاری اِس غار میں داخل ہوتے ہیں اور مُجھ پر ہنٹروں کی بارش کر دیتے ہیں۔ میرے حامی کہیں مُجھے آزاد نہ کرائیں، اِس ڈر سے

شاکا نے مُجھے کوراک کی اِس چھوٹی سی دُنیا میں مُنتقل کر دیا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ اِس دُنیا میں رہ کر مُجھے روزانہ ظُلم سہنے پڑتے ہیں۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ شاید میں کبھی آزاد نہ ہو سکوں گا لیکن اب آپ کے آنے سے کُچھ ڈھارس بندھی ہے۔"

"لیکن ابھی آپ نے کہا تھا کہ ہم مل کر بھی اِن زنجیروں کو نہیں نکال سکتے۔" جان نے کہا۔ "پھر بھلا ہم کس طرح مدد کریں گے؟"

"میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ یہ زنجیریں صرف ایک چیز سے کٹ سکتی ہیں؟"

"کس چیز سے؟" جان نے اشتیاق سے پوچھا۔

"زامبا کی چونچ سے۔ کاش کسی طرح زامبا کی چونچ مل جائے۔" شاگو نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا۔

"یہ زامبا کیا چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چار بازو والے سارس۔" مریخ کے باشندے نے جلدی سے درمیان میں کہا۔

"اور اِن سارسوں کی چونچ سے ہی یہ زنجیریں کٹ سکتی ہیں۔ مگر مُشکل یہ ہے کہ زامباؤں کو پکڑنا آسان نہیں ہے۔ وہ آپ کو چونچ میں اِس طرح دبا لیں گے جیسے آپ کی دُنیا میں کوئی سارس ننّھی سی مچھلی کو پکڑ لیتا ہے۔ مُصیبت تو یہ ہے کہ اِس چھوٹی سی دُنیا میں کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے جس کے ذریعے زامبا کا شکار کیا جا سکے۔" شاگو نے جواب دیا۔

"ہتھیار ہے تو سہی۔ آپ اِن کمانوں کو دیکھئے۔"

شاگو بڑی بے دلی کے ساتھ مُسکرایا اور پھر بولا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اِن کمانوں کے پتھرّوں سے زامبا کا شکار کر سکتے ہیں؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے۔" کوراک نے آپ کو اپنی مشینی شُعاعوں کے ذریعے چھوٹا کر دیا ہے اور اِسی طرح زامباؤں کو بھی چھوٹا کر دیا ہے لیکن

اِس کے باوجود زامبا اتنے ہی بڑے نظر آئیں گے جتنا کہ آپ انہیں زہرہ کی دُنیا میں دیکھ چکے ہیں۔ گھٹنے اور سمٹنے کے باوجود تناسب تو وہی ہے۔"

شاگو بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مانا کہ ہم بے حد چھوٹے ہو گئے تھے مگر اِس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں خود کو اتنا ہی بڑا محسوس کر رہے تھے جتنا کہ زہرہ کی دُنیا میں تھے۔ اِس لحاظ سے وہ خوف ناک چار بازو والے سارس بھی اتنے ہی بڑے تھے جتنے کہ باہر کی زہروی دُنیا میں نظر آتے تھے!

شاگو اتنی دیر تک جو کُچھ کہتا رہا، ہمیں اُس کا ایک ایک لفظ سمجھ میں آتا رہا اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ اِس دُنیا کے ماحول اور فضا کا اثر تھا۔ خود شاگو نے بھی بعد میں یہ بات ہمیں بتائی تھی۔ زرینہ اور نجمہ بڑی خاموشی سے اُس کی داستان سُن رہی تھیں اور سوامی وجیک اِس وقت بھی شیر کی طرح چُست اور چوکنّے تھے۔ جیکسن اور اُس کے ساتھی کی زندگی یا موت اب ہمارے ساتھ ہی تھی اس لیے اُن دونوں کے ہونٹ سِل گئے تھے اور

وہ کسی بھی بات میں دخل نہیں دے رہے تھے۔ باتوں باتوں میں جب اختر کا ذکر آیا تو شاگو نے کہا۔

"آپ اپنے لڑکے کی کُچھ فکر مت کیجئے۔ وہ بالکل آرام سے ہوگا۔ کوراک نے اُسے اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔ جیسے ہی وہ اُس کے دماغ پر سے اپنا اثر ہٹائے گا آپ کا بیٹا پھر سے اختر بن جائے گا۔ اب تو آپ اُسے محفوظ سمجھیئے۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کام یاب ہو گئے اور مُجھے اُمید ہے کہ اب یقیناً ہوں گے، تو ہم اختر کو کوراک کے پھندے سے ضرور نجات دلائیں گے۔"

زرینہ شاگو کی یہ بات سُن کر ممنون نظروں سے اُسے دیکھنے لگی اور پھر ایک لمبا سا ٹھنڈا سانس بھر کر پہلے ہی کی طرح خاموش رہی۔ میں بہت دیر سے شاگو کو دیکھ رہا تھا۔ زنجیروں سے بندھے ہوئے پر بھی وہ مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ اب ہمارے وہاں آنے سے اس کی

ڈھارس بندھ گئی تھی۔ البتّہ اسے بولتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی تھی، کیونکہ وہ اپنی بات سمجھانے کے لیے جب ہاتھ ہلانے کی کوشش کرتا تو انہیں اوپر بندھا ہوا پاتا۔ میں نے یہ بات نوٹ کی اور پھر آہستہ سے بولا۔

"آپ کو آزاد کرانا اب بہت ضروری ہے، کیوں کہ اب آپ ہی ہمیں اِس چھوٹی دُنیا سے باہر لے جا سکتے ہیں۔"

"اور میں صرف زامبا کی چونچ سے ہی آزاد ہو سکتا ہوں۔" شاگو نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"مجھے آپ کی باتوں میں دخل اندازی اچھّی تو نہیں لگتی۔" جیکسن نے پہلی بار کہا۔ "لیکن میں یہ پوچھے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ زامبا کی چونچ آپ کو کس طرح آزاد کرائے گی؟"

"اس کی چونچ میں آری جیسے دانتے ہوتے ہیں۔ دوسرے اُس کی ہڈّی

سے یہ خاص دھات کی بنی ہوئی زنجیریں بہت جلد کٹ سکتی ہیں۔ مریخ اور زحل کے یہ باشندے غالباً اِس راز سے واقف ہوں گے۔" شاگو نے کہا اور اُس کی بات سُن کر مرّیخی انسان نے اثبات میں اپنی گردن ہلائی۔

"تو مطلب یہ ہے کہ اب نہیں جلد سے جلد کسی زامبا کو زندہ یا مُردہ پکڑ لینا چاہیئے؟" جیک نے کہا۔

"اگر آپ مُجھے آزاد کرانا چاہتے ہیں تو میری خاطر آپ کو یہ مُصیبت اُٹھانی ہی پڑے گی۔" شاگو نے کہا۔ "لیکن آپ کو جو کُچھ بھی کرنا ہے فوراً کرنا ہے، کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اِس دُنیا میں پہنچانے کے بعد کوراک مُجھے واپس زہرہ کی دُنیا میں لے جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں اپنے مُحسنوں سے دور ہو جاؤں گا۔"

"آپ کی حفاظت کے لیے کیا ہم یہاں دو آدمی چھوڑ جائیں۔" امجد نے دریافت کیا۔

"بے کار ہے۔" شاگو نے نااُمیدی کے ساتھ سر ہلایا۔ "کُچھ ہی دیر بعد زوک قوم جکاریوں کو لے کر یہاں آ جائے گی اور پھر جکاری میرے جسم پر کوڑے برسائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے آدمی نہ تو وہ منظر دیکھیں اور نہ ہی جکاریوں کی نظروں میں آئیں۔"

"بس تو پھر اب ہم چلتے ہیں۔" جان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے اتنا اور بتا دو کہ ہم زامباؤں کا شکار کس طرح کریں گے؟"

"میں کُچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں کوئی ہتھیار ہی نہیں ہے۔ آپ کو اپنی عقل کو کام میں لانا ہوگا۔ بس اب جائیے۔ میں جکاریوں کی مخصوص بُو سونگھ رہا ہوں۔ وہ کُچھ ہی دیر میں اِس غار کے اندر آنے والے ہیں۔"

ہم نے جلدی جلدی اپنا مختصر سامان اٹھا لیا اور پھر ہر سِمت احتیاط سے دیکھتے ہوئے اُس غار سے باہر آ گئے۔ جنگل میں پہنچنے کے بعد ہم درختوں کے پیچھے چھُپ گئے اور پھر جلد ہی شاگو کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ایک

زوک اور تین جکاری اپنی بھدّی چال چلتے ہوئے غار کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد مُجھے شاگو کے چیخنے اور چلّانے کی آوازیں سُنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ بیچارے پر کوڑے برس رہے ہیں۔ میں دِل ہی دِل میں بڑا پیچ و تاپ کھا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی صورت سے جا کر شاگو کو ان خبیث جکاریوں کے اِس ظُلم سے نجات دلاؤں مگر افسوس مُجھ میں اتنی ہمّت نہیں تھی۔ مُجھے معلوم تھا کہ جکاریوں کے جسم چھونے سے میرا کیا حال ہو گا۔ وہ ہیبت ناک قوم بے پناہ برقی قوّت کی مالک تھی!

اب ہمیں دو بہت ہی ضروری کام کرنے تھے۔ زامبا سارس کو زندہ پکڑنا تھا اور پھر اُس کی لمبی چونچ بھی حاصل کرنی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ معمولی بات نہیں تھی۔ زامبا ایک بہت ہی لمبا طاقت ور اور بڑا پرندہ تھا۔ اپنے چار بازوؤں کی وجہ سے اُس کی رفتار بھی بڑی تیز تھی۔ پلک جھپکتے میں وہ

ہمارے سر پر سے گزر جاتا تھا۔ مُجھے یہ بھی عِلم تھا کہ ہمیں کسی میدان میں کھڑا دیکھ کر وہ ہم پر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکے گا۔ لہٰذا اُس کی نظروں میں آئے بغیر ہمیں اُسے پکڑنا تھا۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ ہماری دُنیا میں شکاری ایک معمولی اور چھوٹے سے سارس کو بھی زندہ گرفتار نہیں کرسکتے بھر یہاں تو بات ہی دوسری تھی۔ یہ زامبا سارس ہماری دُنیا کے سارسوں سے بہت بڑا تھا۔ اِس لیے اِسے پکڑنا بڑے جان جوکھم کا کام تھا۔

اس غار سے جس کے اندر شاگو موجود تھا اب ہم بہت دور آ چُکے تھے۔ اس کی چیخ و پکار بھی اب کم سُنائی دیتی تھی۔ ہم ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ پلاسٹک کی اِس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں مُنتقل کرنے سے پہلے والٹر نے ہمیں دو تھیلے دیئے تھے جن میں کھانے کا کُچھ سامان تھا۔ یہ سامان اب ہم نے نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ جنگل بہت گھنا تھا لہٰذا ہمیں یہ خطرہ تو تھا نہیں کہ آسمان پر سے زامبا ہمیں دیکھ لیں گے۔ البتّہ

اگر جنگل میں درندے ہوئے تو پھر ہمیں اُن سے ضرور چوکنّا رہنا تھا!

"بتاؤ فیروز۔ اب کیا کیا جائے؟" جان نے ایک لمبوترا زرد رنگ کا پھل کھاتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو ہمیں زامبا کا شکار کرنا ہے۔"

"مگر تُم اُسے کس طرح شکار کرو گے؟" زرینہ نے جلدی سے کہا۔ "اور پھر وہ ایک انسان کے بس کا تو ہے نہیں۔"

"مالک اُس کا شکار نہیں کریں گے بیگم صاحبہ۔" سوامی نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ کام میں اپنے ذمّہ لیتا ہوں۔"

"تم نے بہت زیادہ کام انجام دیئے ہیں سوامی۔ اب مُجھے بھی کُچھ کرنے کا موقع دو۔" جیک نے کہنا شروع کیا۔ "میں آپ سب سے زیادہ لمبا اور شاید طاقت ور بھی ہوں۔ میری زندگی کوئی اتنی ضروری بھی نہیں ہے۔ اِس

لیے میں ہی یہ کام پورا کر سکتا ہوں۔"

"میرے دماغ میں ایک طریقہ ہے۔ اگر مُجھے موقع ملا تو میں شاید زامبا کو زندہ ہی گرفتار کرلوں۔" امجد نے جلدی سے کہا۔

"آپ کس طرح اتنے بڑے جانور کو پکڑسکتے ہیں؟" نجمہ نے مومنہ بنالیا۔

"چلیئے آپ لوگ کُچھ مت کیجئے۔ بلکہ اس مُہم کو سر کرنے کا بیڑا میں اُٹھاتا ہوں۔" جیکسن نے آخر میں کہا۔

"جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے؟" جان نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ یہ کام کسی ایک کے بس کا نہیں ہے۔ ہم سب مل کر ہی اسے پورا کریں گے۔ اِس سے دو فائدے ہوں گے۔ پہلا یہ کہ کوئی کسی کی جُدائی محسوس نہیں کرے گا۔ اور پھر یہ دُنیا بھی ایسی نہیں ہے کہ ہم کسی کو تن تنہا کہیں جانے دیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ سب کی طاقت مل

کر اِس سارس کو پکڑ سکتی ہے۔ اکیلا ہم میں سے کوئی کُچھ نہیں کر سکتا۔"

شاید یہ تجویز سب ہی کو پسند آئی۔ سب کے چہرے کِھل اُٹھے لیکن اب یہ سوال پیدا ہوا کہ بغیر کسی ہتھیار یا رسّی کے اِس دیو زاد سارس کو کس طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے؟ کچھ ہی دیر پہلے امجد نے ایک بات کہی تھی۔ لہٰذا میں نے اُس سے دریافت کیا۔ "ابھی تُم نے کہا تھا امجد کہ تمہارے ذہن میں زامبا کو پکڑنے کا طریقہ ہے۔ بتاؤ وہ کیا ہے؟"

"جی میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر ہم کسی طرح درختوں کی چھال اور باریک ریشے حاصل کر لیں تو اُن کی مدد سے ایک رسّی بنائی جا سکتی ہے اور پھر اُس رسّی سے ایک بہت بڑا جال بُنا جا سکتا ہے۔"

"خیال تو بُرا نہیں ہے۔" جان نے کہا۔ "لیکن اِس سارس کو پکڑنے کے لیے جو جال بنایا جائے گا وہ رسّیوں سے نہیں بلکہ رسّوں سے بُنا ہوا ہونا چاہیئے۔"

"اس کے لیے کافی سے زیادہ چھال اور ریشے درکار ہوں گے۔" امجد نے جان کی تائید کی۔ "مگر ہمیں اِس دُنیا میں اور کام ہی کیا ہے۔ درختوں کی پتلی پتلی ٹہنیاں اِس مقصد کے لیے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہم سب مل کر توڑلیں گے۔"

"اچھّا پھر کیا ہو گا۔ فرض کرلو کہ جال بن گیا، پھر؟"

"جال کے ساتھ ہی ہم اپنی کمانوں کو اور مضبوط کرلیں گے اور پھر پتھرّوں کی جگہ اِس میں درختوں کی سخت، پتلی اور بالکل سیدھی شاخوں کو کام میں لیں گے۔ یہ شاخیں ہم آگے سے نوکیلی کرلیں گے اور اِن کے پیچھے ایک شگاف دے دیں گے جہاں کمان کی تانت اٹک جائے گی۔"

"مگر معاف کیجئے گا۔ یہ تانت ہم کہاں سے حاصل کریں گے؟" جیکسن نے پوچھا۔

"مجھے یقین ہے کہ اِس جنگل میں کُچھ جانور ضرور ہوں گے۔ انہیں پکڑ کر اِن کی آنتیں نکال کراُن کی تانت بنائی جا سکتی ہے۔"

"آپ کا یہ خیال غلط ہے۔" عطارد کے سفید انسان نے کہا۔ "ہمیں اِس دُنیا میں قید ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ ہم زیادہ تر جنگلوں ہی میں رہے ہیں مگر اتنے لمبے عرصے میں ہم نے ایک بھی جانور نہیں دیکھا۔"

"پھر تانت کی جگہ کوئی اور چیز بھی کام میں لی جا سکتی ہے۔" جان نے کہا۔

"جی ہاں کوئی نہ کوئی طریقہ سوجھ ہی جائے گا۔" امجد بولا۔

"چلو یہ بھی ہو گیا۔۔۔۔ پھر۔" میں نے دِل ہی دِل میں امجد کے ذہن کو داد دیتے ہوئے پوچھا۔

"ہم سب یہ جال اُٹھا کر کسی بھی اُونچے پہاڑ پر چڑھ جائیں گے۔" امجد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ہم زامبا کو

اپنی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ زامبا آسمان پر کہیں نہ کہیں ضرور پرواز کر رہا ہو گا۔ مُجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں دیکھ کر خود ہی ہماری طرف لپکے گا۔ اگر اُس نے ایسا نہیں کیا تو پھر ہم کوئی طریقہ سوچ لیں گے، جس سے وہ ہماری طرف آئے۔ جیسے ہی وہ پہاڑ کی چوٹی پر آئے گا۔ ہم کمند کے ذریعے پہلے اُس کے گلے میں پھندہ ڈالیں گے اور پھر فوراً اُس پر جال ڈال دیں گے۔ جال میں پھنستے ہی اُس پر تیروں کی بوچھار کر دی جائے گی۔ اگر وہ فوراً مر گیا تو اُس کی چونچ کاٹ لیں گے ورنہ پھر اسے گھسیٹ کر شاگو والے غار میں لانے کی کوشش کریں گے۔ بس یہی میرا پلان ہے۔"

کچھ دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ ہم میں سے ہر ایک امجد کی تجویز پر غور کرتا رہا۔ جان نے پھر اپنا سر اُٹھا کر باری باری سب کو دیکھا اور کہا۔ "اور کوئی تجویز کسی کے ذہن میں ہے؟"

سب خاموش رہے۔

"بس تو پھر امجد کی بات پر ہی عمل کیا جائے گا۔ ہر چند کہ اس میں خطرہ ہے مگر خطرے میں تو ہم شروع ہی سے گھِرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہر خطرے کا مُقابلہ بڑی ہمّت اور جاں فشانی سے کرنا پڑے گا۔ اِس تجویز میں وقت پر تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ فی الحال تو مُجھے بھی اِس سے بہتر اور کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔"

جان کی بات سُن کر سب نے مسرّت کا اظہار کیا اور پھر یہ طے کیا گیا کہ فوراً ہی کام شروع کر دیا جائے۔ پھل کھا کر اب جسموں میں جان آ ہی چکی تھی۔ اِس لیے درختوں کی چھال اور پتلی پتلی ٹہنیاں توڑنے کے لیے سب فوراً جُٹ گئے۔ دیکھنے میں تو یہ کام آسان تھا لیکن جتنی مُشکل اور تکلیف پیش آئی وہ تو کُچھ ہمارے ہی دِل جانتے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تو کوئی چاقو تھا اور نہ ہی کوئی کلہاڑا۔ بغیر کسی دھار دار آلے کی مدد کے درختوں کی چھال

اور ٹہنیاں کاٹنا بے حد مُشکل تھا۔ چوں کہ ہمیں شاگو کو ہر قیمت پر آزاد کرانا تھا اِس نے یہ تکلیف برداشت کرنی ہی پڑی۔ جیک اور سوامی نے بڑی پھرُتی اور تیزی دِکھائی، بلکہ جیک نے تو وہیں پر سے چند نوکیلے پتھرّ چُن لیے اور اِن پتھرّوں کے کناروں کو گھِس گھِس کر دھاردار کرلیا۔ بعد میں اُس نے یہ پتھرّ سب میں تقسیم کردیئے اور اِس طرح جو کام مُشکل نظر آتا تھا وہ اب آسان ہو گیا۔

زندگی میں کبھی ایسا کام کیا تو تھا نہیں لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ جب انسان پر پڑتی ہے تو وہ خود ہی سب کُچھ سیکھ جاتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا۔ جیک افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والا انسان تھا۔ لہٰذا رسّے بنانے اور بٹنے کا کام اُسی کی نگرانی میں ہوتا رہا۔ درختوں کی چھال ندی میں بھگوکر نرم کرلی جاتی تھی۔ اسے کوٹا جاتا اور پھر اُسے جوڑ کر آپس میں بل دے دیا جاتا تھا۔ کام محنت طلب تھا اور اُس وقت ہم میں سے کوئی بھی

محنت سے جی نہیں چُراتا چاہتا تھا۔

مختصر یہ کہ ہمارے حساب سے چار دِن کے اندر یہ سب کام ہو گیا۔ رسّوں کا جو جال بنایا گیا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ اگر کسی ہاتھی یا اونٹ پر ڈال دیا جاتا تو وہ اس میں یقیناً چھُپ جاتا۔ اِس کے ساتھ ہی وہ اتنا بھاری تھا کہ ہم قطار بنا کر کھڑے ہوتے اور پھر اُسے اُٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھتے تھے تب اُس کا وزن سہار سکتے تھے۔ امجد اور جیک نے مل کر پتلے پتلے تیر بھی بنا لیے تھے۔ تجربے کے طور پر یہ تیر ایک درخت کی طرف پھینکے گئے اور انہوں نے بالکل ٹھیک کام کیا۔ تیروں کی نوک درخت کے تنے میں جا کر گڑ گئی۔ یہاں میں اتنا اور بتا دوں کہ اپنے تین نئے دوستوں کے کہنے کے مطابق ہمیں جنگل میں کوئی جانور نہیں مل سکا تھا، بلکہ ہم نے ایک خاص درخت کی لچکیلی اور پتلی شاخوں کو تانت کی جگہ استعمال کر لیا تھا اور وہ ہر لحاظ سے کارآمد ثابت ہوئی تھیں۔

اب ہم اپنے دوست شاگو کی مدد کے لیے پوری طرح تیّار تھے۔ ہماری یہ نئی مُہم شروع ہو چکی تھی۔ جن تھیلوں میں سامان بھرا ہوا تھا وہ تو والٹر نے اُس پلاسٹک کی ایک سینٹی میٹر والی دُنیا میں ہمیں بھیجنے سے پہلے ہی اتروا لیے تھے۔ اب ہمارے پاس سوائے کمانوں، لکڑی کے تیروں، درختوں کی چھال سے بنے ہوئے رسّوں اور پتھرّ کے کلہاڑوں کے اور کوئی سامان نہیں تھا۔ پتھرّ کے یہ کلہاڑے ہم نے بعد میں اُن پتھرّوں سے بنا لیے تھے جن سے ہم نے درختوں کی چھال توڑنے کا کام لیا تھا۔ اِس بھیانک ماحول میں بھی میرے ہونٹوں پر ایک بات یاد کر کے مُسکراہٹ دوڑ گئی۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو مُجھے پتھرّ کے زمانے کے لوگ اور ان کے ہتھیاروں کے بارے میں بہت سی باتیں پڑھنی پڑی تھیں یعنی یہی کہ وہ لوگ قدیم زمانے میں غاروں میں رہا کرتے تھے۔ آگ جلانی انہیں نہیں آتی تھی اور جانوروں کا شکار وہ پتھرّ کے کلہاڑوں سے کیا کرتے

تھے۔ ایک لمبے سے ڈنڈے کے سِرے پر چمڑے کے تسموں سے کوئی نوکیلا سا پتھرّ باندھ لیتے تھے اور یہ اُن کا ہتھیار ہو جاتا تھا۔

میں دراصل یہی بات یاد کر کے مُسکرایا تھا۔ دیکھا جائے تو پتھرّ کے زمانے کے اُس انسان میں اور سیّارہ زہرہ کی پلاسٹک والی اِس ننّھی سی دُنیا میں پھنسے ہوئے ہم انسانوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بہر حال یہ بات تو میں نے یوں ہی آپ کو سُنا دی ہے۔ اب میں اصل داستان کی طرف آتا ہوں۔

جیک اور سوامی سب سے آگے، پھر جان، اِس کے بعد میں اور زرینہ، پھر نجمہ اور امجد اُن کے بعد ہمارے تینوں نئے دوست اور سب سے آخر میں جیکسن اور اُس کا ساتھی، اِس ترتیب سے ہم بارہ آدمیوں نے وہ بھاری جال اُٹھایا اور اُسے اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس طرح ہمیں جال کا وزن بالکل محسوس نہیں ہوا۔ کمانیں ہمارے دوسرے کندھے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ جیک ایک دِن پہلے گھنے جنگل کے دوسرے

سِرے پر ایک بہت اونچی پہاڑی دیکھ ہی چکا تھا۔ لہٰذا ہم اپنا رُخ اُس پہاڑی کی سمت کر کے چل پڑے۔

یہ تو لکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہمارے دِل بُری طرح دھڑک رہے تھے۔ ہم ایک انوکھا اور پُرخطر کام انجام دینے جارہے تھے۔ ہمیں بالکل علم نہ تھا کہ ہم کامیاب لوٹیں گے یا ناکام یاب! بس ایک جذبہ تھا، ایک دُھن تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہمیں زامبا کی چونچ حاصل کرنی ہے۔ لیکن کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ جس کام کو ہم نے زیادہ مُشکل نہیں سمجھا۔۔۔ وہ اتنا مُشکل اور تکلیف دہ ثابت ہوا کہ ہمیں اپنی زندگی دوبھر معلوم ہونے لگی۔۔۔!

ہمارے دشمنوں کے ساتھ جال بھی اُٹھنے لگا
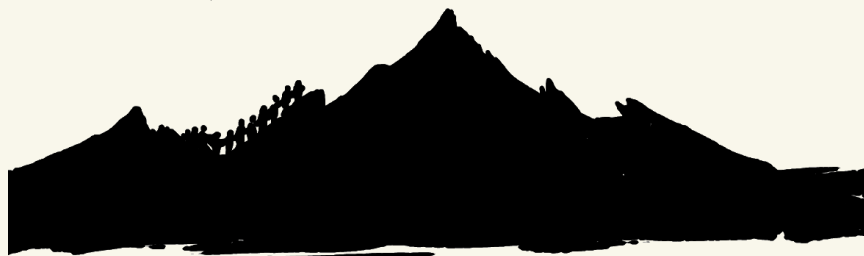
راستہ بڑا دُشوار گزار تھا۔ قدم قدم پر گڑھے اور جھاڑیاں ملتی تھیں۔ اِس کے علاوہ درخت اتنے گنجان تھے کہ ہم ایک سیدھی قطار میں اِس جنگل کو عبُور نہیں کر سکتے تھے۔ مجبوراً ہمیں اژدہے کی طرح بل کھاتے ہوئے گزرنا پڑ رہا تھا۔ زرینہ اور نجمہ کبھی کبھار گر پڑتی تھیں۔ چونکہ اُن کے کندھوں پر جال کا بوجھ برائے نام ہی تھا اور ہم نے اِس سفر کے آغاز میں اِن دونوں کو منع بھی کیا تھا کہ وہ ہماری قطار سے الگ چلیں مگر اُن کے انکار پر مجبوراً انہیں قطار میں شامل کرنا پڑا تھا۔ اب جو وہ دونوں گرتی تھیں تو کسی جھاڑی سے اُلجھ کر یا پھر اچانک گڑھے میں گر جانے پر اُن کا توازن برقرار نہ رہتا تھا۔ ہمارے جسموں پر لباس ویسے بھی برائے نام تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کی نوکیلی ٹہنیوں نے اُسے اور بھی تار تار کر دیا۔ نجمہ اور زرینہ وہی پَروں والا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ اُن کے چھوٹے پَر ٹوٹ کر ہوا میں اُڑنے لگے تھے۔ چونکہ یہ دُنیا ایک زہروی سائنس داں نے بنائی تھی لہٰذا اِس میں

چھوٹے موٹے جانوریا پرندے بالکل نہیں تھے۔ بس وہ پرندے تھے جن کواِس سائنس داں نے اِس چھوٹی دُنیا میں مُنتقل کرنا ضروری سمجھا تھا۔

ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک درخت زور زور سے ہلنے لگے۔ یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آگیا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی ایک زبردست شور بھی سُنائی دینے لگا۔ پھر فوراً ہی دُور دُور تک اندھیرا چھا گیا۔ یہ اندھیرا صرف چند سیکنڈ تک رہا اِس کے بعد جتنی روشنی اُس مقام پر تھی پھر اتنی ہی ہوگئی۔

"یہ کیا تھا؟" زرینہ نے سہم کر پوچھا۔

"شاید طوفان تھا!" امجد نے جواب دیا۔

"نہیں یہ طوفان نہیں بلکہ زامبا سارس آسمان پر سے گزرا تھا۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "آواز اُس کے چار پیروں کی تھی جو تیز رفتاری کے باعث

اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اندھیرا بھی اُسی کے جسم کا سایہ تھا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارس بہت بڑا ہے!" نجمہ ڈرنے لگی۔

"ہے تو بڑا مگر بیٹی ہمارے حوصلے اور ہمارے دِل اِس سے بھی بڑے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اِس سے ڈرنے کی بجائے اب تو تم یہ سوچو کہ تمہیں اُسے قابو میں کرنا ہے۔"

میری بات سُن کر سب پھر خاموشی سے چلنے لگے۔ وہ جنگل کسی صورت سے ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اب ہمیں کبھی کبھار درختوں کے درمیان میں سے وہ چوٹی دکھائی دینے لگی تھی جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ ہم کتنی دیر تک چلتے رہے ہیں مُجھے تو اتنا معلوم ہے کہ ہم بُری طرح تھک کر ایک مقام پر جلدی سے بیٹھ گئے اور پھر اِس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا۔

جب میری آنکھ کھُلی تو میں نے اپنے بدن میں توانائی محسوس کی۔ خُدا جانے ہم کب تک بے ہوش رہے تھے۔ بہر حال اب جب کہ میرے ساتھ دوسروں کو بھی ہوش آیا تھا تو ہم نے خود کو دوبارہ ترو تازہ پایا۔ میں کُچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک نجمہ خوف زدہ آواز میں چِلّائی۔

"ابّا جی۔۔۔وہ۔۔۔۔وہ اُدھر دیکھئے۔"

میرے اُدھر دیکھتے ہی دو سائے جلدی سے ایک بڑے سے درخت کی اوٹ میں چھپتے ہوئے نظر آئے۔ میرے ساتھ ہی غالباً سب نے اُس سِمت میں دیکھا تھا۔

اِس سے پہلے کہ میں کُچھ کہتا، جیک بجلی کی سی تیزی سے اُٹھا اور ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا اُس مقام پر جا پہنچا جہاں میں نے سائے چھُپتے ہوئے دیکھے تھے۔ جیک کی مدد کے لیے سوامی بھی پیچھے پیچھے پہنچا۔ اُن دونوں نے جلدی جلدی ہر مقام کو دیکھ لیا لیکن غالباً وہ اُن سایوں کو نہ پا سکے!

”کہیں وہ تمہارا وہم تو نہیں تھا نجمہ؟“ میں نے نجمہ سے دریافت کیا۔

”اگر وہم ہوتا تو میری آواز سُن کر جیک صاحب اور کلّو سوامی کیوں بھاگتے ابّا جی؟“

”نجمہ ٹھیک کہتی ہیں فیروز صاحب۔ وہاں درحقیقت دو آدمی چھُپے ہوئے تھے۔“ جیک نے قریب آتے ہوئے کہا۔

”واقعی!“ میں نے تعجّب سے اُسے دیکھا۔ ”مگر یہاں کون ہماری جاسوسی کرنے آسکتا ہے؟“

”اِس کا جواب میں بھلا کیا دوں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ کُچھ لوگ شاید ہم پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور وہ چھُپ کر ہماری تمام حرکتوں کو دیکھ رہے ہیں۔“ جیک نے کہا۔ ”لیکن آپ فکر مت کیجئے۔ میں اب سب سے آگے آگے چلتا ہوں اور ان کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرتا ہوں۔“

یہ ایک نئی مُصیبت تھی۔ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا تھا اور تعاقب کا مطلب یہ تھا کہ اب ہمیں قدم قدم پر چوکنّا رہنا ضروری تھا۔ اِس دُنیا میں سب سے پہلے ہمیں لڑنے والے لوگ ملے تھے۔ انہوں نے ہم پر حملہ بھی کیا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ شاید وہی ہوں، لیکن پھر یہ خیال مُجھے غَلَط معلوم ہوا۔ اُن لوگوں نے ہمیں دیکھتے ہی ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ چھُپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ دو آدمی جو اَب ہم سے چھُپ کر آگے آگے چل رہے تھے، اُن کی نیّت ٹھیک نہیں تھی اور یقیناً وہ ہمیں کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتے تھے۔

مِرّیخی انسان نے بھی مُجھے یہی بات بتائی۔ اُس نے کہا کہ اگر ہمارے کچھ دشمن ہیں تو انہیں یہاں کی رسم کے مطابق فوراً ہی ہم پر حملہ کر دینا چاہیئے تھا، لیکن یہ جاسوس کسی اور ہی مقصد کی خاطر ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ بہر حال ہمیں پہاڑ کی چوٹی تک کسی نہ کسی طرح پہنچنا ضروری تھا۔ ہم

نے یہ تہیّہ کرلیا کہ اگر دُشمن نے ہماری راہ میں کُچھ روڑے اٹکائے تو ہم اُس سے بھی نپٹ لیں گے۔ جیک بھی پھر فوراً ہی واپس آگیا۔ اُسے خود بڑا تعجّب تھا۔ وہ بار بار مُجھے یقین دلاتا تھا کہ اُس نے دو سائے یقیناً دیکھے ہیں مگر پتہ نہیں اچانک وہ کہاں چھُپ گئے؟

میں نے سب کو دوبارہ کھڑے ہونے اور پھر جال کو پہلے ہی کی طرح لے کر چلنے کی ہدایت کی۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے مختصر الفاظ میں اپنے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی۔ اُن سے کہا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس خُدا نے ہمیں اب تک زندہ رکھا ہے وہی ہماری مدد اور رکھوالی بھی کرے گا۔ سب مطمئن ہو گئے، سوائے مِرّیخ، زحل اور عطارد کے انسانوں کے۔ عطارد کے سفید انسان نے مُجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ۔۔۔ خُدا کون ہے اور کہاں کا باشندہ ہے؟"

مُصیبت میں گھِرے ہونے کے باوجود مُجھے ہنسی آ گئی اور میں نے اُسے مختصراً بتایا کہ خُدا کون ہے۔ اُس سے کہا کہ خُدا ہی اِن لوگوں کا بھی خالق ہے مگر افسوس کہ وہ اِس بات کو نہیں جانتے۔ میرے لگاتار بولنے اور سمجھانے کے بعد بھی ہمارے تینوں نئے دوست خُدا کے بارے میں سوچتے ہی رہے، انہیں میری باتوں کا یقین نہیں آیا تھا!

خُدا خُدا کر کے جنگل ختم ہوا اور مُجھے پہاڑ کی چوٹی نظر آنے لگی۔ یہ پہاڑ میرے اندازے کے مطابق تین ہزار فٹ ضرور اونچا تھا۔ تین ہزار فٹ کی بُلندی پر تھکی ہوئی حالت میں چڑھنا دراصل اچھّے اچھوں کا پتّہ پانی کر دیتا ہے۔ مگر ہمیں پہاڑ پر ضرور چڑھنا تھا۔ لہٰذا اس کے دامن میں کُچھ دیر تک سستا لینے کا پروگرام بنا کر ہم وہیں بیٹھ گئے۔

میری اِس داستان کے پڑھنے والے شاید میری باتوں کو مجذوب کی بڑ یا پھر بے پَر کی اُڑائی ہوئی سمجھیں گے۔ مُجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جو

چاہیں سمجھیں لیکن یہ حقیقت ہے جو مُجھ پر بیتی ہے اور جسے میں من و عَن تحریر کرتا چلا جا رہا ہوں۔ پہلی مرتبہ یہ بات پڑھ کر کہ میں ایک سینٹی میٹر مربّع دُنیا میں تین ہزار فٹ اُونچے پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہوا سستا رہا تھا، شاید آپ اچنبھے میں پڑ جائیں۔ لیکن ایسا کس طرح مُمکن ہوا؟ اِس کی وضاحت میں پچھلے صفحات میں کر آیا ہوں۔ بار بار ایک بات کو دُہرانے سے کہانی کا مزا جاتا رہتا ہے۔ اِس لیے میں اب آگے کے حالات بیان کرتا ہوں۔

پہاڑ پر چڑھنے سے پہلے ہمارے تین نئے دوستوں نے (جن کے نام اتنے لمبے اور مُشکل تھے کہ مُجھے کبھی یاد ہی نہ ہو سکے) مُجھے ایک بہت ہی عمدہ اور عقلمندانہ مشورہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں لمبی لمبی جھاڑیاں اور درختوں کے بڑے بڑے پتے اپنے اوپر ڈال لینے چاہئیں۔ یا پھر کسی طرح سے یہ جھاڑیاں اپنے کندھوں پر باندھ لینی چاہئیں۔ کیوں کہ اگر زامبا کی نظر پہاڑ پر چڑھتی ہوئی ہماری مختصر سی فوج پر اچانک پڑ گئی تو وہ اوپر سے

ہمیں جھاڑیاں ہی سمجھے گا۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو پھر ہم اُس کی نظروں میں آ جائیں گے۔

بات معقول تھی لہٰذا فوراً اِس پر عمل کیا گیا۔ ہم چلتے پھرتے درخت بن گئے۔ اور پھر درختوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ آہستہ آہستہ پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ زرینہ اور نجمہ سے میں نے بہتیرا کہا کہ وہ دونوں امجد کے ساتھ پہاڑ کے دامن ہی میں رُکی رہیں مگر وہ کسی طرح نہ مانیں۔ نجمہ کہتی تھی کہ اب وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ وہ ہرگز ہرگز مُجھ سے جُدا نہ ہوگی خواہ کتنی ہی مُشکلات اور خطرات سامنے آ جائیں۔ مجبوراً اُس کی بات مان کر اُسے اور زرینہ کو ساتھ لینا ہی پڑا۔ حالاں کہ دِل اندر سے لعنت ملامت کر رہا تھا کہ اپنی نازک اندام بچّی اور کم زور سی بیوی سے میں وہ کام لے رہا ہوں جو دراصل مزدوروں سے لیا جانا چاہیئے۔

پہاڑ پر چڑھنا کوئی آسان کام تو ہوتا نہیں۔ ذرا سی چڑھائی پر ہی سانس

دھونکنی کی طرح چلنے لگتا ہے۔ وہاں تو بات ہی دوسری تھی۔ سیدھا راستہ ہوتا تو چلو ٹھیک تھا۔ اُونچے اونچے پتھرّوں کو بھلا کون پھلانگے؟ وہ تو خُدا بھلا کرے جیک اور سوامی کا کہ وہی دونوں راستے کی رکاوٹیں دُور کرتے جا رہے تھے۔ انکل جان اِس بڑھاپے میں بھی جوانوں کی طرح چڑھ رہے تھے۔ اُن کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے، مگر وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ ہم سب مجبور تھے کہ اپنی حالت دوسرے سے چھپائیں۔ کیوں کہ یہ مقام ایسا تھا کہ سب ہی کو محنت کرنا تھی، اور سب ہی کو چوٹی پر پہنچنا تھا۔

گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے، خود کو سنبھالتے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہوئے آخر کار ہم چوٹی پر پہنچ ہی گئے۔ پلاسٹک کا آسمان اب مجھے بہت قریب نظر آ رہا تھا۔ آسمان پر ایک بھی بادل نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے؟ کیوں کہ یہ دُنیا قدرتی دُنیا تو تھی نہیں۔ ہم یہاں پہنچتے ہی تھک کر گر

گئے اور لمبے لمبے سانس لینے گئے۔ نیچے نظر ڈالنے پر ہمیں درخت اور ندی نالے بالکل چھوٹے چھوٹے نظر آتے تھے اور اتنی بلندی سے نیچے دیکھتے ہوئے بڑا خوف محسوس ہوتا تھا۔

جب حالت ذرا سُدھری اور سینے میں سانس آسانی سے سمانے لگا تو میں نے چوٹی کو بغور دیکھا۔ پہلی نظر میں تو مَیں نے اِس چیز کو کوئی اہمیّت ہی نہیں دی۔ لگی جب ذرا توجّہ سے دیکھا تو مُجھے بڑی حیرت ہوئی۔ بڑے بڑے درختوں کے تنے وہاں کافی تعداد میں بِکھرے ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی بُلندی پر اتنے وزنی تنے کس نے کِس مقصد کے تحت لا کر جمع کیے تھے؟ میں اُن تنوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دوسرے اچنبھے نے سب کو اُس طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

یہ تین بڑے بڑے گُنبد تھے۔ گہرے زرد رنگ کے بیضوی گُنبد تقریباً پندرہ فٹ اُونچے اور بیس فٹ لمبے گیند! دِلّی کی جامع مسجد کے چاروں کونوں

پر جو چار گُنبد ہیں تقریباً اتنے ہی بڑے یہ تین گُنبد تھے!

"کیا یہ کسی کا محل ہے فیروز؟" زرینہ نے پھولے ہوئے سانس کے درمیان میں پوچھا۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔ شاید یہ زمین دوز محل ہے۔ محل کا اندرونی حصّہ تو چوٹی کے اندر رہے اور گُنبد باہر ہیں۔"

"مگر ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟" جان بھی حیرت زدہ تھا۔ "اگر یہ محل ہی ہے تو پھر بڑا عجیب محل ہے؟"

"لیکن گُنبدوں کے چاروں طرف درختوں کے اتنے سارے تنے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟" نجمہ نے پوچھا۔

"شاید اِس لیے کہ گُنبد لڑھک نہ جائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر یہ گُنبد ہیں تو انہیں زمین سے جُڑا ہوا ہونا چاہیئے۔ لڑھکنے کا بھلا کیا

مطلب؟" امجد نے بالکل ٹھیک سوچا تھا۔

"تو پھر میں بتاتا ہوں مالک کہ یہ کیا چیز ہے؟" سوامی نے جلدی سے کہا اور پھر خوف زدہ نظروں سے دُور دُور تک دیکھنے کے بعد بولا۔ "سنئے! یہ گُنبد نہیں بلکہ انڈے ہیں۔"

"انڈے!" سب ایک ساتھ چیخے۔ "جی ہاں انڈے۔۔۔۔۔ زامبا سارس کے انڈے۔" سوامی نے اپنے کندھوں پر سے جھاڑی کھسکاتے ہوئے کہا۔ "یہ اُسی دیوزاد سارس کے انڈے ہیں اور جنہیں آپ لکڑی کے تنے سمجھ رہے ہیں وہ دراصل اُس کے گھونسلے میں رکھے ہوئے تنکے ہیں۔"

تعجّب اور خوف کی سنسنی میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ جنہیں میں گُنبد سمجھ رہا تھا واقعی وہ تو انڈے نکلے۔ بھلا میری اِس بات کا کون یقین کرے گا؟ جن حالات سے اِس وقت میں دوچار تھا، بالکل ایسی ہی باتیں میں نے بچپن میں سندباد جہازی نام کے ایک سفر نامے میں پڑھی تھیں کہ کس طرح

سند باد ایک گُم نام علاقے میں پھنس جاتا ہے اور اُسے بھی رُخ نامی پرندے کے ایسے ہی انڈے نظر آتے ہیں! بڑے تعجّب اور حیرت کی بات تھی!

لیکن وہ وقت تعجّب یا حیرت ظاہر کرنے کا نہیں تھا۔ مُجھے کوشش کرنی تھی کہ کسی طرح خود کو اور اپنے ساتھیوں کو زامبا سے بچاؤں اور اِس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہم سب یا تو وہیں کسی چٹّان کے پیچھے چھُپ جائیں یا پھر لکڑی کے تنوں کے نیچے اِس طرح دُبک جائیں کہ زامبا کی نظر ہم پر نہیں پڑے، قدرت انسان کے حق میں ہمیشہ بہتری ہی کرتی ہے۔ ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر زامبا کو اپنی طرف متوجّہ کریں گے اور جب وہ اُڑتا ہوا ہمارے قریب آئے گا تو اُس پر اپنا بنایا ہوا جال ڈال دیں گے لیکن اب قُدرت نے اپنے آپ ہی زامبا کو پکڑنے کا ایک وسیلہ پیدا کر دیا تھا۔

زامبا کو اِس پہاڑ کی چوٹی پر ضرور آنا تھا۔ اس کے انڈے جو یہاں موجود تھے۔ مچھلی خود ہی کانٹے میں پھنسنے کے لیے آنے والی تھی۔ ہمیں اور کیا چاہیئے تھا؟

ہم جلدی جلدی آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے اور پھر یہ طے پایا کہ اپنے جال انڈوں کے اوپر پھیلا دیں اور اُس کا پھندا اپنے ہاتھوں میں رکھیں۔ جیسے ہی زامبا انڈوں پر آ کر بیٹھے پھندا کس دیا جائے۔ بس اِس کے علاوہ اور کوئی طریقہ اُسے زندہ پکڑنے کا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھندے کی ڈوری ہمارے پاس ہونی چاہیئے تاکہ سب اکٹھے ہی ڈوری پکڑ کر کھینچیں۔ یہ بھی بڑا غنیمت تھا کہ اس وقت ہم کل بارہ آدمی تھے۔ لہٰذا سب کی طاقت ایک ساتھ کام میں لائی جا سکتی تھی۔ زامبا بہت بڑا پرندہ تھا اور اتنے بڑے پرندے کو قابُو میں کرنے کے لیے میرے خیال میں بارہ آدمیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی جب کہ اِن بارہ انسانوں میں دو عورتیں بھی تھیں!

زامبا کے گھونسلے کے تنکوں میں سے (جو درحقیقت لمبے لمبے درختوں کے تنے تھے) ہم نے کُچھ تنکے ایک جگہ لا کر جمع کر دیے اور انہیں اِس طرح جوڑا کہ ایک چھوٹا سا گھر بن گیا۔ اُس پر ہم نے وہ ٹہنیاں اور جھاڑیاں لگا دیں جو کُچھ دیر پہلے ہمارے کندھوں پر تھیں اور پھر اپنے تیّار کردہ اِس چھوٹے سے گھر کے اندر دُبک گئے۔ نجمہ اور زرینہ کے سپُرد یہ کام کیا کہ اگر اتّفاق سے زامبا پر تیروں کی بارش کرنی پڑ گئی تو وہ نوکیلے تیر ہم سب میں جلدی جلدی تقسیم کرتی رہیں۔

مِرّیخ اور زحل کے دونوں باشندے بہت زیادہ خائف تھے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے کہ زامبا کہیں تیزی سے اُن کی طرف تو نہیں آ رہا؟ جیک اور سوامی کُچھ دیر تک چوٹی پر انڈوں کے سب طرف گھوم پھر کر واپس آ چکے تھے۔ دراصل وہ یہ دیکھنے گئے تھے کہ زامبا آسمان پر کہیں قریب ہی تو نہیں منڈلا رہا۔

جب ہم کو اطمینان ہو گیا تو سب نے مل کر انڈوں کے اوپر جال پھیلا دیا۔ میں نے جب ایک انڈے پر چڑھنے کی کوشش کی تو پھسلنے کی بجائے بہت آسانی سے اُس پر چڑھ گیا۔ انڈے کا چھلکا چکنا نہیں بلکہ کھرُدرا تھا اور مُجھے اُس پر چڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا گویا کسی پہاڑی کی ڈھلوان پر چڑھ رہا ہوں۔ جال کے سِرے پھندے میں باندھنے کے بعد ہم اُس کی ڈوری اپنے چھوٹے سے گھر کے اندر لے آئے اور پھر خاموشی سے بیٹھ کر زامبا کا انتظار کرنے لگے۔ اُمّید تو یہی تھی کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے لیکن یہ کامیابی زیادہ تر ہماری پھرُتی اور قوّت پر مُنحصر تھی۔

میں ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ اِس جگہ میں کب تک بیٹھا رہا۔ زمینی حساب سے غالباً تین چار گھنٹے تک میں اُسی گھر کے اندر موجود رہا۔ پھر پریشان ہو کر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ مُجھے کُچھ آوازیں سُنائی دیں۔ آسمان کی طرف دیکھا تو وہ بالکل صاف تھا پھر یہ آوازیں کیسی تھیں؟ جلد ہی یہ معمّہ

بھی حل ہو گیا، کیوں کہ میں نے اب اُن دو آدمیوں کو دیکھ لیا تھا جو انڈوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ایک انڈے پر چڑھتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے!

انڈے کے پیچھے سے پہلے اُن کے سر نمودار ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ وہ پورے طور پر سامنے آ گئے۔ انہیں دیکھ کر مُجھے یہ یقین ہو گیا کہ اِن ہی دونوں کو ہم نے جنگل میں چھُپتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں لمبا سا دھار دار چاقو تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک عجیب قسم کا ہتھیار جو کسی حد تک ہمارے ہاں کے ریوالور سے مشابہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اِس ریوالور کی نال آگے سے بگل کی طرح پھیل گئی تھی۔ پہلی نظر میں تو میں انہیں پہچان ہی نہ سکا لیکن جب ذرا غور سے دیکھا تو حیرت کے باعث میرا مُونہہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔

وہ دونوں آدمی والٹر اور اختر کے علاوہ اور کوئی نہ تھے!

"کہیے حضرات، مزاج تو اچھے ہیں؟" والٹر نے ہماری ہنسی اُڑانے والے انداز میں پوچھا۔

مجھے غصّہ تو بہت آیا مگر مصلحتاً اُسے پی گیا۔ اختر کو دیکھتے ہی زرینہ اور نجمہ بے تابی سے اُٹھ کر اُس کی طرف جانا ہی چاہتی تھیں کہ میں نے اُنہیں بُری طرح ڈانٹا۔ "خبردار اُس طرف مت جانا۔ وہ تمہارا بھائی یا بیٹا نہیں بلکہ ہمارا دُشمن ہے۔"

"خوب، بہت خوب۔" والٹر نے ایک قہقہہ لگایا۔ "تُم تو بالکل کسی فلم کے مکالمے بول رہے ہو۔"

"مگر جو کُچھ اِس نے کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔" اختر نے خوں خوار نظروں سے مُجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں واقعی اِس کا دُشمن ہوں۔"

"اختر۔۔۔" زرینہ نے چلّا کر کہا۔ "اپنے والد سے کس طرح اور کس انداز

سے بات کر رہے ہو؟"

اختر نے جواب کُچھ نہیں دیا۔ بس جلدی سے انڈے پر جھُک کر ہمارے پھیلائے ہوئے جال کو اپنے تیز چاقو کی مدد سے کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھتے ہی جان کا خون کھول گیا، اور اُس نے للکار کر کہا۔

"کیا کرتے ہو اختر۔ ہماری محنت کو اِس طرح کیوں ضائع کرتے ہو؟"

"اختر کو جو حُکم ملا ہے وہ اُسے ضرور پورا کرے گا میرے عزیز دوست۔" والٹر نے قہقہہ لگایا۔

"والٹر۔۔۔ والٹر خُدا کے لیے سوچو کہ کیا ہماری نیکیوں کا یہی صِلہ ہے؟"

"نیکی ویکی تو میں جانتا نہیں۔ میں تو صرف اپنے آقا کا حُکم بجا لا رہا ہوں۔" والٹر یا کوراک نے کہنا شروع کیا۔ "مسٹر جان! میں نے اپنے آقا کے حُکم پر ہی آپ کو اِس ننّھی سی دُنیا میں بھیجا ہے۔ میں جانتا تھا کہ آپ احمق شاگو

کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ مگر بعد میں مُجھے احساس ہوا کہ میرا خیال غَلط تھا۔ آپ سب میری توقّع سے زیادہ خطرناک اور چالاک ہیں۔ آپ کوشاگو نے جو بات بتائی اُسے پورا کرنے کے لیے اِس پہاڑ کی چوٹی پر بھی آ گئے۔ میں زہرہ کی بڑی دُنیا میں سے ایک خُردبین کے ذریعے آپ کی ایک ایک حرکت دیکھتا رہا اور جب مُجھے یہ پتہ چلا کہ آپ ضرور کامیاب ہو جائیں گے تو میں جرمی کو اپنے ساتھ لے کر خود بھی اِس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں آ گیا۔"

"لیکن والٹر خُدا کے لیے سوچو تو سہی کہ ہم ایک بے کس و مجبور آدمی کی خاطر یُوں خطروں میں کودے ہیں۔ وہ شخص تمہاری ہی قوم سے تعلّق رکھتا ہے، تمہارے ہی سیّارے کا باشندہ ہے، ہم اُس سے کُچھ لینے نہیں آئے بلکہ اُس کی مدد کرنے آئے ہیں۔"

"صرف اِسی لیے کہ وہ بعد میں تمہاری مدد کرے گا۔" والٹر نے طنزیہ لہجے

میں جواب دیا۔ "شاگو کی مدد سے ہی آپ لوگ سیّارہ زہرہ سے واپس اپنی زمین پر جا سکتے ہیں۔"

"تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہوتی تو ہم زمین سے زہرہ پر آتے ہی کیوں؟"

"آپ کی کسی دلیل سے میں قائل نہیں ہو سکتا۔" والٹر نے خُشک آواز میں کہا۔ "مُجھے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ زامبا کی چونچ حاصل کر سکیں۔ لہٰذا میں اِس جال کو ختم کرنے ہی یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ نے میرے کام میں ذرا بھی رکاوٹ پیدا کی تو میں فوراً آپ لوگوں کو مفلوج کر دوں گا۔"

والٹر کی باتیں سُن کر جیسے ہمیں سکتہ ہو گیا۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ ضرور پہنائے گا۔ مجبوراً ہم خاموش کھڑے ہوئے اُسے تکتے رہے۔ اِس عرصے میں اختر جال کو کاٹنے میں مصروف رہا۔ چونکہ

جال ہم نے نیلی نیلی شاخوں کو بٹ کر بُنا تھا۔ لہٰذا اختر کو ایک رسّا کاٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگ رہا تھا۔ زرینہ میرے قریب کھڑی ہوئی زار و قطار رو رہی تھی اور اپنے نالائق بیٹے کے وہ کرتوت دیکھ رہی تھی جو ہمارے پروگرام اور ہمارے اِرادوں کی راہ میں زبردست رکاوٹ تھے۔

عطارد کا سفید انسان اب تک خاموشی سے یہ بے انصافی دیکھ رہا تھا۔ اچانک نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ وہ ایک زبردست چیخ مار کر والٹر کی طرف لپکا۔ چند چھلانگوں میں انڈے کے اوپر پہنچ کر والٹر کے ہاتھ سے وہ ریوالور گرانا ہی چاہتا تھا کہ ریوالور میں سے سُرخ رنگ کا ایک دھواں نکلا اور عطارد کا باشندہ مفلوج ہو کر انڈے سے لڑھکتا ہوا نیچے گر پڑا۔ ساتھ ہی والٹر نے خوف ناک آواز میں کہا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ مُجھ سے ٹکّر لینے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ میں نے اِسے مفلوج نہیں بلکہ ختم کر دیا ہے۔ اگر کوئی آگے بڑھا تو اُس کا بھی یہی

حشر ہوگا۔"

والٹر ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اچانک ایک زبردست شور کی آواز سُنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ والٹر کے پیچھے سے آسمان پر ایک کالا دھبّہ تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ وہ دراصل زامبا تھا جو والٹر اور اختر کو اپنے انڈوں پر کھڑے دیکھ کر اُن کی طرف لپکا تھا۔

"والٹر زامبا آ گیا۔ کود جاؤ انڈے پر سے جلدی۔" جان نے اُسے بچانے کی ناکام کوشش کی۔

مگر اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ پلک جھپکتے ہی میں زامبا چوٹی پر آ پہنچا اور پھر تیر کی طرح والٹر کی طرف لپکا والٹر اور اختر کی سمجھ میں اور تو کُچھ آیا نہیں بس وہ جلدی سے انڈوں پر بِچھے ہوئے جال سے چمٹ گئے۔ اِدھر ہم اُس ڈوری کی طرف متوجّہ ہوئے جو پھندے سے بندھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی زامبا کے خونی اور بہت ہی بڑے پنجے والٹر کی طرف بڑھے ہم سب نے

مل کر رسّہ کھینچا مگر ہائے رے قسمت! اختر کی بے وقوفی کے باعث جال کافی کٹ چُکا تھا لہٰذا پھندہ نہیں لگ سکا اور زامبا اپنے دونوں پنجوں میں والٹر اور اختر کو دبا کر واپس آسمان کی طرف اُڑا لیکن خوش قسمتی سے اُس کا ناخن جال میں اٹک گیا تھا اور اِس طرح ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہی جال بھی اوپر اُٹھنے لگا۔

"اُسے روکیے۔۔۔ روکیے اُسے، زامبا اِن دونوں کو مار ڈالے گا۔۔۔"

جیک اس کی گردن پر چڑھنے لگا جیک اور سوامی یہ کہتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھے اور جال کے رسّوں سے لٹک گئے۔ اُن کی دیکھا دیکھی امجد، مرّیخی، زُحلی اور میکسیکن کے ساتھی نے بھی جال کو دوڑ کر پکڑ لیا۔۔۔ کوشش تو میں نے بھی کی تھی مگر جان، زرینہ، نجمہ اور جیکسن کے ساتھ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ کیوں کہ جال بہت اوپر اُٹھ چُکا تھا۔

جیک اس کی گردن پر چڑھنے لگا

اب آٹھ انسان زامبا کے پنجوں میں پکڑے ہوئے جال سے لٹکے ہوئے لحظہ بہ لحظہ ہم سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔

میں خوف اور حیرت کے باعث مُونہہ پھاڑے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ زرینہ اور نجمہ بُری طرح چلّانے لگیں۔ بے تاب تو میں بھی تھا مگر عورتوں کے سامنے زیادہ پریشانی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ میری حالت دیکھ کر وہ خود بھی زیادہ ڈر جاتیں۔ ایک تو جال کا اپنا وزن اوپر سے اُس سے لٹکتے ہوئے آٹھ آدمی! اِس لحاظ سے زامبا کو جال دوبھر محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کی رفتار پہلے کے مُقابلے میں بہت ہلکی تھی۔ بے شک وہ بہت بڑا پرندہ تھا۔ لیکن شاید جال کو وبال سمجھ کر وہ خود بھی گھبرا رہا تھا۔ اُس کی کھُلی ہوئی چونچ بیچ میں لرزتی ہوئی زبان اور بار بار نیچے گردن گھُما کر جال کو دیکھتے ہی سے میں سمجھ گیا کہ وہ خود کو کسی آفت میں پھنسا ہوا

محسوس کر رہا تھا۔

جو لوگ جال سے لپٹے ہوئے تھے اُن کے دِلوں کی حالت تو میں بیان کر نہیں سکتا۔ ویسے مُجھے اِس کا یقین تھا کہ وہ خود کو خطرے میں محسوس کر رہے ہوں گے۔ مُجھے سب سے زیادہ فکر اختر اور اپنے ساتھیوں کی تھی مگر مجبوری یہ تھی کہ میں اِس بے بسی کے عالم میں اُن کے لیے کُچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ زامبا جال کو اپنے پنجوں میں دبائے ہوئے لگاتار دُور ہوتا جا رہا تھا۔ اور میری حالت یہ تھی گویا کوئی دِل کا خون کیے دے رہا تھا۔ میرے دِل کا ٹکڑا، میرا ناز و نعم سے پلا ہوا لڑکا، میرا بہادر اور خوب صورت داماد امجد اور میرے دو وفا دار دوست کسی بھی وقت ہزاروں فٹ کی بُلندی سے گِر کر مر جانے والے تھے۔ زرینہ اور نجمہ کے رونے سے میرے حواس جواب دینے لگے۔ شاید میں پاگلوں کی طرح سے رونے لگتا اگر جان اچانک چلّا کر مجھے اور عورتوں کو نہ ڈانٹتا۔

"کیوں خواہ مخواہ ہمارے اوسان خطا کر رہی ہو تم دونوں۔ اور تمہیں کیا ہو گیا ہے فیروز؟"

"مَیں مَیں کیا کروں انکل۔ میرا بچّہ میرا اختر۔" الفاظ میرے مُونہہ سے نکل ہی نہ سکے۔

"بھلے آدمی بہادروں کی سی ہمّت پیدا کرو۔ بُزدلی مت دکھاؤ۔"

"بتائیے کیا کروں؟"

"زامبا کو واپس اِسی چوٹی پر لانے کا کوئی طریقہ سوچو۔"

جان کے یہ کہتے ہی واقعی مجُھے احساس ہوا کہ بُزدلوں کی طرح کیوں رونے بیٹھ گیا؟ مجُھے تو کچُھ کرنا چاہیئے۔ میں نے زرینہ اور نجمہ کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور انہیں تسلّی دی کہ وہ گھبرائیں نہیں۔ خُدا نے چاہا تو ہم اپنے ساتھیوں کو ضرور بچا لیں گے۔ میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ فوراً

خاموش ہوگئیں اور خوف زدہ نظروں سے اس طرف دیکھنے لگیں جدھر زامبا گیا تھا۔

"کیا یہ سفید شخص سچ مُچ مر گیا۔۔۔؟" جیکسن نے عطارد کے باشندے کو قریب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"والٹر نے یہی کہا تھا کہ اُس نے اُسے مار ڈالا ہے؟" میں نے بے دلی سے جواب دیا۔

"ابّا جی۔ کیا وہ سارس اِس چوٹی پر واپس آ جائے گا؟" نجمہ بہت پریشان تھی۔

"سُنو بیٹی!" جان نے کہنا شروع کیا۔ "خُدا پر بھروسہ رکھو، وہ ضرور واپس آئے گا۔ ہم لوگوں کا کام دُعا کرتا ہے۔ ہم دُعا کریں گے اور بس۔"

آسمان پر وہ کالا دھبّہ پھر نمودار ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ دھبّہ بڑا ہوتا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد زامبا ہمارے سروں پر پہنچ گیا۔ وہ جال اب بھی اُس نے اپنے پنجوں میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ اتنی تیزی سے چوٹی پر پہنچا تھا کہ میں جال پر لٹکتے ہوئے لوگوں کو ایک نظر میں نہیں پہچان سکا۔ چوٹی کا چکّر لگا کر زامبا جیسے ہی دوسری سِمت بڑھنے لگا میں نے اپنے ساتھیوں کو گِنا۔ اور پھر یہ دیکھ کر میری ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی کہ جال سے اب آٹھ کے بجائے صرف چھ آدمی چمٹے ہوتے ہیں۔ دو آدمی یقیناً نیچے گر چکے تھے!

میرے دِل کی دھڑکن یہ سوچتے ہی اچانک بڑھ گئی کہ وہ دو آدمی کون ہو سکتے ہیں؟

احتیاطاً میں نے زرینہ اور نجمہ کو یہ بات نہیں بتائی۔ بتا دیتا تو وہ دونوں پھر سے واویلا شروع کر دیتیں۔ یہ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ زامبا کو اپنے انڈوں کی بہت زیادہ فکر تھی۔ اِس کے علاوہ وہ جال اور اُس سے لٹکتے ہوئے لوگوں سے بھی اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ جب میں نے جان کو یہ

بات بتائی تو اس نے کہا۔

"اِس طرح تو وہ لوگ یقیناً مارے جائیں گے۔ کوئی طریقہ ایسا ہو کہ زامبا اِس چوٹی پر اُترنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔"

"لیکن اس طرح تو ہماری بھی خیر نہیں۔ اتنا بڑا پرندہ جب چوٹی پر اُترے گا تو بھلا ہم اُس کی نگاہوں سے محفوظ کسی طرح رہ سکیں گے؟" جیکسن نے گھبرا کر کہا۔ "خیر یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" جان نے جلدی سے جواب دیا۔

"ابّا جی۔۔۔۔ میرے ذہن میں ایک طریقہ ہے۔" نجمہ نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا طریقہ ہے؟"

"ہم کُچھ لکڑیاں جلائیں اور پھر وہ جلتی ہوئی لکڑیاں انڈوں پر لے جا کر رکھ

دیں۔ بعد میں آگ خوب بھڑکائیں۔ زامبا جب دُور سے انڈوں کو جلتے ہوئے دیکھے گا تو یقیناً وہ یہاں اُترنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

درحقیقت نجمہ نے ایک بہت ہی عُمدہ تجویز پیش کی تھی۔ اِس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقّت بھی نہیں تھی۔ بس اُلجھن یہ تھی کہ ہم میں سے کسی کے پاس دیا سلائی نہیں تھی۔ ہمیں یہ علم بھی نہیں تھا کہ اِس پلاسٹک کی سینٹی میٹر والی دُنیا کی فضا کیسی ہے؟ کیا یہاں پر آگ جل سکتی ہے؟

ہم پھر سر جوڑ کر بیٹھے۔ جان نے رائے دی کہ درختوں کے تنوں کی چھال اور تھوڑے سے سوکھے پتّے جمع کر کے دو پتھرّوں کو آپس میں ٹکرا کر چنگاری پیدا کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ پھر اِس چنگاری سے آگ پیدا ہو جائے۔ جان کی بات مان کر جلدی جلدی پتّے جمع کر کے پتھرّوں سے چنگاری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر ایک نے باری باری پتھرّ ٹکرائے مگر کُچھ بھی نہ ہوا۔ ہمارے ہاتھ شل ہو گئے مگر چنگاری کو پیدا ہونا

تھا نہ ہوئی۔

سچ ماننے مُجھے رونا آگیا۔ میرا دِل خُدا سے ایک خاموش دُعا مانگ رہا تھا۔

"یا اللہ! مُجھ خطا کار اور گناہ گار شخص سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے جس کی سزا مُجھے مِل رہی ہے۔ خُدایا میری مدد کر اور مُجھے ہر مُصیبت اور آفت سے محفوظ رکھ۔"

جس وقت میں دُعا مانگ رہا تھا پتھرّ نجمہ کے ہاتھ میں تھے۔ مُجھے یقین ہے کہ میری خاموش دُعا خُداوند کریم نے ضرور سُن لی تھی، کیوں کہ بالکل اُسی وقت پتھرّوں سے چنگاری نکلی اور پتّوں میں آگ لگ گئی۔

وہ آگ جو عام حالات میں شاید ہمارے لیے مُصیبت ہوتی اُس وقت رحمت ثابت ہوئی۔ زرینہ اور نجمہ نے جلدی جلدی پھونکیں مار کر اِس آگ کو تیز کیا۔ جلد ہی لکڑیوں نے آگ پکڑ لی۔ خُوشی کے باعث ہمارے

چہرے کِھل اُٹھے اور پھر میں جیکسن کو اپنے ساتھ لے کر انڈوں کی طرف بھاگا۔ جلتی ہوئی لکڑیاں ہمارے پاس تھیں۔ جیکسن نے بہت ساری سوکھی جھاڑیاں اور لکڑیاں جمع کر لی تھیں۔ پھر ہم دونوں جلدی جلدی انڈوں پر چڑھے۔ انڈوں کا چھِلکا کافی موٹا تھا۔ اُس پر بیٹھ کر ہم نے جلتی ہوئی لکڑیوں کی مدد سے ایک ایک کر کے تینوں انڈوں پر آگ بھڑکا دی۔ یہ کام کرنے کے بعد ہم پھر دوڑتے ہوئے اپنی جگہ پر آ گئے۔

آگ کے شُعلے کافی اُوپر اُٹھنے لگے اور پھر ہم نے دیکھا کہ زامبا بڑی تیزی سے چوٹی کی طرف آ رہا ہے۔ جال چونکہ اُس کے پنجوں میں اٹک چکا تھا لہٰذا وہ اب بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بڑی گھبراہٹ کے عالم میں وہ انڈوں پر جھپٹا۔ ہمیں اُس کے چار پروں کے ہلنے سے یوں لگا جیسے طوفان آ گیا ہو۔ ہم نے جو عارضی گھر بنایا تھا، اِس طوفان سے اُس کی چھت اُڑ گئی۔ جان نے چلا کر سب کو حُکم دیا کہ وہ اپنی اپنی کمانیں سنبھال لیں۔ زامبا کے

انڈوں پر بیٹھتے ہی جال بُری طرح انڈوں اور چٹّانوں سے ٹکرایا۔ اِس سے چمٹے ہوئے ہمارے ساتھی بھی چٹّانوں سے جا ٹکرائے۔ خوش قسمتی سے اختر، امجد اور سوامی بالکل ہمارے قریب آکر گرے۔ میں نے دوڑ کر فوراً اِن تینوں کو اپنے گھر میں گھسیٹ لیا۔ اختر کو دیکھتے ہی زرینہ اس بھیانک ماحول کو بھول کر فوراً اُس سے لپٹ گئی، مگر ظالم اختر نے حسبِ عادت جیسے ہی اُسے دھکا دیا، میرا خون کھول گیا اور پھر میں نے ایک زوردار مُکّا اختر کی گردن پر رسید کر دیا۔ اختر تھا تو بچّہ ہی اس لیے جیسے ہی وہ چکرا کر نیچے گرنے لگا، نجمہ نے فوراً اُسے سہارا دے کر زمین پر لِٹا دیا۔

میں اِس عرصے میں پھر سے زامبا کی طرف متوجّہ ہو چُکا تھا۔ سوامی اور امجد کا حال پُوچھنے کی بجائے میں نے انھیں حُکم دیا کہ وہ اپنی اپنی کمانیں اُٹھا کر میرے پاس آجائیں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ابھی جیک، والٹر اور مرّیخی جال میں اُلجھے ہوتے تھے۔ شاید اُن کے کہیں نہ کہیں چوٹ لگی تھی۔

میرے اِشارے پر جیک اور مرّیخی لنگڑاتے ہوئے ہمارے گھر کی طرف تیزی سے آنے لگے۔ مرّیخی کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اب سے کُچھ دیر پہلے جو دو آدمی جال سے گرے تھے وہ جیکسن کا ساتھی اور زحل کا باشندہ تھا۔ بہر حال یہ وقت افسوس کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر جیک اور مرّیخی کو گھر کے اندر کر لیا اور پھر زرینہ سے کہا کہ وہ اِن دونوں کو بھی کمانیں دے دے۔

والٹر کے غالباً زیادہ چوٹ آئی تھی۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا تھا مگر تکلیف کی وجہ سے چٹّان پر سے ہِل نہیں رہا تھا۔ یہ چٹّان زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ لہٰذا میں جب اُسے کھینچ کر اندر لانے کے لیے آگے بڑھا تو سوامی فوراً میرے آگے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ "مالک میں نے آج تک آپ کے حُکم کے خلاف کوئی کام نہیں کیا ہے۔ مگر معاف کیجئے گا میں اِس شیطان کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"سوامی تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا۔" میں نے اُسے ڈانٹا۔ "ہٹ جاؤ ورنہ زامبا اِسے مار ڈالے گا۔"

"نہیں مالک میں آپ کو اِسے بچانے نہیں دوں گا۔ اُسے مر ہی جانا چاہیئے۔"

سوامی بدستور وہیں جما رہا۔ والٹر اب تھوڑا سا اُٹھ چکا تھا اور ہماری یہ باتیں بھی سُن رہا تھا۔ زامبا اپنے پیروں سے آگ کو بُجھانے میں مصروف تھا۔ وہ بار بار اپنی چونچ سے انڈوں پر رکھی ہوئی لکڑیاں پھینکنے کی کوشش کرتا۔ مگر جب اُس کی چونچ جلتی تو وہ بڑی بھیانک آوازیں نکالتا۔ میرے لیے صرف یہی موقع تھا۔ زامبا ہماری طرف متوجّہ نہیں تھا۔ والٹر کو اِسی وقت بچایا جا سکتا تھا، ورنہ بعد میں ہم کُچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

والٹر کپکپاتا ہوا چٹّان سے نیچے لڑھکا اور پھر گھسٹتا ہوا بڑی ہلکی رفتار سے ہماری طرف آنے لگا۔ میرے ساتھیوں میں تقریباً سب ہی اِس بات

کے مخالف تھے کہ والٹر کو بچایا جائے۔ میری اور جان کی رائے ایک تھی۔ جیک تو والٹر کو کمان سے مارنے کے لیے تیّار بھی ہو گیا تھا، مگر پھر جان کے ڈانٹنے پر وہ اور سوامی ایک طرف ہٹ گئے۔ ہم دونوں تیزی سے والٹر کی طرف بھاگے۔ جان نے اُس کا سر پکڑا اور میں نے ٹانگیں، اِس طرح اُس کی ڈنڈا ڈولی کر کے ہم اُلٹے قدموں اپنی پناہ گاہ میں واپس آ گئے۔ سب اُسے نفرت سے دیکھ رہے تھے، مگر ہم نے اِس کی پرواہ نہیں کی اور پھر اپنے پھٹے پرانے لباس میں سے چند دھجیاں پھاڑ کر اُس کے زخموں پر باندھ دیں۔

زامبا کے پَر اب کافی جھُلس چکے تھے اور وہ بڑی خوف ناک آواز میں چیخ رہا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی وہ اپنی لمبی گردن اِدھر اُدھر گھماتا تھا۔ شاید وہ ہم لوگوں کو تلاش کر رہا تھا۔ مگر ہم لمبے لمبے درختوں کے تنوں سے بنے ہوئے گھر میں اِس طرح چھُپے ہوتے تھے کہ فوراً ہی اُسے نظر نہ آ سکتے

تھے۔ ایک انڈے پر لگی ہوئی آگ تو بُجھ چکُی تھی، مگر دو انڈے ابھی تک جل رہے تھے۔ اُن کے جلنے سے زبردست بدبُو پیدا ہو رہی تھی۔ زامبا اپنے پروں اور چونچ سے ابھی تک آگ بُجھانے میں مصروف تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے جان سے کہا۔ "کیوں انکل۔ کیا اب اِسے نشانہ بنا لیا جائے؟"

"نہیں ایسا کرنا خطرناک ہو گا۔ اگر وہ تڑپا تو یقیناً اتنے حصّے میں زلزلہ آ جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ چوٹی سمیت نیچے گِر جائے۔ اگر ایسا ہو گیا فیروز تو پھر ہم کس طرح زندہ بچیں گے۔" جان نے درحقیقت بہت ہی اہم بات سوچی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ شاید وہ زخمی ہو گیا ہے۔" جیکسن نے کہا۔ "لہٰذا آگے بڑھ کر اِس پر حملہ کر دیتے ہیں۔"

"اِس طرح وہ تڑپے گا ضرور۔ بات وہی ہے؟"

"تو پھر۔۔۔۔" جیک نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "ایک طریقہ ہے۔ میں نے افریقہ میں بڑے بڑے گینڈے ایک خاص طریقے سے پکڑے ہیں۔ چڑیا گھر والوں کے لیے یہ گینڈے مُجھے زندہ ہی پکڑنے پڑتے تھے۔ اگر آپ کی سمجھ میں میری تجویز آ جائے اور آپ اسے کارگر محسوس کریں تو پھر میں زامبا کو زندہ ہی گرفتار کر سکتا ہوں۔"

"تفصیل سے مگر جلدی بتاؤ۔" جان نے کہا۔

"دیکھیے، چٹّانوں کی آڑ لیتا ہوا میں زامبا کے پاس پہنچتا ہوں اور پھر ایک لمبی سی لکڑی کے سہارے ہوا میں اُچھل کر اِس کی لمبی گردن پر جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ گردن پر بیٹھتے ہی میں اِس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ جس وقت میں یہ کام کر رہا ہوں گا، تب آپ سب نکل کر اِس پر حملہ کر دیں اور جال سے اِسے جکڑنے کی کوشش کریں۔ ساتھ ہی موٹے موٹے کُچھ رسّے جال میں سے کاٹ لیجیے۔ ان رسّوں سے اِس کے چاروں بازو آپس میں جکڑ

دیجیئے۔ جب وہ اُڑنے سے لاچار ہو جائے گا تو ہم باقی کام آسانی سے کر سکیں گے۔"

"تجویز اچھّی ہے مگر اِس میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔" جان نے کہا۔

"لیکن اِس کے علاوہ اور کوئی دوسرا طریقہ بھی تو نہیں ہے۔"

ہمارے پاس چونکہ وقت نہیں تھا اور جو کُچھ بھی کرنا تھا اُسی وقت کرنا تھا اس لیے جیک کی بات مان لی گئی۔ اگر نہ مانتے تو کوئی اور طریقہ سوچنا پڑتا۔ یہ میں اچھّی طرح سمجھتا تھا کہ وہ طریقہ بھی جیک کے بتلائے ہوئے طریقے سے کُچھ زیادہ مختلف نہ ہوتا۔ میں نے زرینہ اور نجمہ سے کہا کہ وہ دونوں والٹر اور اختر کی خبر گیری کرتی رہیں۔ والٹر اگر ذرا سی بھی مداخلت کرے تو فوراً مُجھے خبر کر دیں۔ اُسے مارنے یا ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد ہم سب اپنا یہ خطرناک کام انجام دینے کے لیے تیّار ہو

گئے۔ جیک زامبا کے پیچھے سے، میں، سوامی اور امجد دائیں طرف سے۔ جان، مِرّیخی اور جیکسن بائیں طرف سے زامبا پر حملہ کرنے کے لیے آہستہ آہستہ زمین پر سینے کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ویسے تو یہ بہت ہی معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے، مگر ایک بہت بڑے پرندے کو جس کے مُقابلے میں ہماری حیثیت کُچھ نہیں تھی گرفتار کرنا کُچھ آسان کام نہیں تھا۔ میرا ہی دِل جانتا ہے کہ تب میری حالت کیا تھی!

زامبا اپنے انڈوں کے جلنے سے بہت پریشان تھا۔ اگراُس نے ہمیں دیکھ بھی لیا تھا تب بھی کوئی توجّہ نہیں دی تھی۔ چٹّانوں کی آڑ لیتا ہوا جیک اب اس کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا۔ سرکس کے کھلاڑیوں کی طرح وہ دُور سے ایک لمبی سی لکڑی اُٹھا کر دوڑتا ہوا آیا۔ لکڑی کو زمین پر ٹیک کر اس نے ایک قلانچ بھری اور چشمِ زدن میں زامبا کی لمبی گردن پر سوار ہو گیا۔ ایک مُصیبت کو اپنی گردن پر سوار پا کر زامبا نے جلدی جلدی سر کو دو تین جھٹکے

دیے لیکن جیک جونک کی طرح اس کی گردن سے چمٹ گیا تھا۔ مجبور ہو کر زامبا پھر اپنے انڈوں کی طرف متوجّہ ہو گیا۔ اس عرصے میں ہم لوگ جال کے کُچھ بڑے اور مضبوط رسّے کاٹ چُکے تھے۔ جیک نے پہلے ہی سے دو نوکیلے تیر اپنے پھٹے ہوئے لباس میں اُڑس لیے تھے۔ اِن تیروں کو اُس نے اب ایک ہاتھ میں پکڑلیا اور دوسرے ہاتھ کے سہارے سے زامبا کی گردن کے اوپری حصّے پر اِس طرح چڑھنے لگا جس طرح کیرالہ کے لوگ ناریل توڑنے کے لیے ناریل کے اونچے پیڑ پر چڑھتے ہیں۔ وہ دراصل زامبا کے سر پر پہنچنا چاہتا تھا۔ زامبا بار بار گردن جھٹک رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف جیک ہی میں اتنی ہمّت اور قوّت تھی جو وہ جھٹکے برداشت کر گیا۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی کا نیچے گِر گیا ہوتا۔ زامبا نے اُسے چٹّان سے بھی رگڑا۔ گردن گھما کر اُسے اپنی خوف ناک چونچ میں پکڑنے کی بھی کوشش کی۔ مگر جیک بڑی مضبُوطی سے چمٹا ہی رہا۔

اچانک اُس نے ایک تیر زامبا کی بائیں آنکھ میں اُتار دیا۔ میرے خُدا کتنی زبردست اور بھیانک چیخ تھی جو اس وقت زامبا کے حلق سے نکلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تڑپنے کی کوشش کرتا، جیک نے اس کی دائیں آنکھ بھی پھوڑ دی۔ خوف ناک اور دِل کو لرزا دینے والی چیخوں سے وہ جگہ گونج اُٹھی۔ ہم سب نے مل کر بڑی کوشش کی کہ کسی طرح خوف ناک پرندے کے بازوؤں کو جکڑ دیں یا پھر اس پر جال ہی ڈال دیں۔ مگر افسوس ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہو سکی۔

اور پھر اُس وقت تو جیسے میری جان ہی نکل گئی جب میں نے زامبا کو ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ دوبارہ اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پر بادبانوں کی طرح پھڑپھڑائے اور وہ جیک کو اپنی گردن سے چمٹائے ہوئے چوٹی پر سے اُڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم نے چیخ چیخ کر جیک کو نیچے کود جانے کے لیے کہا۔ مگر زامبا کے پر اتنا شور پیدا کر رہے تھے کہ شاید ہماری آواز

جیک تک نہیں یہ پانچ سکی اور پھر وہ دیوزاد سارس جیک کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ آسمان میں اُڑنے لگا۔

خوف اور دہشت کے باعث ہماری چنیں نکل گئیں کیوں کہ ہم جیک کی اتنی بھیانک موت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چند لمحوں کے اندر زامبا اُس مقام سے آ گئے۔ اختر کو ہوش آ چکا تھا اور میں یہ دیکھ کر حیرت ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا کہ نجمہ اُس کے دونوں ہاتھ پیچھے کمر کی طرف کر کے باندھ رہی ہے۔ اختر غُصّیلی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا اور نجمہ اُس سے کہہ رہی تھی۔

"بھیّا! تُم میرے بھائی ضرور ہو، مگر اب تم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"

داستان کو مُختصر کرنے کی خاطر میں اب اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تین دِن تک ہم اِس چوٹی پر بیٹھے ہوئے زامبا اور جیک کی واپسی کا انتظار کرتے رہے مگر سب بے سُود۔ جان کا خیال درُست نکلا۔ کیوں کہ اُس نے کہا

تھا کہ اندھا ہو جانے کے بعد زامبا اب چوٹی پر کسی بھی طرح واپس نہیں آ سکتا۔ اب یا تو وہ آسمان ہی میں اُڑتا رہے گا یا پھر تھک کر کسی چٹّان سے ٹکرا کر نیچے گِر جائے گا۔ اِس صورت میں جیک کا انجام بھی ہمیں معلوم تھا!

تین دِن کے بعد ہم پہاڑ سے اُترنے کی تیّاری کرنے لگے۔ والٹر اب چلنے کے قابل ہو چکا تھا کیوں کہ روزانہ اُس کے زخموں کی دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ چلنے سے پہلے والٹر نے جان سے کہا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی مسٹر جان۔ آپ لوگوں نے مُجھے زندہ کیوں رہنے دیا۔ آپ بڑی آسانی سے یا تو مُجھے خود مار سکتے تھے یا پھر زامبا کے پاس مَرنے کے لیے چھوڑ سکتے تھے۔"

"یہ تُم کس لیے پوچھ رہے ہو؟" جان نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"اِس لیے کہ میں آپ کا دُشمن ہوں۔ دُشمن پر اتنی مہربانی کس لیے؟"

"وجہ جاننا چاہتے ہو والٹر۔" جان نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "سُنو! کسی کو مُصیبت میں دیکھ کر اُس کی مدد کرنا شریف انسانوں کا کام ہے۔ ہم انسان اپنے دُشمنوں کو بھی معاف کر دیا کرتے ہیں۔"

"مگر بہت سے انسان تو دُشمنوں کو معاف نہیں کرتے۔" والٹر نے مُسکرا کر کہا۔

"پانچوں اُنگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔" جان نے سخت آواز میں جواب دیا۔ "انجیل مقدّس، قرآن کریم، گرنتھ صاحب اور بھگوت گیتا میں دشمنوں کو معاف کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ تُم اگر انسان ہوتے تو اِن مذہبی کتابوں کے بارے میں زیادہ جان سکتے تھے۔ انسان انسان میں بہت فرق ہے والٹر، سوامی اور جیک تمہیں بچانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن مُجھے اور

فیروز کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ہم رحم کرنا جانتے ہیں، تُم انسان نہیں ہو اِس لیے تمہارے دِل میں یہ جذبہ موجود نہیں ہے۔ ہم انسان ہیں اور ہمیں محبّت اور رحم پسند ہے۔۔۔۔ والٹر ہم نے تمہیں اِس لیے نہیں بچایا کہ بعد میں تُم ہماری مدد کرو گے اور ہمیں یہاں سے بڑی دُنیا میں لے جاؤ گے۔۔۔۔ بھُول کر بھی یہ مت سوچنا بس اتّفاق سے تمہیں مُصیبت میں دیکھ کر ہم سے رہا نہ گیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ تُم ہمارے سب سے بڑے دُشمن ہو ہم نے تمہیں بچالیا۔"

"خوب! بہت عمدہ تقریر ہے۔" والٹر نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "اچھّا! اب تُم مُجھ سے کیا سلوک کرو گے؟"

"وہی سلوک جو ایک شریف آدمی دوسرے کے ساتھ کرتا ہے۔"

"کیا تُم یہ خواہش نہیں کرو گے کہ میں تمہیں ایک سینٹی میٹر کی اِس دُنیا سے نکال کر واپس زہرہ کی بڑی دُنیا میں لے جاؤں؟"

"ہاں ہم ضرور یہ چاہیں گے۔" جان کے بدلے امجد نے آگے آ کر کہا۔

"بے شک تمہیں اِس مقصد کے لیے نہیں بچایا گیا۔ مگر تُم پر زیادہ رحم کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں ہم کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ البتّہ تُم ہمارے قیدی رہو گے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھیں گے۔ شاگو کو آزاد کرانے کے بعد تمہیں مجبور کیا جائے گا کہ تُم ہمیں زہرہ کی بڑی دُنیا میں لے چلو اور وہاں سے واپس ہمیں ہماری اصلی اور پیاری زمین پر بھیجنے کی تیّاری کرو۔"

"کمال ہے۔ آپ لوگوں کی باتوں میں کتنا فرق ہے۔" والٹر نے پھر مذاق اُڑایا۔

"سُنو والٹر۔" سوامی نے غُصّے سے کہا۔ "سانپ کو دُودھ پلا کر پالنا مُجھے پسند نہیں۔ تمہیں اتنی رعایت ضرور دی جائے گی کہ تُم زندہ رہو۔۔۔۔ بس اِس سے آگے کُچھ نہیں۔ اب ہم جو چاہیں گے وہی ہو گا۔"

والٹر نے مجبوری کے انداز میں اپنے کندھے جھٹکائے اور پھر خاموش ہو گیا۔ اختر اتنی دیر تک سر جھُکائے بیٹھا رہا اور اُس نے ہماری گُفتگُو میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ حقیقت ہے کہ میں نے والٹر کی جان کسی غرض کی وجہ سے نہیں بچائی تھی۔ مُجھے تو صرف اُس پر رحم آیا تھا۔ مگر اب یہ احساس ہوتے ہی کہ والٹر سے ہم بہت کام لے سکتے ہیں، میری اپنی رائے بھی یہی ہو گئی کہ والٹر سے ہمیں کُچھ نہ کُچھ مدد ضرور لینی چاہیے۔

پہاڑ پر سے اُترنا اُس پر چڑھنے سے زیادہ مُشکل اور خطرناک ہوتا ہے۔ جُوں تُوں کر کے ہم اُس پر سے اُتر ہی آئے۔ والٹر کُچھ سوچتا ہوا ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ پہلے تو وہ خوب چہک چہک کر بول رہا تھا۔ مگر اب جیسے اُس کو چُپ سی لگ گئی تھی۔ وادی میں آتے ہی مُجھے جنگل کے سِرے پر ایک بہت بڑا متحرک پہاڑ نظر آنے لگا۔ دور سے تو وہ پہاڑ ہی دِکھائی دے رہا تھا مگر جب میں نے غور سے دیکھا تو خُوشی کی ایک چیخ بے ساختہ میرے مُونہہ

سے نکل گئی۔

ہم سے تقریب ایک فرلانگ کے فاصلے پر زامبا زمین پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ دیوانوں کی طرح ہم اُس طرف دوڑے کیوں کہ زامبا کی اب ہماری نظر میں بڑی قیمت تھی۔ اِسے پانے کا مطلب تھا جیک کا مل جانا۔ شاگو کی آزادی اور پھر ہم سب کی آزادی! ہانپتے ہوئے اور گِرتے پڑتے جب ہم زامبا کے قریب پُہنچے تو ہم نے جو کچھ دیکھا وہ ہمارے اوسان خطا کر دینے کے لیے کافی تھا۔

جیک نہ تو اُس کی گردن سے چِپکا ہوا نظر آیا اور نہ ہی دُور دُور تک اس کا کوئی نشان دِکھائی دیتا تھا!

اختر نے ایک عجیب سی چیز ہماری طرف تان لی

زامبا کے ملنے کی سب خُوشی خاک میں مل گئی۔ جیک جیسا وفادار ساتھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا؟ مُجھے یہ یقین تھا کہ جیک مر نہیں سکتا۔ وہ آس پاس ہی ہوگا۔ مگر میرے ساتھیوں کا خیال مختلف تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ جیک یقیناً کہیں نہ کہیں گِر گیا ہے اور پھر گِرتے ہی اُس کی موت واقع ہو گئی ہے۔ بہت دیر تک ہم پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر جیک کو تلاش کرتے رہے۔ جب اُس کا کوئی سُراغ نہیں ملا تو پھر مجبوراً امجد اور سوامی پتھرّ کے کلہاڑے لے کر زامبا کی چونچ اُس کے سر سے جدا کرنے کے لیے آگے بڑھے۔

"مالک ذرا دیکھئے تو مالک!" اچانک سوامی نے جوشیلی آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"سارس کی لمبی گردن پر لاتعداد زخم ہیں۔"

"پھر اِس سے کیا؟"

"مالک! اِس کا مطلب ہے کہ جیک اوپر سے گِر کر نہیں مرے۔ بلکہ وہ لگاتار اس کی گردن سے لپٹے رہے اور برابر گردن کو زخمی کرتے رہے۔"

"لیکن اِس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ زامبا تو تین دِن پہلے یہاں گِرا ہوگا۔ پھر اگر جیک زندہ ہوتا تو ہمیں تلاش کرنے کے لیے ضرور پہاڑ کی طرف آتا۔" جان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

سوامی کی بات میرے دِل کو لگتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ زامبا دو تین دِن تک لگاتار آسمان میں چکّر لگاتا رہا ہو اور ہمارے آنے پر گِرا ہو۔ اگر یہ بات تھی تو پھر جیک کو بھی زندہ ہونا چاہیئے! میں نے امجد اور سوامی کو زامبا کی چونچ الگ کرنے کے لیے کہا اور پھر اکیلا جنگل کے اندر داخل ہوگیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جیک کسی درخت کی شاخوں میں تو نہیں اٹک گیا۔ اچانک میری نظر جنگل کے مختلف درختوں اور راستوں پر پڑی۔ مُجھے بہت سا

حصّہ کُھلا ہوا دِکھائی دیا۔ یوں لگتا تھا گویا کوئی بہت بڑی چیز گِھسٹتی ہوئی جنگل سے باہر گئی ہے۔۔۔۔ اور ظاہر ہے وہ بڑی چیز زامبا کے علاوہ اور کون سی ہو سکتی تھی!

زامبا یقیناً جنگل کے اوپر ِگرا تھا اور گِھسٹتا ہوا پہاڑ کی طرف بڑھا تھا۔ اپنے اندھے پن کی وجہ سے وہ زیادہ آگے نہ جا سکا اور پھر اُس نے جنگل کے سِرے پر آ کر دم توڑ دیا۔ اِس خیال کے تحت پھر جیک کو بھی جنگل کے اندر ہی ہونا چاہیئے تھا، جان کو ساتھ لے کر میں تیزی سے دوڑتا ہوا جنگل کے اندر ایک ایک جگہ ڈھونڈنے لگا اور پھر آخر میری محنت سوارت ہوئی۔ ایک اُونچے سے درخت کے نیچے جیک آرام سے لیٹا ہوا ملا۔ لیکن وہ اس وقت بے ہوش تھا۔

اُسے اُٹھا کر ہم واپس آئے۔ اِتنی دیر میں امجد اور سوامی اپنا کام کر چُکے تھے اور انھوں نے ہمیں فٹ لمبی چونچ زامبا کے سر سے الگ کر لی تھی۔ اب

یہ بتانے کی تو کوئی خاص ضرورت نہیں کہ ہم نے بعد میں کیا کِیا؟ بس آپ سمجھ لیجئے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اِس مقام تک آ گئے جہاں ہم نے جال بنایا تھا اور جہاں سے شاگو کا غار زیادہ دور نہیں تھا۔ چشمے کے کنارے ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے اور کافی دیر تک آرام کرتے رہے۔ احتیاطاً ایک شخص کو ہم نے پہرے پر لگا دیا، تاکہ وہ اختر اور والٹر کو بھی دیکھتا رہے اور ہماری نگرانی بھی کرتا رہے۔ یہ کام مِرّیکی نے اپنے ذمّے یہ کہہ کر لیا کہ اُسے سونے کی ذرا بھی عادت نہیں ہے۔

گھوڑے بیچ کر سونے والا محاورہ آپ نے ضرور سُنا ہو گا۔ اب کیا عرض کروں، گھوڑے بیچ کر سونے والا تو جلد ہی اُٹھ بھی گیا ہو گا۔ مگر ہم سچ مُچ ایسے سوئے کہ پورے چوبیس گھنٹے کے بعد جاگے۔ لیکن جاگتے ہی یہ سوچ کر ہم بہت پچھتائے کہ کاش ہم نہیں سوتے کیوں کہ تین آدمی وہاں سے غائب تھے! اور وہ تین آدمی تھے۔ مِرّیکی، والٹر اور اختر! جِن لوگوں کو

اتنی مُشکل سے اور اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد ہم نے حاصل کیا تھا، وہ اب موجود نہیں تھے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید مِرّیخی اُن دونوں سے مل گیا ہوگا اور اُسی نے اُن کو آزاد کیا ہوگا۔ لیکن اُس مقام پر جدوجہد کے کُچھ آثار نظر آئے اور اُن سے یہ ثابت ہوا کہ والٹر اور اختر نے مِرّیخی پر بے خبری میں حملہ کر دیا ہوگا اور اُسے مغلوب کر کے بھاگ گئے ہوں گے۔ پھر اِس کے بعد تو رہا سہا شُبہ بھی دُور ہو گیا، کیوں کہ چشمے کے کنارے پر مِرّیخی کی لاش بھی ہمیں مل گئی۔ اس کا سر پانی میں تھا اور ٹانگیں کنارے پر تھیں یوں لگتا تھا کہ اُسے پانی میں ڈبو کر مارا گیا تھا۔

سچ کہتا ہوں، اتنی ذہنی تکلیف مُجھے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کافی دیر تک میں سکتے ہیں بیٹھا رہا۔ میرے ساتھی بھی خاموش تھے۔ زرینہ اور نجمہ کا تو روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ اختر کو بڑی مُصیبت کے بعد انہوں نے پایا تھا اور اتنی مُشکل سے ملا ہوا اختر اتنی آسانی سے انہیں چھوڑ کر چلا گیا

تھا۔ میرے لیے یہ خیال بھی بڑا تکلیف دہ تھا کہ مِرّیخ، زحل اور عطارد کے جِن باشندوں کو میں نے زیادہ اہمیّت نہیں دی تھی، وہی لوگ ہم پر سے قربان ہو گئے!

اپنی اُس وقت کی حالت کو بیان کر کے میں خواہ مخواہ کہانی کو لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ مختصراًیوں سمجھیے کہ ہماری تعداد پھر اتنی ہی رہ گئی جتنی کہ شاگو کے ملنے سے پہلے تھی۔ آٹھ آدمیوں کا یہ مختصر سا قافلہ زامبا کی چونچ اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے واپس اُس غار کی طرف جا رہا تھا جہاں شاگو قید تھا۔ جہاں ہم نے تین آدمی کھوئے تھے وہاں اِس بات کی بھی خُوشی تھی کہ والٹر اور اختر، زامبا کی چونچ لے کر نہیں گئے ورنہ اگر وہ چاہتے تو ہم میں سے ایک ایک کو ختم کر دیتے اور چونچ بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ راز اُس وقت تو سمجھ میں آ نہیں سکا البتّہ بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ حقیقت کیا تھی۔

غار میں سے شاگو کے کراہنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی سوامی نے ٹارچ نکال کر جلالی تھی۔ غنیمت تھا کہ ٹارچ کے سیل ابھی تک کام کر رہے تھے اور ٹارچ بھی گذشتہ واقعات اور حادثوں کے درمیان ہمارے پاس محفوظ رہی تھی۔ روشنی پڑتے ہی غار روشن ہوگیا۔ شاگو نے جلدی سے ہمیں دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی اور جسم پر زخموں کے نشان بھی بڑھ گئے تھے۔ جان کو دیکھتے ہی وہ آہستہ سے مُسکرایا۔

"آہ آپ آ گئے، میں تو کب سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔"

اُسے جب زامبا کی چونچ کے بارے میں بتایا گیا تو خُوشی کے باعث وہ کپکپانے لگا۔ اُس کی سبز آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"آپ لوگ کتنے اچھے ہیں۔ سچ مانیے میں تو آپ کے احسانوں تلے دب گیا ہوں۔"

"مجھے زیادہ شرمندہ مت کرو شاگو اور خُدا کے لیے اب یہ بتاؤ کہ ہم چونچ سے کیا کام لیں تاکہ تُم آزاد ہو جاؤ۔" جان کے یہ کہنے پر شاگو نے مسرّت بھرے لہجے میں کہا۔ "اِس چونچ کے سِروں پر دندانے سے ہیں۔ جب اِن سے زنجیر کے کڑوں کو رگڑا جائے گا تو یہ خاص دھات کی بنی ہوئی زنجیر اِس طرح کھلنے لگے گی گویا لکڑی کی بنی ہوئی ہو۔ آپ کوشش کر کے دیکھ لیجئے۔"

ہم فوراً عمل کے لیے تیّار ہو گئے۔ چونچ کے دو حصّے کر کے جیک اور سوامی اِس کام پر لگ گئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زنجیروں کے کٹنے میں اتنا کم وقت لگے گا۔ مُشکل سے کوئی دو منٹ کے اندر اندر زنجیر کے حلقے کٹ گئے اور اُس میں جیک یا سوامی کو کُچھ زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑی۔ آزاد ہوتے ہی شاگو اپنے بازو پھیلا کر جان کی طرف بڑھا اور پھر پہلی بار دو مختلف سیّاروں کے بڑے سائنس داں آپس میں گلے مل گئے۔

مسرّت کے باعث ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر ہم نے باری باری شاگو سے ہاتھ ملایا۔ میں اُس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی خواہش تھی کہ ہم جلد سے جلد وہ غار چھوڑ کر کسی دوسرے محفوظ مقام پر چلے چلیں، کیوں کہ اِس جگہ پر جکاریوں یا والٹر کے آنے کا ڈر تھا۔ اُس کی بات مان کر ہم جلدی سے غار کے باہر آئے اور پھر تیزی سے چل کر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جو ہر سمت سے اُونچی اُونچی چٹّانوں سے گھِرا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر شاگو نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور پھر جان سے کہنے لگا۔ "اب مجُھے کسی بات کی فکر نہیں۔ میں اُس کم بخت کوراک سے اچھّی طرح نمٹنا جانتا ہوں۔ مجُھے بس افسوس یہ ہے کہ وہ آپ کے ہاتھوں میں آ کر نکل گیا۔"

"معاف کیجیۓ گا۔ میں آپ سے چند باتیں اور پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے شاگو کو مخاطب کر کے کہا۔

"ضرور پوچھیے۔" شاگو کا مچھلی جیسا مُونہہ تھوڑا سا کھِل گیا۔ شاید وہ مُسکرایا تھا۔

"اتنے طاقت ور ہونے کے باوجود آپ کس طرح والٹر کے جال میں پھنس گئے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ساتھیوں نے بعد میں آپ کی مدد کیوں نہیں کی؟ جکاریوں سے بچنے کا آپ کے پاس کیا کوئی طریقہ نہیں ہے؟"

"آپ نے بہت اچھّی باتیں پوچھی ہیں مسٹر فیروز۔" شاگو پھر مُسکرایا۔ "در اصل اِس چھوٹی دُنیا میں صرف کوراک ہی سب کُچھ کر سکتا ہے۔ اُس نے یہاں پر سب چیزوں کے ساتھ ہی مُجھے بھی اتنا چھوٹا کر دیا کہ میری طاقت کم ہو گئی۔ میرے ساتھی بہت ہی کم ہیں۔ یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ امن و محبّت کے پرستار یہاں بہت کم ہیں۔ اُن بے چاروں کو معلوم ہی نہیں ہو گا کہ میں یہاں قید ہوں۔ دوسرے جکاریوں اور زوک قوم سے بچنے

کا واحد طریقہ سوبیا دھات ہے وہی دھات جس کے لیے میں پہلے آپ کی دُنیا کے ایک ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے جزیرے میں گیا تھا۔ (ناول خوف ناک جزیرہ، ملاحظہ فرمائیں) سوبیا یہاں بہت کم مقدار میں ہے۔ ہمارے بہت سے کارخانے اُسی کی بدولت چلتے ہیں، اور برقی قوّت اِسی دھات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُن علاقوں میں جہاں سوبیا کا ذخیرہ موجود ہے جکاریوں اور زوکوں کو نہیں جانے دیتے۔ البتّہ ایک خاص لباس پہن کر جکاری اور جکاری اُدھر جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے اِس سیّارے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا سیّارہ اور ہے جسے ہم آفاق کہتے ہیں۔ جیسے آپ کی زمین کا چاند ہے ویسے ہی زہرہ کا یہ آفاق ہے۔ آفاق میں کُچھ چٹّانیں ہیں جو ہمارے لیے بہت نقصان دہ ہیں۔ اِن چٹّانوں کی پوشیدہ کرنیں اگر ہمارے جسم تک پہنچ جائیں تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یاد کیجیے کہ آپ کی بیٹی اور آپ کے لڑکے نے ہمارے سابق ڈکٹیٹر

جیگا کو اُسی کے ذریعہ ختم کیا تھا۔"

"لیکن مسٹر شاگو۔۔۔۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ نے شاید اُنہیں چٹّانوں سے بنے ہوئے ایک ہار کو ہمارے پاس دُنیا میں بھیجا تھا۔ ایسا کس طرح ہوا جب کہ وہ ہار آپ کو بھی ختم کر سکتا تھا؟"

"ایک خاص دھات کے بنے ہوئے بکس میں اگر وہ ہار رکھ دیا جائے تو پھر ہمیں نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے اُسی خاص ڈبّے میں وہ ہار آپ کو بھیجا تھا۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اگر آفاق کی چٹّان کا کوئی ٹکڑا سوبیا میں ڈال دیا جائے تو وہ اتنا قاتل ہو جاتا ہے کہ کافی فاصلے سے بھی ہمیں ختم کر سکتا ہے۔۔۔۔"

"تم غیر ضروری باتوں میں اُلجھ گئے شاگو۔۔۔۔ فیروز کے سوال کا یہ جواب نہیں ہے۔" جان نے پریشان ہو کر کہا۔ "اس نے تو یہ پوچھا تھا کہ جکاری کو ختم کرنے کا کیا کوئی طریقہ نہیں ہے؟"

"معاف کیجئے گا۔۔۔۔ میں آپ پر اعتبار کرنے لگا ہوں اس لیے بہت سی راز کی باتیں آپ کو بتا دیں۔" شاگو نے جواب دیا۔ "ویسے جکاری صرف سوبیا سے ختم ہو سکتے ہیں۔ اور سوبیا اِس جگہ میرے پاس نہیں تھی۔ دوسرے میرا قد بھی کم کر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جکاریوں کو مُجھ پر ظلم ڈھانے کا موقع مل گیا۔"

"اگر مناسب سمجھیں تو مُجھے یہ اور بتا دیں کہ آفاقی ہار میرے گلے میں پڑنے کے بعد کیوں زیادہ اثر والا بن جاتا تھا؟" نجمہ نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد ایک بہت کار آمد بات پوچھی۔

"ہمارے سائنس دانوں نے صدیوں پہلے یہ بات معلوم کی تھی۔ دراصل یہ خُون میں ملے ہوئے ذرّات کا کوئی کرشمہ ہے۔ مردوں کے خُون میں وہ ذرّات نہیں ہوتے جو لڑکیوں یا عورتوں کے خُون میں ہوتے ہیں۔ میں زیادہ تفصیل تو بیان نہیں کر سکتا۔ تُم یوں سمجھو کہ تمہارے خون کی گرمی پا

کر آفاق کی چٹّانوں سے بنا ہوا وہ ہار زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔"

شاگو بہت دیر تک اِسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔ میری کہانی پڑھنے والے شاید اِس وقت اِن باتوں کو غیر ضروری سمجھیں لیکن آگے چل کر وہ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے اِن باتوں کا جاننا کتنا ضروری اور اہم تھا۔

پوری باتیں اب ہماری سمجھ میں آ چکی تھیں۔ لٰہذا اِس بات کا مشورہ ہوا کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟ شاگو کو اِس کا بہت افسوس تھا کہ ہمارے تین نئے دوست زامبا کے شکار کے سِلسلے میں مارے گئے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اُن سے کوئی نہ کوئی کام لیا جا سکتا تھا۔ بہر حال طے یہ پایا کہ ہم اپنے کمانوں والے ہتھیار ساتھ لے کر واپس اُسی ہال میں چلیں جہاں ہم زہرہ کی دُنیا سے ایک مشین کے ذریعہ اب سے کئی دِن پہلے آئے تھے۔ جان نے یہ اُمّید ظاہر کی تھی کہ وہ مشینوں کو چلا کر اور اُلٹی ترتیب سے اُس

کے بٹنوں کو دبا کر بڑی دُنیا میں ہمیں واپس لے جا سکتا ہے، لیکن شاگو کے ساتھ ہونے پر انہیں جان سے کوئی کام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

شاگو نے بتایا کہ مشین والے ہال میں صرف دو خطرے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اگر کوراک پہلے ہی سے اُس مشین کے ذریعہ بڑی دُنیا میں جا چُکا ہے تو پھر وہ ہمیں وہاں نہیں آنے دے گا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ مشین کی حفاظت کے لیے اگر مِرّیخ کا سُرخ انسان وہاں موجود ہوا تو شاید کوئی مُشکل پیش آئے اور وہ ہمارے اِرادوں کو پورا نہ ہونے دے۔

کُچھ بھی ہو، ہمیں یہ خطرے تو مول لینے ہی تھے۔ ہم نے اپنا سامانِ سفر ساتھ لیا اور پھر جنگل پار کر کے اُس علاقے میں آ گئے، جہاں پہلے ہی کی طرح اب بھی بہت سے لوگ آپس میں لڑ رہے تھے۔ شاگو سے صحیح بات اب معلوم ہوئی۔ کوراک یعنی والٹر نے سینٹی میٹر کی دُنیا میں رہنے والوں کو ایسی خوراک مہیّا کی تھی جسے کھا کر وہ آپس میں لڑنا شروع کر دیتے تھے۔

اُنھیں آپس میں لڑانا اِس لیے ضروری تھا کہ لوگ کوئی اور بات نہ سوچیں یا پھر کوراک کے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔ خوش قسمتی سے وہ خوراک مُجھے اور میرے ساتھیوں کو نہیں دی گئی۔ اِس کی وجہ دراصل کیا تھی۔ افسوس کہ اُس وقت تک مُجھے اُس کا پتہ نہیں چل سکا۔

لڑتے ہوئے لوگوں سے چھُپتے چھپاتے آخر ہم اُس جگہ پر آ ہی گئے جہاں ہال کا دروازہ تھا۔ ہم سب خوش تھے کہ بس یہ آخری مرحلہ ہے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی ہم چھت میں لگے ہوئے قُمقُموں کے نیچے کھڑے ہو جائیں گے اور پھر شاگو جیسے ہی بٹن دبائے گا ہم واپس زہرہ کی بڑی دُنیا میں پہنچ جائیں گے۔ منزل کو قریب دیکھ کر سب میں اچانک جوش بھر گیا۔ ہم تیزی سے بھاگ کر دروازے کے سامنے پہنچے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا!

دروازے کے دائیں اور بائیں طرف دو خوفناک جکاری ہاتھوں میں ہنٹر

لیے ہوئے کھڑے تھے!

اُنہیں دیکھتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایسا لگا گویا کسی نے پورے جسم کا خُون نچوڑ لیا ہو۔ جکاریوں کے ہونٹ ذرا سے کھُلے اور اُن کے دو لٹکے ہوئے دانتوں کے ساتھ اندر کے خوفناک دانت بھی نظر آنے لگے۔ اُن کی ایک آنکھ سُرخ ہو گئی تھی اور ہمیں دیکھ کر اب وہ اپنے ہنٹر بے قراری سے زمین پر مار رہے تھے، گویا ہم سے کہہ رہے ہوں آؤ، ہم تو تمہارے ہی انتظار میں یہاں کھڑے تھے!

"آپ میں سے کسی کے پاس سوبیا ہے؟" شاگو نے گھبرا کر پُوچھا۔

"نہیں بھلا ہمیں سوبیا ساتھ رکھنے سے کیا فائدہ؟" جان نے جواب دیا۔

"بس تو پھر سمجھ لیجئے کہ ہم گرفتار کر لیے گئے۔" شاگو نے نااُمّیدی سے کہا۔

"اِن سے بچنے کا کیا کوئی طریقہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ کوراک نے انہیں یہاں اِسی لیے کھڑا کیا ہے کہ وہ ہمیں یہاں پہنچتے ہی گرفتار کر لیں۔" شاگو نے بے قراری سے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا انہیں تیروں سے زخمی نہیں کیا جا سکتا ہے؟" امجد نے بے تابی سے کہا۔

"یہ زخمی ہو ہی نہیں سکتے۔" شاگو نے آہستہ سے جواب دیا۔ "کاش ہمارے پاس تھوڑی سی سوبیا ہوتی!"

جکاریوں نے قریب آ کر ہم پر ہنٹر برسانے کی کوشش کی ہی تھی کہ شاگو نے کسی خاص زبان میں، جو ہمارے لیے اجنبی تھی اُن سے کُچھ کہا۔ جکاری سُنتے ہی پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے ہاتھ بھی نیچے کر لیے۔ اِس کے باوجود وہ کھڑے وہیں رہے اور اُسی طرح ہمیں گھورتے رہے۔

"تم نے اِن سے کیا کہا ہے شاگو؟" جان نے دریافت کیا۔

"یہی کہ ہم بھاگ نہیں رہے اور تمہارے قیدی ہیں۔ ہم تمہارا کہنا مانیں گے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" میں نے شاگو سے کہا۔ "اِس کا مطلب ہے کہ ہم پھر اِسی مقام پر رہیں گے!"

"آپ کا خیال بالکل درست ہے مسٹر فیروز۔" ایک آواز آئی۔

میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کم بخت والٹر دروازے میں فاتحانہ انداز سے دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے کھڑا تھا۔

"تُم۔۔۔ یہ تُم ہو شیطان۔" جان دانت پیستا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔

"نہ نہ۔۔۔ زیادہ غصّہ اچھّا نہیں میرے عزیز دوست۔۔۔ براہِ کرم وہیں کھڑے رہیئے۔۔۔"

"تم احسان فراموش ہو والٹر۔۔۔۔" میں نے اُسے شرمندہ کرنے کی خاطر کہا۔ "تُم بھول گئے کہ میں نے تمہاری جان بچائی تھی۔۔۔۔"

"احسان کرنے والے احسان جتایا نہیں کرتے۔۔۔۔" والٹر نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"میں تو اُس وقت کو روتا ہوں جب تُجھ جیسا کمینہ شخص امریکہ میں تھا۔۔۔۔" جیک کے ہاتھوں کی مُٹھّیاں بھینچ گئیں۔۔۔۔ "کاش میں کسی طرح تُجھے وہیں ختم کر دیتا۔"

"واقعی تم سے غَلطی ہوئی۔۔۔۔ اپنی اس غَلطی پر تمہیں ماتم کرنا چاہیئے۔"

"والٹر۔۔۔۔ دیکھو والٹر ہمیں اِس طرح پریشان کرنے سے تمہیں کیا ملے گا ہے؟" جان نے مجبوراً خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔

"کچھ نہیں۔۔۔۔ لیکن میرا فرض یہ ہے کہ میں اپنے آقا کا حُکم

مانوں۔۔۔۔"

"اچھّا، تم ہمیں اِس دوزخ سے نکال کر اپنے بڑے والے ہال میں لے چلو۔ وہاں ہم آزاد ہونے کی کوشش خود ہی کرلیں گے۔"

"واہ۔۔۔ یہ خوب رہی، میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے گلے پر چھُری کس طرح پھیر لوں؟"

"کوراک۔۔۔۔ میں تمہارا مُجرم ہوں، اِن بے چاروں کو سزا کیوں دیتے ہو؟" شاگو نے کہا۔

"تم سب مُجرم ہو۔۔۔۔ تُم ہمیشہ کے لیے یہیں رہو گے۔۔۔" والٹر نے غُصّے سے کہا۔ "یہیں ایڑیاں رگڑر گڑ کر مرو گے۔ اب تمہیں وہ خوراک دی جائے گی جس کے اثر سے تم لڑنے لگو گے اور پھر خود ہی ختم ہو جاؤ گے۔"

"کیا تم کو ہم پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔۔۔ ہم نے تمہیں کُچھ عرصہ پہلے

موت کے مُونہہ سے بچایا تھا!" جان نے اِلتجا کی۔

"مُجھے تو تُم کمینہ کہہ ہی رہے تھے، مگر معلوم ہوتا ہے تُم سب بھی کمینے ہو۔ اِسی لیے ہر ایک باری باری احسان جتا رہا ہے۔۔۔"

"اچھّا ظالم، تُجھے جو کرنا ہے وہ کر لے مگر خُدا کے لیے یہ تو بتا دے کہ اختر کہاں ہے؟" زرینہ اُس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولی۔ والٹر یہ سُن کر خاموش رہا۔

"بتا دو والٹر۔۔۔ میرا پیارا بھائی کہاں ہے؟" نجمہ بھی گڑگڑانے لگی۔

"شاید میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مُجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔"

"ارے ظالم، تو مِرّیخی کو قتل کر کے بھاگا تھا۔۔۔ کہیں تُو نے میرے معصوم بچّے کو بھی تو نہیں مار دیا!"

”بے کار کا واویلا نہ مچائیے۔“ والٹر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”مِرّیخی کو میں نے نہیں مارا۔“

یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ میرے خیال میں والٹر جھوٹ بول رہا تھا۔ اختر میں اِتنی قوّت نہیں تھی کہ وہ مِرّیخی کو ندی میں لے جا کر ڈبو دیتا۔ پھر آخر والٹر جان بُوجھ کر کیوں جھوٹ بول رہا تھا؟

”ہم دونوں مِرّیخی سے لڑے اور اُسے وہیں بے ہوش چھوڑ کر جنگل میں بھاگ گئے تھے۔“ والٹر نے کہنا شروع کیا۔ ”شکر ادا کیجئے کہ ہم نے آپ کو سوتے ہوئے نہیں مارا، نہ زامبا کی چونچ چُرائی۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا مسٹر جان کہ شاگو آزاد ہونے کے بعد بھی ہمارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔ ویسے میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ جرمی کے بارے میں مُجھے کُچھ نہیں معلوم۔ جنگل میں گھُسنے کے بعد نہ جانے وہ کہاں چلا گیا؟ میں تو رُک گیا تھا لیکن وہ غالباً آگے ہی آگے بھاگتا رہا تھا۔“

"اختر جنگل میں چلا گیا تھا! کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں نے خود بھی اُسے تلاش کیا مگر مل نہ سکا۔ ویسے وہ ہوگا یہیں کہیں اور تُم لوگوں سے مل جائے گا۔" والٹر نے آہستہ سے کہا۔

"ہم سے مل کر بھی وہ کیا کرے گا، کم بختو! تُم نے اُسے اختر سے جرمی جو بنا دیا ہے۔" زرینہ نے روتے ہوئے کہا۔ "وہ تو اب اپنی ماں کو بھی نہیں پہچانتا۔"

"کیسے نہیں پہچانتا امّی۔" دُور سے ایک آواز آئی۔ "اختر ابھی تک اختر ہی ہے۔"

یہ آواز سُنتے ہی ہم چونک گئے کیوں کہ یہ آواز اختر کی اپنی آواز تھی؟ حیرت اور خُوشی کے باعث شاید میں غش کھا جاتا مگر سوامی نے مُجھے ٹھوکا دیا کہ

اپنے ہوش و حواس میں رہوں۔ زرینہ اور نجمہ تو اختر کی آواز سُنتے ہی اتنی بے قرار ہوئیں کہ آواز کی سمت بھاگنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بڑی مُشکل سے میں نے انہیں روکا اور پھر میں اُس طرف دیکھنے لگا جِدھر سے اختر آہستہ آہستہ ہماری طرف آتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"اختر۔۔۔ اختر۔۔۔ میرے بچّے تُو زندہ ہے؟" زرینہ بُری طرح رو رہی تھی۔ اور اُس کے یہ آنسو خُوشی کے آنسو تھے۔

"ہاں میں زندہ ہوں امّی۔۔۔ میں ابھی اپنے اور آپ کے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے زندہ ہوں۔۔۔۔" اختر نے یہ کہتے ہوئے ایک عجیب سی چیز ہماری طرف تان لی۔ شاید یہ کوئی ہتھیار تھا۔ ہتھیار کی شکل ٹامی گن سے ملتی جُلتی تھی اور اُس کے اوپر ایک گول چکّر میں سُرخ رنگ کا کوئی مادہ بھرا ہوا تھا۔ ہتھیار کا رُخ خاص طور پر والٹر اور جکاریوں کی طرف تھا۔

اختر کو دیکھتے ہی والٹر گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھر میں نے دیکھا کہ

جکاری بھی خوف زدہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔

"ایک بیٹے کو اُس کی ماں، اس کی بہن، اُس کے شفیق باپ اور بزرگوں سے دُور کرنے کا انتقام تُم سے ضرور لیا جائے گا کوراک۔" اختر نے غصّیلی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اِس ہتھیار کو تُم اچھّی طرح جانتے ہو۔ یہ ہتھیار تمہیں ٹھوس پتھرّ میں تبدیل کر سکتا ہے اور اِس پر لگا ہوا یہ لال چکّر سوبیا دھات سے بھرا ہوا ہے۔ تمہارے جکاری کبھی اِس کے آگے نہیں ٹھہر سکتے۔"

"میں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔۔۔۔ تُم مُجھ سے دور رہو۔" والٹر بہت

دہشت زدہ تھا۔

"اور یہ بھی سُن لو۔" اختر نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "کہ مِرّیخی کو میں نے ختم کیا ہے۔"

"تُم نے اُسے قتل کیا تھا؟" والٹر نے چونک کر پوچھا۔ "کیوں؟"

"اِس لیے کہ وہ تمہارے موجودہ ڈکٹیٹر شا کا جاسوس تھا!"

والٹر یہ سُنتے ہی ڈگمگا گیا اور اُس نے گھبرا کر دروازے کا سہارا لے لیا۔

"جس وقت ہم دونوں مِرّیخی سے لڑنے کے بعد اُسے بے ہوش چھوڑ کر جنگل میں چلے گئے تھے تو میں جان بوجھ کر تُم سے جُدا ہو گیا تھا اور پھر جنگل میں روپوش ہو گیا تھا۔" اختر نے کہنا شروع کیا۔ "تُم تو مُجھے تلاش کرنے کے بعد اپنے اُسی ہال میں لوٹ آئے تھے، لیکن میں دوبارہ اِس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں ابّا جی اور باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ میں اپنی امّی، اپنی بہن اور

اپنے والد کو جگا کر حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ اِن کے پیروں پر گر کر اپنے پچھلے رویّے کی معافی مانگنا چاہتا تھا۔ حالاں کہ میں بے قصور تھا مگر میری زبان سے ایسے گُستاخانہ الفاظ ضرور ادا ہوئے تھے جن سے ہر ایک کو تکلیف پہنچی تھی۔"

اختر نے اتنا ہی کہا تھا کہ والٹر نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پھر اچانک اُس کے ڈانٹنے پر رُک گیا۔

"بھاگو نہیں کوراک۔ میں اب تمہاری چالاکیوں سے اچھّی طرح واقف ہو گیا ہوں۔ جرمی بن کر میں تمہارے تمام رازوں سے واقف ہو چُکا ہوں اور اب میں تُم سے اور تمہارے ساتھیوں سے بے حد خوف ناک انتقام لوں گا۔ پہلے تُم میری یہ بات سُن لو کہ میں نے مِرّیخی کو کیوں قتل کیا تھا؟ میں نے اُسے اِس لیے قتل کیا تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد زامبا کی چونچ چُرانے کی خاطر ابّا جی کو قتل کرنے کے لیے بڑھا تھا۔ اُس کے اِرادے کو

بھانپ کر میں نے اُسے للکارا تھا۔ ہم دونوں کافی دیر تک لڑتے رہے تھے اور خُدا کے کرم سے میں اُس پر غالب آگیا تھا۔ یہ وجہ تھی اُسے قتل کرنے کی اور اب میں تمہیں بھی قتل کرنے سے نہیں چوکوں گا، کیوں کہ سارے فساد کی جڑ تُم ہی ہو۔"

"نہیں۔۔۔۔ نہیں ایسا نہ کرنا۔" والٹر کا چہرہ زرد تھا اور وہ خوف کے باعث کپکپا رہا تھا۔

"نہیں اختر۔۔۔۔ اِس فریبی کی باتوں میں نہ آنا۔ اسے ابھی پتھرّ کا بنا دو۔" جیک نے بے رحمی سے کہا۔

"تم نے اگر مُجھے مار دیا تو تُم بڑی مُشکل میں پھنس جاؤ گے۔" والٹر نے دھمکی دی۔

"اب کون سے ہم مخمل کے گدّوں پر بیٹھے ہیں؟" سوامی نے حقارت سے

کہا۔ "بابا۔ ۔ ۔ اِس کی ایک نہ سُننا۔"

اختر اپنے خاص ہتھیار کو استعمال کرنا چاہتا ہی تھا کہ اچانک شاگو نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "اِسے چھوڑ دو اختر۔ اِس کی قسمت کا فیصلہ اب میرے ساتھی کریں گے۔ میں اِسے اُن کے سامنے پیش کروں گا۔"

اختر چُپ ہو گیا۔ چند منٹ تک وہ خاموشی سے شاگو کو دیکھتا رہا۔ پھر ہتھیار کے ایک خاص مقام سے اپنی انگلی ہٹا کر بولا۔ "میں آپ کی عزّت کرتا ہوں جناب۔ آپ کا حُکم سر آنکھوں پر۔ آپ جانیں اور یہ۔ لیکن میں اِسے قابو میں رکھنے کے لیے سوبیا کے اِس خاص ہتھیار کو اِس کے سامنے ضرور رکھوں گا۔"

جکاری پسپا ہو چکے تھے اور دیوار سے لگے ہوئے سہم رہے تھے۔ والٹر نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے کے سامنے اِس طرح پھیلا رکھے تھے، گویا اپنی موت کو کھڑا دیکھ کر اُس سے بچنا چاہتا ہے۔ اُس کی مجبوری سے فائدہ

اٹھا کر ہم جلدی سے ہال کے اندر پہنچے۔ اُس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ سُرخ رنگ کا چار ہاتھ والا مِرّیخی بھی نہیں جس نے اِس دُنیا میں آنے کے بعد ہمارا استقبال کیا تھا۔ ہال خالی تھا اور وہ مشین بھی وہیں رکھی ہوئی تھی۔ والٹر ہمارے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا، لیکن اختر کے ڈر سے اُس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ البتّہ جکاری باہر ہی کھڑے رہے۔ خود اختر نے بھی اُن کی طرف کوئی توجّہ نہیں دی۔

"اب آپ پلاسٹک کی اِس چھوٹی سی دُنیا یا کوراک کے بنائے ہوئے قید خانے سے نکلنے کے لیے تیّار ہو جائیے۔ اختر نے ہال کی چھت میں لگے ہوئے قُمقُموں کے نیچے ہمیں کھڑا کر کے کہا۔ "کوراک نے ہی آپ کو اِس نیلی دُنیا میں بھیجا تھا اور یہاں سے زہرہ کی بڑی دُنیا میں بھیجنے کا سہرا بھی اسی کے سر رہے گا۔۔۔ کیوں کوراک؟" والٹر ہتھیار کے چکّر میں بھری ہوئی سوبیا کے اثر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ بولا کُچھ نہیں بس دہشت زدہ انداز

میں اُس نے اپنی گردن ہلا دی۔ اختر نے اُسے اشارہ کیا کہ وہ مشین کے پاس جا کر کھڑا ہو جائے۔ اُس نے بلاچُوں وچرا اختر کی بات مانی۔ پھر جب اُس سے کہا گیا کہ وہ مشین کے بٹن دبائے تو جیک نے گھبرا کر کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کم بخت بیچ میں کوئی گڑبڑ کر دے۔"

"میں نے اِس کا بھی علاج پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا مسٹر جیکسن۔" اختر نے خُوں خوار نظروں سے والٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کوراک۔ اگر ہم لوگ صحیح سلامت اوپر کے ہال میں نہیں پُہنچے تو یاد رکھنا تمہاری بھی خیر نہیں ہو گی۔ اوپر والے ہال میں اب جو شخص مشین کا محافظ ہے وہ اتّفاق سے مسٹر شاگو کے حامیوں میں ہے۔ جب میں تمہارے ساتھ اس دُنیا میں آیا تھا تو اُس سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ مشین کے چلنے کے بعد ہم ہال میں نہ پہنچیں تو پھر اُسے اختیار ہو گا کہ وہ اوپر کی مشین توڑ دے اور تمہارا تمام نظام درہم برہم کر دے۔ جانتے ہو کہ اِس سے کیا ہو گا؟ ہمارے ساتھ تُم بھی ہمیشہ

کے لیے اِس ایک سینٹی میٹر کی دُنیا میں رہ جاؤ گے اور پھر شاگو کو اپنے راستے سے ہٹا کر زہرہ کا ڈکٹیٹر بننے کا تمہارا خواب ادھورا رہ جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔" والٹر نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن اِس کی ضمانت کیا ہے کہ اپنے صحیح سلامت اوپر پہنچ جانے کے بعد تُم مُجھے بھی بلا لوگے؟"

"اِس کی ضمانت میں لیتا ہوں!" جان نے والٹر سے کہا۔ "میں نے تمہارے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں ضرور اُوپر بُلا لوں گا۔ میں اب بھی تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں والٹر۔"

"لیکن تمہیں اُسی وقت اوپر بُلایا جائے گا جب میں چاہوں گا۔" اختر نے فوراً کہا۔ "تمہارے ساتھ ہی ہمیں اپنی دُنیا کے اُن انسانوں کو بھی آزاد کرانا ہے جو تمہاری اِس دُنیا میں قید ہیں۔"

والٹر نے مجبوری کے انداز میں اپنی گردن ہلائی۔ اختر کے ہتھیار کا رُخ اب بھی اُسی کی جانب تھا، حالاں کہ سوبیا شاگو کے لیے بھی خطرناک تھی مگر وہ ہمیشہ اختر کے پیچھے ہی رہا۔ اِس لیے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکا تھا۔

ہم لوگ اب ہال کے بالکل بیچ میں قُمقُموں کے نیچے کھڑے ہو چُکے تھے۔ پھر جیسے ہی اختر نے اپنی گردن ہلائی، والٹر نے مشین کے بٹن دبانے شروع کر دیئے۔ ویسی ہی گڑگڑاہٹ کی آوازیں پھر آئیں۔ ہمارے جسم پہلے ہی کی طرح کھینچنے لگے اور پھر وہی عجیب سی کیفیت ہم پر طاری ہو گئی۔

دوبارہ آنکھیں کھولنے پر میں نے دیکھا کہ وہی پرانا ہال ہے، ویسا ہی چوکور فرش ہے۔ وہی کُرسیاں اور وہی ماحول۔ مشین کے پاس ایک چھوٹے قد کا آدمی کھڑا ہے جس کی صورت شاگو کی صورت سے بہت ملتی جُلتی ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ شخص تیزی سے آگے بڑھا اور ایک عجیب سا آلہ جو

مائیکروفون سے ملتا جُلتا تھا، اُس نے جلدی سے شاگو کو پیش کیا اور شاگو نے اُسے اپنے گلے میں تعویذ کی طرح ڈال لیا۔ اِس کے بعد وہ شخص اپنا ایک گھُٹنا زمین پر ٹیک کر اُس کے سامنے سر جھُکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے پرانے آقا کی تعظیم کر رہا تھا۔

"یہ میرا بہت ہی خاص شخص ہے مسٹر جان!" شاگو نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور اِسی شخص نے میری بہت مدد کی ہے!" اختر اسے ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جس وقت شاکا کے سامنے آپ سب پر کوڑے برس رہے تھے تو اِسی شخص نے بعد میں امّی اور نجمہ بہن کے لیے پَروں والا لباس چُپکے سے وہاں لاکر رکھ دیا اور ساتھ ہی ایک پرچہ پر تحریر بھی چھوڑ دی تھی۔"

میں نے اُس شخص کو ہمدردی اور محبّت سے دیکھا تو وہ تھوڑا سا جھُک کر گویا

آداب بجا لایا۔

"جب تک آپ زہرہ میں ہیں، میں اِس بات کا انتظام کر دوں گا کہ میرے ساتھی آپ سے ملاقات کریں تو اِس چھوٹے قد میں ہی کریں۔ مُجھے یقین ہے کہ اِس طرح آپ بلا وجہ خوف میں مُبتلا نہ ہو سکیں گے۔ اچھّا آئیے، اب ذرا اِس دُنیا کو قریب سے دیکھئے جہاں چند لمحے پہلے ہم قید تھے۔"

شاگو نے اتنا کہہ کر سنگِ مرمر کے اُس چوترے کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک سینٹی میٹر کی دُنیا بکھی ہوئی تھی۔ ہم سب نے اُسے قریب سے دیکھا۔ وہ ہلکے سے نیلے مائل سفید رنگ کا پلاسٹک کا بنا ہوا ایک چوکور سا ٹکڑا تھا۔ بہ ظاہر ایک معمولی سا ٹکڑا لیکن ہم ہی جانتے تھے کہ اِس ٹکڑے کے اندر کیا تھا؟ پہاڑ، دریا، چٹّانیں، جنگل اور خون ناک دیوزار سارس! حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ ہم اِس پلاسٹک کے ٹکڑے کے اندر گئے تھے۔ وہاں مختلف سیّاروں کے باشندوں کو آپس میں لڑتے ہوئے

دیکھا تھا، ایک بہت بڑے سارس کو پکڑنے کے لیے کتنی جدوجہد کی تھی۔ (الہٰی توبہ۔ اب کبھی اِن باتوں کو یاد کر کے کلیجہ مُونہہ کو آتا ہے!) وہ چھوٹا سا ٹکڑا ہی دراصل نیلی دُنیا تھی۔۔۔۔ ننّھی سی چھوٹی اور مُختصر نیلی دُنیا! پلاسٹک کی اِس ننّھی سی دُنیا کو دیکھ کر میرا دِل لرزنے لگا، ہاتھ پیر سُن ہو گئے اور پھر میں نے گھبرا کر شاگو سے کہا۔ "اِس مقام سے جلدی نکل چلیئے۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ اِس منحوس چیز کا لگاتار نظّارہ کرتا رہوں۔"

شاگو مُسکرانے لگا اور پھر اُس نے اپنے خاص آدمی کو مُخاطب کر کے کہا۔ "خامن تُم نے اِن دوستوں کو چھُپانے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رکھی ہے کیا؟"

خامن پھر تعظیماً جھُکا اور ادب سے بولا۔ "کیوں نہیں میرے آقا، اپنے مکان کے نچلے اور چوتھے تہہ خانے میں فی الحال اپنے اِن مہمانوں کو چھپایا جا سکتا ہے۔ اس جگہ کا عِلم میرے اور آپ کے علاوہ اور کسی کو

نہیں ہے۔"

"بس تو اِن کو فوراً وہاں لے جاؤ۔ میں اتنے میں اپنے وفاداروں کو اکٹھا کرتا ہوں۔"

"کیا آپ جا رہے ہیں مسٹر شاگو۔" میں نے دریافت کیا۔ "جی ہاں میرے لیے اب عمل کا وقت ہے۔ مُجھے اپنی حکومت پھر سے سنبھالنی ہے۔ اس کے علاوہ میرا سب سے ضروری اور اہم فرض یہ ہے کہ آپ حضرات کو جلد سے جلد اپنے خاص راکٹ میں بٹھا کر آپ کی اپنی دُنیا میں بہ حفاظت پہنچا دوں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کو یہاں باقاعدہ حکومت کرتے ہوئے دیکھ لیں، پھر جائیں۔" جان نے کہا۔

"حکومت تو اب میرے قبضے میں ہے۔ مُجھے تو صرف آزاد ہونا تھا۔ اب

مُجھے کوئی دوبارہ قید نہیں کر سکتا۔" شاگو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ اچانک کوئی بات یاد کر کے وہ پلٹا اور بولا۔ "ہاں، آپ نے یہ نہیں پُوچھا کہ قید سے رہا ہونے کے بعد اب میں آپ کی زبان اتنی آسانی سے کس طرح بول رہا ہوں ہے؟"

"واقعی اِس کا تو ہمیں خیال ہی نہ رہا۔ آزاد ہونے کی خُوشی میں ہم تو سب کُچھ بھول گئے۔" جان نے کہا۔

"خامن کے گلے میں پڑا ہوا یہ آلہ دیکھ رہے ہیں آپ؟" شاگو نے خامن کی طرف اشارہ کیا۔ "اس قسم کے آلے میرے سب وفادار ساتھیوں کو مہیّا کر دیے گئے ہیں۔ جب آپ اپنی دُنیا میں تھے اور زہرہ کی طرف آنے کا پروگرام بنا رہے تھے تب ہی یہ آلہ ایجاد کیا گیا تھا۔ میرے ساتھی خامن نے اِسے ایجاد کیا ہے۔ اِس آلے کی خوبی یہ ہے کہ جس کسی کے پاس یہ آلہ ہو گا وہ دوسروں کی گفتگو بہ خوبی سمجھ سکے گا اور اُن ہی کی زبان میں گفت

گو بھی کر سکے گا۔ پلاسٹک کی دُنیا کا تو ماحول ہی ایسا بنایا گیا تھا کہ وہاں اس آلے کے بغیر سب ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں لیکن زہرہ میں ایسا نہیں ہو گا۔ یہاں کے اسٹیڈیم کے علاوہ اور جگہ یہ آلہ بہت ضروری ہے۔"

"واقعی یہ ایک حیرت انگیز ایجاد ہے۔" جان نے اُس آلے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھّا اب آپ ضامن کے ساتھ تشریف لے جائیے، میں کُچھ عرصے کے بعد آپ سے ملاقات کروں گا۔"

شاگو کے چلے جانے کے بعد خامن ہمیں کُچھ چور راستوں سے گُزارتا ہوا ایک عجیب سی گول عمارت میں لے آیا۔ اِس عمارت کے فرش میں سے اُس نے کُچھ چوکے الگ کیے۔ فوراً ہی وہاں چند سیڑھیاں نمودار ہو گئیں۔ اُس نے ہمیں نیچے اُترنے کے لیے کہا۔ یہ سیڑھیاں ایک ہال میں پہنچیں،

اُس ہال کا بھی فرش ہٹایا گیا۔ پھر سیڑھیاں نظر آئیں۔ ہم پھر نیچے اُترے۔ غرض اِسی طرح ہم چوتھے تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ خامن نے اِس مقام کو ہمارے لیے بڑا آرام دہ بنا رکھا ہے۔ بستر وغیرہ اور کھانے پینے کا ڈھیر سا سامان قرینے سے سجا ہوا تھا۔ ہم اِس قدر بھوکے تھے کہ فوراً کھانوں پر ٹوٹ پڑے۔

فی الحال ہیں وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا لہٰذا ہم کافی دیر تک آرام کرتے رہے۔ جاگنے کے بعد ہم نے خود کو بالکل تر و تازہ پایا۔ اب تھوڑا سا سکون ملا تھا، اس لیے میں اختر کی طرف متوجّہ ہوا۔ وہ بڑا شرمندہ تھا اور مُجھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے کترا رہا تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ زرینہ نے اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور محبّت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اختر اب بھی اُس سے اپنی صفائی میں کُچھ کہہ رہا تھا۔ بار

بار وہ خود پر لعنت بھیجتا تھا کہ اُس نے جرمی کے چولے میں آنے کے بعد ہم سب کو نازیبا اور بُرے الفاظ میں مُخاطب کیا تھا۔ جب میں نے اُسے تسلّی دی تو وہ جلدی سے اُٹھ کر میرے سینے سے لگ گیا۔ روتے روتے اُس نے میرا شانہ گیلا کر دیا۔ میں نے اسے چمکارا اور پیار سے اُس کے گالوں کو تھپتھپایا تب کہیں جا کر وہ چُپ ہوا۔

"پچھلی باتوں کو بھول جاؤ بیٹے۔ تُم اپنے ہوش میں کب تھے؟" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بتاؤ تُم کب جرمی سے اختر بن گئے تھے؟"

"ہاں یہ بات بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ اِس طرح ہم یہ جان سکیں گے کہ تُم اِن لوگوں کے کِن کِن رازوں سے واقف ہو۔" جان نے اُٹھ کر اختر کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"میں بم ساز فیکٹری میں سائنس داں تھا مسٹر جان۔" جیکسن نے کہا۔ "اگر مُجھے ذرا سا بھی اشارہ مل جائے تو میں اِن لوگوں کے خُفیہ اڈّوں کو اُڑا سکتا

ہوں۔ صرف معلوم یہ کرنا ہے کہ انہیں مسٹر اختر پر شُبہ تو نہیں ہوا۔"

ہم تینوں نے سوالات بالکل ٹھیک کیے تھے۔ لہٰذا اِن کا جواب دیتے ہوئے اختر نے اپنی کہانی اِس طرح بیان کرنی شروع کی۔

"کوراک دراصل شاکا کا نمائندہ تھا اور والٹر کے فرضی نام سے امریکہ میں مقیم تھا۔ اِسی کی وجہ سے بمبئی میں ہمارے محل پر وہ تباہی نازل ہوئی کہ جانور بڑے ہو گئے اور انسانوں کے دُشمن بن گئے۔ کوراک ہی نے امجد بھائی اور نجمہ بہن کو موٹر سمیت اغوا کیا تھا۔ وہ یہ سب کام امریکہ میں اپنی خُفیہ لیبارٹری میں بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ سائنس میں مہارت کی وجہ سے اُس نے زہرہ کا عکس ہمیں بمبئی میں دیوار پر دکھایا اور پھر سمندر میں لے جا کر میرے دماغ کو صاف کر کے مُجھے اپنا غُلام بنا لیا۔ مُجھے فوراً ہی آپ سب سے نفرت اور دُشمنی ہو گئی۔ مُجھ سے کہا گیا کہ میں ژاما کا بیٹا جرمی ہوں۔ میں نے مان لیا اور پھر میں ہر وقت آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے

لگا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ آپ راکٹ میں بیٹھ کر زہرہ جائیں۔ غرض میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور مُجھے نچانے والی ڈوریاں والٹر کے ہاتھ میں تھیں۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ آپ کے پاس مسٹر شاگو کے خاص راکٹ کا فارمولا آگیا ہے تو اُس نے آپ کے دماغوں کو ایک خاموش حُکم دیا کہ آپ سب امریکہ آئیں اور اُس سے مدد مانگیں۔۔۔۔"

"اوہ تو یہ چال تھی!" جان نے دانت پیستے ہوئے مُٹھّیاں بھینچ لیں۔

"امریکہ جانے کے بعد۔۔۔" اختر نے آپ بیتی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے وہی کیا جو والٹر چاہتا تھا۔ وہ مُجھے باغ میں بُلا کر سبز روشنی سے نہلاتا تھا۔ مُجھے وہ روشنی بڑی پیاری لگتی تھی۔ جی چاہتا تھا جہاں سے یہ روشنی آ رہی ہے اُڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ یہ روشنی والٹر پہلے ہی اپنی لیبارٹری میں سے آسمان کی طرف پھینکتا تھا اور پھر وہاں سے مُنعکس ہو کر مُجھ پر گِرتی تھی۔ میرا دماغ یہی سوچتا تھا کہ روشنی میرا آقا آسمان سے

پھینک رہا ہے۔ کلّو سوامی میرا راز کُچھ کچھ جان گئے تھے۔ اِن پر بھی سمندر
میں عمل کیا گیا تھا مگر اپنی ہوشیاری کے باعث وہ والٹر کے دام میں نہیں
آئے تھے۔ والٹر اِس حقیقت کو جان گیا اور پھر اُس نے امریکہ ہی میں
سوامی کو بھی سبز روشنی کے حلقے میں لے لیا۔ شائد کلّو سوامی والٹر کے جال
میں پھنس جاتے، اگر آپ عین وقت پر راکٹ ساز فیکٹری کے قریب کے
جنگل میں نہ آ جاتے۔۔۔۔ والٹر نے اُسی وقت ایک خاص شُعاع کے
ذریعے مُجھے واپس کمرے میں بھیج دیا اور کلّو سوامی سبز روشنی میں مُجھے
ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ والٹر نے میرے کمرے میں میرا ہی جیتا جاگتا
عکس بھی پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ سب دھوکے میں آ گئے،
کیوں کہ یہ نا مُمکن تھا کہ میں ایک ہی وقت میں کمرے میں بھی موجود ہوتا اور
اُسی وقت باہر بھی۔ بہر حال بعد میں کوراک نے مُجھ سے فارمولا چوری کرایا
اور پھر مُجھے راکٹ کے اندر بھی پریشان کیا۔۔۔۔ اُس نے مُجھے آپ

سب کا آقا بنا دیا اور آپ لوگ میرے کہنے پر چلنے لگے۔۔۔۔"

"ایک بات بتاؤ بابا۔۔۔۔" سوامی نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "جب تمہارا دماغ تمہارا اپنا نہیں تھا اور والٹر نے تمہیں اپنے قبضے میں کر رکھا تھا تو پھر تمہیں وہ باتیں کِس طرح معلوم ہوئیں جو تمہارا دماغ چِھن جانے کے بعد پیش آئیں۔"

"میں اب وہی بات بتانے والا تھا۔" اختر نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "والٹر میرے دماغ پر جو اثر طاری کرتا تھا وہ دراصل عارضی ہوتا تھا۔ یہ ایک قسم کی بیٹری چارجنگ تھی۔ جس طرح بیٹری کی بجلی ختم ہونے کے بعد اُسے دوبارہ چارج کرنا پڑتا ہے، وہی صورت میرے ساتھ بھی تھی۔ جس وقت والٹر کا اثر میرے دماغ پر سے ہٹ جاتا تھا، مُجھے پچھلی باتیں یاد آنے لگتی تھیں۔ پھر مُجھے بڑا غصّہ آتا تھا۔ لیکن میں باغی ہونا ہی چاہتا تھا کہ پھر والٹر کے اثر میں آ جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مُجھے پچھلی باتیں برابر یاد

رہیں۔۔۔۔"

"لیکن والٹر کا اثر مکمّل طور پر کب تمہارے ذہن سے دُور ہوا؟"

میرے یہ پوچھنے پر اختر نے پھر کہنا شروع کیا۔ "وہ میں اب بتا رہا ہوں ابّا جی۔۔۔۔ ہمارا راکٹ شاید زہرہ تک صحیح سلامت پہنچ جاتا اگر درمیان میں سبز ستارہ نہ آجاتا۔ خوش قسمتی سے والٹر کو اِس سیّارے کا عِلم نہیں تھا، کیوں کہ یہ سیّارہ اپنے مدار سے ہٹ کر ایک مساوی کشش میں آکر پھنس گیا تھا۔۔۔ یعنی زمین اور زہرہ کی درمیانی کشش جس مقام پر ملتی ہے، سبز سیّارہ وہاں آکر اٹک گیا تھا۔ نجمہ بہن کی کار خلا میں نہیں گئی تھی، بلکہ والٹر نے کار کو بمبئی ہی میں ایک مقام پر چھُپا کر اِن دونوں کے ذہن اپنے قابو میں کر لیے تھے۔" اختر نے نجمہ اور امجد کی طرف اشارہ کیا۔ "اِنہیں ایک چھوٹے راکٹ میں بٹھا کر زہرہ کی طرف بھیجا جا رہا تھا کہ سبز سیّارے نے اِسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بالکل اُسی طرح جیسے ہمارا راکٹ کھچ گیا تھا۔"

"اور وہاں پر مکّڑ آدمیوں کی قوم نے ہمیں اپنا قیدی بنا لیا۔" جیک نے نفرت سے ناک سکوڑ کر کہا۔

"ہاں۔۔۔ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ ہم اِس طرح ایک مقام پر مل جائیں گے۔" اختر نے جوشیلی آواز میں جواب دیا۔ "اچھّا اب سنئے کہ یہاں سے میں اپنے ہوش میں آتا ہوں۔ بات اِس طرح ہوئی کہ جب میرے سر پر کتاک باندھا گیا تو اُس نے مُجھ میں ایک عجیب سی تبدیلی پیدا کر دی۔ کتاک بندھ جانے کے بعد مُجھے محسوس ہوا کہ میں اختر ہوں، والٹر کا اثر میرے دماغ پر سے بالکل زائل ہو گیا۔ میں نے اُسی وقت دِل میں یہ پکّا اِرادہ کر لیا کہ اب اداکاری ہی کرتا رہوں گا اور کسی پر یہ ظاہر نہ کروں گا کہ میں ہوش میں آگیا ہوں اور سب کو پہچانتا ہوں۔ کتاک کے سُنہری گولے میں جو پاؤڈر بھرا ہوا تھا یہ دراصل اُس کا کرشمہ تھا۔ والٹر میری اِس اداکاری کو سمجھ نہ سکا اور اُسے اِس بات کا یقین ہی رہا کہ میں ابھی تک اُس کا غُلام ہوں۔"

"مطلب یہ کہ اِس کے بعد تُم جو کرتے رہے، اپنی مرضی سے کرتے رہے۔" جیکسن نے تعریفی نظروں سے اختر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جی ہاں۔ میں جان بُوجھ کر آپ سب سے بُرے لہجے میں گفتگو کرتا رہا تاکہ اصلیت کوراک پر ظاہر نہ ہو جائے۔ خُدا کا شکر ہے کہ وہ دھوکے ہی میں رہا اور اُس کی اس غفلت سے فائدہ اُٹھا کر میں نے شاکا کے بہت سے راز جان لیے۔ شاکا کے ہی ایک دوست سے مُجھے یہ عجیب بات بھی معلوم ہوئی کہ کوراک کے کام سے مطمئن نہ ہو کر شاکا خود بھی ہماری زمین کی طرف گیا تھا۔ مگر شائد جلد ہی واپس آگیا۔ غالباً اُسے کوئی نہ کوئی مُشکل ضرور پیش آئی تھی۔ جب ہی وہ ہمارے زہرہ پر پہنچنے سے پہلے یہاں آگیا تھا اور غار والے ہال میں اُس نے ہم سے ملاقات کر کے آپ پر چکاریوں سے کوڑے برسوائے تھے۔"

"اُس وقت کو یاد نہ دِلاؤ بیٹا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" زرینہ

لرز گئی۔

"اچھّا پھر کیا ہوا؟" امجد نے پوچھا۔

"جو باتیں میں نے معلوم کیں، وہ دراصل اِس قوم کی اپنی ذاتی باتیں ہیں اور ہمارے لیے بے کار ہیں۔ اُن سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں جب مُجھے یہ عِلم ہوا کہ کوراک نے آپ سب کو نیلی دُنیا میں قید کر دیا ہے تو میں بہت پریشان ہوا۔ ہر وقت مُجھے یہی دُھن رہنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح میں آپ کو آزاد کراؤں۔ کوراک کے محل میں جو مشینیں لگی ہوئی تھیں انہیں صرف وہ اور اُس کے چند ساتھی ہی چلا سکتے تھے۔ ایک دِن مُجھے مسٹر شاگو کا خاص دوست خامن ملا۔ وہ صاف پہچان گیا کہ میں اداکاری کر رہا ہوں۔ وہ میرا رازدار بن گیا اور پھر اسی نے مُجھے یہ مشورہ دیا کہ کوراک کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ میرے ساتھ نیلی دُنیا میں چلے اور قیدیوں کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں قیدیوں

کے اِرادے کبھی پورے نہ ہونے دوں گا اور قدم قدم پر اُن کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کروں گا تو وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا؟ واہ فیروز کا اپنا بیٹا اس کے سامنے جب دُشمن بن کر جائے گا تو کتنا مزہ آئے گا! جب وہ فیروز کے اِرادوں میں رکاوٹ پیدا کرے گا تو فیروز اور جان کتنے جلیں گے۔ یہ منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا، لہٰذا ایک دِن وہ مُجھے اپنے ساتھ لے کر نیلی دُنیا میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے میں خامن کو ہدایت دے گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح کوراک کے محل میں پہنچ کر مشین پر قبضہ کرے لہٰذا آپ سب دیکھ ہی رہے ہیں کہ میری چال کام یاب ہوئی۔ کوراک کو ہم نے نیلی دُنیا میں پھنسا دیا اور خود آزاد ہو کر یہاں آ گئے۔"

اتنا کہہ کر اختر نے فخریہ انداز میں سب کی طرف دیکھا، گویا ہر ایک سے داد طلب کرنے کا خواہش مند ہو۔ میں اپنے پیارے بیٹے کو دِل ہی دِل میں

شاباشی دے رہا تھا۔ اس نے حقیقت وہ کام کر دکھایا تھا جو ہم نہیں کر سکے تھے۔ دیکھا جائے تو ہمیں آزاد کرانے کا سہرا بھی اُسی کے سر تھا۔ اختر نے اپنی یہ داستان سُنانے کے بعد مُجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ابّا جی، لاعلمی میں مُجھ سے بہت غلَطیاں ہوئی ہیں۔ میں نے سب کو بُرا بھلا کہا ہے اور تکلیفیں بھی پہنچائی ہیں۔ لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا راز کھُل جاتا۔ اِس کے باوجود میں آپ سے، امّی سے اور سب سے معافی مانگتا ہوں۔۔۔"

"اختر۔۔۔ میرے اختر۔۔۔" زرینہ بے تاب ہو کر رونے لگی اور پھر اُس نے اُٹھ کر اختر کو سینے سے لگا لیا۔ نجمہ نے بھی پھر ایسا ہی کیا۔ کافی دیر تک گلے شِکوے ہوتے رہے اور اختر مختلف تجویزیں پیش کرتا رہا۔ میرے یہ پُوچھنے پر کہ اب کیا ہو گا اُس نے جواب دیا۔ "شاگو صاحب اپنے حامیوں کو جمع کرنے گئے ہیں۔ کوراک ہی اُن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا اور وہ اب نیلی دُنیا میں قید ہے۔ جب باغی اکٹھّے ہو کر شاکا کے محل پر حملہ

کریں گے تو وہ یقیناً ہار مان لے گا۔"

"یہ بھی تو مُمکن ہے کہ شاکا جنگ کرے؟" جیکسن نے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو پھر ہم اُس سے لڑیں گے۔ خامن نے مُجھے بتایا ہے کہ مسٹر شاگو کو بہت سے ایسے طریقے معلوم ہیں جِن کے ذریعہ سے شاکا چند سیکنڈ میں ختم ہو سکتا ہے۔"

"کون سے طریقے؟" جیکسن نے دِل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"صرف شاگو ہی جانتے ہیں کہ وہ طریقے کیا ہیں؟" اختر نے جواب دیا۔ "بہر حال ہم شاکا کو ختم کرنے کے بعد نیلی دُنیا کے قیدیوں کو بھی آزاد کرالیں گے، اپنی دُنیا کے قیدیوں کو اپنے ساتھ لے چلیں گے اور باقی کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

"کیا آزاد ہونے والے قیدیوں میں والٹر بھی ہو گا؟" جیک نے پوچھا۔

"ضرور ہوگا۔ اگروہ آزاد نہ ہوا تو تُم لوگوں سے بدلہ کون لے گا۔"

یہ آواز کونے میں سے آئی تھی۔ ہم نے گھبرا کر اُس کی طرف دیکھا تو ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ والٹر چند محافظوں کے ساتھ ہمارے کمرے کے چور دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اُس کا رُخ ہماری طرف تھا۔

تم سے بدلہ کون لے گا یہ والٹر نے کہا

مجھے یوں لگا گویا پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئ ہو۔ بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد تو ہم آزاد ہوئے تھے۔ لیکن افسوس یہ آزادی عارضی تھی! والٹر اب پھر سے ہمارے سروں پر سوار تھا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ غصّہ کی وجہ سے وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ صرف اُسی کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اُس کے تین محافظوں کے پاس ویسے ہی بگل کی صورت جیسے ہتھیار۔

والٹر محتاط انداز میں قدم بڑھاتا ہوا اختر کے پاس آیا۔ سفید رنگ کا ایک موٹا سا چمکیلا کپڑا اُس کے اُلٹے ہاتھ میں تھا۔ پلک جھپکتے میں اُس نے یہ کپڑا اختر کے اس ہتھیار پر ڈال دیا جو اس وقت ایک میز پر رکھا ہوا تھا۔ اپنے ایک محافظ کو وہ ہتھیار دینے کے بعد اُس نے پوری قوّت سے ایک مُکّا اختر کی کنپٹی پر رسید کیا۔ اور وہ بے چارہ اُس کی تاب نہ لا کر نیچے گِر پڑا۔

"ہماری دُنیا میں آکر ہم ہی سے مُقابلہ کرنے چلے ہو!" والٹر نے غُصّے سے

دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”میں اب تک تمہیں بڑی سہولت دیتا آیا ہوں۔ مگر اب ایک ایک سے بدلا لوں گا۔۔۔۔ سمجھے؟“

”ایک کمزور لڑکے پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے تُجھے شرم نہ آئی۔“ جیک نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہمّت ہے تو ریوالور پھینک کر مُجھ سے مُقابلہ کر۔۔۔“

”تاکہ تم مُجھ پر پھر سے قابو حاصل کر لو۔“ والٹر یہ کہہ کر خوب زور سے ہنسا۔ ”نہیں میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ میں اب تمہیں اِس کا موقع ہی نہیں دوں گا۔“

”سنو والٹر۔۔۔“ زرینہ نے آگے بڑھ کر بے خوفی سے کہنا شروع کیا۔ ”میں نہیں جانتی کہ میری باتوں کا تُم پر کیا اثر ہو گا۔ لیکن مُجھے یہ باتیں کہنی ضرور ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تم بوکھلا گئے ہو۔ ایک معمولی سے لڑکے نے تمہیں شکست دی ہے۔ اِس لیے تُم اُس سے انتقام لینے کے

لیے تڑپ رہے ہو۔ مگر سوچو اگر اس کی جگہ تُم ہوتے تو کیا آزادی کی کوشش نہیں کرتے! کیا تُم یہ نہیں چاہتے کہ اپنی پیاری دُنیا میں واپس چلے جاؤ۔۔۔ اختر نے جو کُچھ بھی کیا یہ اُس کا فرض تھا۔ لیکن افسوس تُم ایسے فرض شناس لڑکے کی ذرا بھی قدر نہیں کرتے! وہ چاہتا تو سوبیا والے اِس ہتھیار سے تُمہیں ختم کر سکتا تھا۔ مگر اِس نے ایسا نہیں کیا۔ بلا وجہ خون بہانا ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا کر دیتا تو شاید تم اِس طرح دلیرانہ ہمارے سامنے نہیں کھڑے ہوئے ہوتے!"

"تُم کیا کہنا چاہتی ہو؟" والٹر نے خلافِ توقّع نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ بدلے اور اِنتقام کا جذبہ تُم اپنے دِل میں سے اِسی طرح نکال دو جس طرح اختر نے نکال دیا تھا۔ جب اُس نے تمہیں قتل نہیں کیا تو تُم اُس کے ماں باپ اور ساتھیوں کو کیوں پریشان کرتے ہو؟"

"میں تُم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مُجھے اِس طرح کی باتوں سے پریشان

مت کیا کرو۔ انسانوں میں کافی عرصے تک رہنے کے بعد میرا دِل کافی نرم ہو گیا ہے۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی اخلاق اور مروّت کا مظاہرہ کروں۔"

"تمہارا لہجہ بتا تا ہے کہ تمہارا دِل پسیج رہا ہے۔" میں نے اب اِس گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا۔ "والٹر تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا۔ ہمیں ہماری دُنیا میں پہنچا دو۔ یقین مانو ہم یہاں کسی بُری نیّت سے نہیں آئے تھے، تمہاری قوم کی مدد کرنے ہی آئے تھے۔ یہ میں تُم سے پہلے بھی کہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں لہٰذا بتا دو کہ کیا ہم لوگ قصوروار ہیں؟"

والٹر سر جھکاتے ہوئے بہت دیر تک خاموش کھڑا کُچھ سوچتا رہا۔ وہ بے خبری میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد کہنے لگا۔

"شاید تمہیں نہیں معلوم کہ اپنی ایک سینٹی میٹر والی دُنیا سے نکلنے کے لیے مُجھے کتنی مُصیبتیں اُٹھانی پڑی ہیں۔ تمہارے اُس سنپو لیے نے تو مُجھے ہمیشہ کے لیے مار ہی دیا تھا۔ شاگو کے گُرگے خامن نے میری مشینوں کو

اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اِس کے باوجود میں آزاد ہو گیا کس طرح۔۔۔ یہ میرا ایک راز ہے۔ ہاں اتنا ضرور بتاؤں گا کہ آزادی کے لیے مُجھے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ مُجھے اِس سِلسلے میں جو تکلیفیں پہنچی ہیں بھلا میں اُنہیں کس طرح بھول سکتا ہوں۔ لہٰذا میں بدلا لیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔"

"سوچ لو۔ کیا یہی میرے احسانوں کا بدلا ہے والٹر؟" جان نے اُسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"احسانوں کا بدلا!" والٹر پھر بولا۔ "وقت آنے والا ہے میرے عزیز دوست جب تُم اِس فقرے پر غور کرو گے اور روؤ گے، سر پکڑ کر روؤ گے۔۔۔۔"

اِس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اُسے روکتا، وہ تیزی سے مُڑا اور اپنے محافظوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ میں نے اُس کے جانے کے بعد دروازے کو کھولنے کی بہتری کوشش کی، مگر وائے نصیب! ہماری قسمت کا

دروازہ اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا۔

ایک طویل عرصے کے بعد (شاید یہ عرصہ صرف دو دِن کا تھا۔ مگر قید میں طویل معلوم ہوا تھا) دروازہ کھُلا اور جکاریوں وزوکوں کی مُختصر سی فوج ہمیں دروازے میں کھڑی دِکھائی دی۔ وہ ہمیں گرفتار کرنے آئے تھے۔ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ مُجھے کتنی تکلیف ہوئی ہے۔ ہمارے پاس سوبیا کا ایک ہتھیار تھا، وہ بھی والٹر لے گیا تھا۔ جکاریوں سے لڑنا دراصل اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ لہٰذا ہم زندہ لاشوں کی طرح چُپ چاپ کھڑے رہے اور اپنی پھٹی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔

ہمیں ایک بہت ہی اُونچے اور لمبے چوڑے ہال میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ہال اتنا بڑا تھا کہ اُس کا دوسرا کنارہ ہمیں بالکل نظر نہ آتا تھا۔ کہیں دُور سے وہ منحوس آواز بھی آ رہی تھی جو دراصل جکاریوں کو کام میں اُلجھائے رکھتی تھی اور جو

ایک بہت بڑے گھنٹے میں سے پیدا ہوتی تھی۔ ہال میں زہرہ کے لوگ کھچا کھچ
بھرے ہوئے تھے۔ اُس بھیڑ میں ہم چیونٹیوں کی طرح دِکھائی دیتے تھے۔
اُسے دیکھ کر مجُھے رومنوں کے زمانے میں تعمیر کی ہوئی وہ جگہ یاد آ گئی جہاں
روم کے بادشاہ قیدیوں کو شیروں سے لڑوا کر تماشا دیکھتے تھے۔ زہروی
باشندے ہمیں بالکل اُسی طرح دیکھ رہے تھے۔ جس مقام پر ہمیں لے جا
کر کھڑا کیا گیا تھا، اُس سے کُچھ ہی فاصلے پر ایک بہت ہی اونچی اور زر و جواہر
سے مزیّن کُرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کُرسی زہرہ کے موجودہ
ظالم ڈکٹیٹر شاکا کے بیٹھنے کے لیے ہے۔

ہال کے بالکل بیچوں بیچ ایک اونچا راکٹ بھی کھڑا ہوا تھا۔ اُونچا لفظ میں نے
اپنے لیے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ وہ راکٹ اتنا ہی اونچا تھا جتنا کہ ہوسٹن
امریکا کے خلائی مرکز سے چھوڑے جانے والا راکٹ ہوتا ہے البتّہ
زہروی لوگوں کے اُونچے قد کے مُقابلے میں وہ صرف ایک کھلونا تھا۔

اِس راکٹ کو دیکھ کر میرا دِل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ کیا یہ راکٹ ہمیں واپس اپنی دُنیا میں لے جانے کے لیے تیّار کیا گیا ہے؟ یہی تھا وہ سوال جو رہ رہ کر میرے دِل میں پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن والٹر اور شاکا کے رویّے کو دیکھتے ہوئے ایسا سوچنا بالکل غَلط تھا۔ پتہ نہیں وہ دونوں شیطان اِس راکٹ سے کیا کام لینا چاہتے تھے؟

ہمیں ایک اُونچے پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا گیا۔ زرینہ اور نجمہ بُری طرح کپکپا رہی تھیں۔ غالباً وہ سوچ رہی تھیں کہ اُن کی قسمتوں کا فیصلہ جلد ہی ہونے والا ہے۔ اختر بالکل نڈر تھا اور سینہ تانے ہوئے خاموش کھڑا تھا، جیک اور سوامی بھی لاپروا تھے۔ جان بھی سنجیدہ تھا۔ البتّہ جیکسن کا بُرا حال تھا۔ اُس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ بار بار وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر مُجھ سے دریافت کرتا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ امجد کے ہاتھوں کی مُٹھّیاں بھنچی ہوئی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ جو بھی اُس کے سامنے آئے گا وہ اُس

سے فوراً لڑ پڑے گا۔

اچانک ہال میں ایک شور بُلند ہوا۔ جب میری نظر بائیں طرف سے آتے ہوئے چند لوگوں کی طرف گئی تو اس شور کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ ہمارا ارا عزیز دوست شاگو اپنے چند حامیوں کے ساتھ گرفتار ہونے کے بعد ہماری طرف آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ خامن بھی تھا۔ جکاریوں نے اُنہیں جانوروں کی طرح ہانک کر اوپر چڑھا دیا۔ جیسا کہ شاگو نے پہلے کہا تھا، اُس کا اور اُس کے ساتھیوں کا قد اِس وقت بھی انسانوں جیسا ہی تھا۔

"آخر کار آپ لوگوں سے ملاقات ہو ہی گئی۔" شاگو نے آتے ہی پژمُردہ لہجے میں کہا۔ اُس کا جواب دینے کی بجائے میں کُچھ اور ہی سوچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب جب کہ شاگو کے پاس وہ چیز نہیں ہے (جو در حقیقت گفتگو کرنے کا آلہ تھا) تو پھر کس طرح میں نے اُس کی بات سمجھی؟ جب میں شاگو سے اِس کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگا۔

"اِس ہال کی فضا کبھی سینٹی پیٹر والی دُنیا کی سی ہے۔ یہاں پر بات سمجھنے کے لیے اُس آلے کی ضرورت نہیں ہے۔

جان کے پوچھنے پر کہ اُس پر کیا بیتی جو وہ گرفتار ہو گیا۔ شاگو نے مزید کیا۔

"افسوس مُجھے یہ معلوم نہ تھا کہ شاکا کے جاسوس چپّے چپّے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جس وقت میں آپ سے جُدا ہوا تو جاسوس میرے پیچھے لگ گئے اور

وہ ایک ایک بات کی خبر شاکا کو دیتے رہے، مُجھے بھی آپ کے ساتھ آج ہی گرفتار کیا گیا ہے۔ لیکن مُجھے اِس عرصے میں جتنا بھی وقت ملا ہے۔ میں اُس میں بغاوت کرنے کا پورا انتظام کر آیا ہوں۔"

"اب ہمارا کیا حشر ہو گا اور یہ راکٹ یہاں کیوں کھڑا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"راکٹ کے بارے میں تو میں کُچھ نہیں کہہ سکتا، ہاں یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ ہمارا کیا حشر ہو گا۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ جیسے ہی شاکا اپنے تخت پر آ کر بیٹھے میرے ساتھی بھیڑ میں شامل ہو کر اُس کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیں گے۔ اِس سے لوگوں میں کھلبلی مچ جائے گی اور پھر فوراً ہی لوگ آپس میں لڑنے لگیں گے۔ بس سمجھ لیجئے وہیں سے بغاوت شروع ہو گی۔ اگر یہ بغاوت کامیاب رہی تو شاکا یقیناً مارا جائے گا اور پھر آپ سب آزاد ہوں گے۔"

"لیکن اگر ایسا نہ ہوا؟" جان نے جلدی سے پوچھا۔

"تب تو مجبوری ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ لوگوں پر اُسی وقت آنچ آ سکتی ہے جب کہ میں زندہ نہ رہوں۔ آپ جیسے شریف انسانوں پر نثار ہونے کا اگر وقت آیا تو سب دیکھیں گے کہ میں سب سے پہلے آگے بڑھوں گا۔"

"یہ تو تمہارا اخلاق ہے شاگو۔ لیکن خُدارا یہ بتاؤ اب کیا ہونے والا ہے؟"

"میں بتاتے ہوئے جھجک رہا تھا مسٹر جان۔" شاگو نے افسوس ناک لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارے ہاں کی رسم ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر قیدیوں میں سے ایک آدمی کی قربانی دی جاتی ہے۔ دیکھنا یہی ہے کہ ہم سب میں سے کس کا نمبر آتا ہے۔"

"کیا کہتے ہو!" جان نے چونک کر کہا۔ "یہ فضول رسمیں یہاں بھی موجود ہیں

کیا؟ میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ اپنے کسی بھی ساتھی کو یہاں سے نہ جانے دوں گا۔"

"آپ بے بس ہیں مسٹر جان۔ اِس لیے آپ کُچھ نہیں کر سکتے۔ شاکا طاقت ور اور اپنی مرضی کا مالک ہے لہٰذا وہ سب کُچھ کر سکتا ہے۔"

شاگو کی یہ بات سُن کر میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مُجھے وہ وقت یاد آ گیا جب کہ میں اپنے دوسرے سفر میں ایک ایسے علاقے میں پھنس گیا تھا۔ جہاں یہ کم بخت جکاری ہی سب کُچھ تھے اور اُنھوں نے جیک کو پکڑ کر اُس کی قربانی دینی چاہی تھی۔ ویسی ہی قُربانی دُنیا سے کروڑوں میل دور زہرہ سیّارے میں بھی ہونے والی تھی! میرے معبود! یہ میں کسی عذاب میں گرفتار ہو گیا؟ نہ جانے کم بخت شاکا ہم میں سے کس کو قربانی کے لیے پسند کرے۔

ہم سب اُس چبوترے پر خاموش کھڑے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ

شاکا کب اپنے منحوس تخت پر بیٹھتا ہے اور ہم سے مخاطب ہوتا ہے۔ شاگو بار بار مُجھے یقین دلا رہا تھا کہ اگر شاکا نے قربانی کے لیے میری پارٹی میں سے کسی کو چُنا تو وہ اُس کے بدلے خود جائے گا اور خُوشی خوشی قربان ہو جائے گا۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ ناانصافی تھی۔ وہ زہرہ کا امن پسند لیڈر تھا۔ اور اُسے کسی بھی حالت میں قربان نہیں ہونا چاہیے تھا!

اچانک ایک لرزتی اور کپکپاتی ہوئی چیخ سُنائی دی۔ دراصل یہ ایک آواز تھی کو کہہ رہی تھی کہ شاکا نے قیدیوں سے قُربانی کے لیے صرف ایک شخص کو پسند کیا ہے اور اُس کا نام ہے۔ جیکسن!

میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ہماری اِس وقت کیا حالت ہوئی؟ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جیکسن خوف زدہ آواز میں چلّانے لگا۔ بار بار وہ شاکا کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ اُس کی آواز شاکا کی آواز میں دب کر رہ گئی تھی۔ کیوں کہ اب شاگو نے بھی چیخنا شروع کر دیا تھا۔ ہم اُسے روک رہے تھے لیکن وہ برابر

چلّائے جا رہا تھا۔ میں جاؤں گا۔ مُجھے قُربان کرو۔ میری قُربانی دو۔ یہ لوگ بے قصور ہیں۔ شا کا ظالم ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جکاری جیکسن کو گرفتار کرنے کے لیے اب پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور جیکسن موت کو سامنے دیکھ کر کپکپا رہا تھا۔ جکاریوں کے ہاتھ میں ایک لمبا سا ہنٹر تھا اور اُن کی ایک آنکھ سے شُعلے نکل رہے تھے۔ ہمیں اچھّی طرح معلوم تھا کہ ہم سب میں سے کوئی بھی جکاریوں سے نہیں لڑ سکتا۔ کیوں کہ اُن کے جسم کے چھُونے سے جو زبردست بجلی کا جھٹکا لگتا تھا اُس کی تکلیف ہمیں ابھی تک یاد تھی۔ جیکسن چلّاتا ہوا اُن کے ساتھ چلا گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے سیڑھیوں سے نیچے قدم رکھ رہا تھا۔ اُس میں اتنی ہمّت نہیں تھی کہ وہ جکاریوں سے لڑنے کی کوشش کرتا۔

ہم بے بسی کے عالم میں اُسے جاتے دیکھتے رہے۔ ہمارے دِل رو رہے تھے مگر ہم اپنے ایک ساتھی کو موت کے مُونہہ میں جانے سے کسی بھی

طرح نہ روک سکتے تھے۔ شاگو، خامن اور اُس کے ساتھی ابھی تک ہمارے ہی قد کے برابر تھے، لہٰذا اُن کی چیخ پکار اِتنی تیز نہیں تھی کہ والٹر کے کانوں تک پہنچ سکتی۔ والٹر ہمیں مُسکرا کر دیکھ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں ہمارے لیے نفرت ہی نفرت دِکھائی دے رہی تھی! اِس سے پہلے اُس نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اُس نے نیلی دُنیا کو تباہ کر دیا ہے اور اِس تباہی سے وہ لوگ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چُکے ہیں جو زمین کے رہنے والے تھے۔ اِس بات سے مُجھے جتنا رنج پہنچا تھا میں بیان نہیں کر سکتا۔

اِس ہال کو میں اب اسٹیڈیم ہی کہوں گا جہاں پر جیکسن کو لے جایا گیا تھا۔ درمیان میں ایک سیاہ چبوترہ تھا اور جیکسن کو اُس چبوترے پر لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ دو جکاری اُس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور پھر ایک موٹا تازہ جکاری اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک بہت بڑا تیر لیے ہوئے چبوترے پر

چڑھا۔ جیکسن اُسے دیکھ کر بُری طرح گڑگڑانے لگا۔ اچانک ایک زبردست اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز سُنائی دی۔ یہ آواز میونسپلٹی کے سائرن سے ملتی جُلتی تھی۔ آواز کے ختم ہوتے ہی ڈھول اور نقّارے بجنے لگے اور پھر میں نے دیکھا کہ شاکا اپنے تخت پر آکر بیٹھ رہا ہے۔

"قیدی کی قربانی دی جائے۔" اُس نے بیٹھتے ہی حُکم دیا۔

والٹر شاکا کے برابر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور حُکم پاتے ہی والٹر نے جکاریوں کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ وہ فوراً جیکسن کی گردن اُڑا دیں۔ نجمہ اور زرینہ نے جلدی سے اپنے مُونہہ پھیر لیے اور ہم نے بھی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ ہم وہ بھیانک منظر دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ یکایک شور بڑھنے لگا۔ اور لوگ خُوشی کے نعرے لگانے لگے۔ خلافِ توقّع ڈھول پھر بجنے لگے اور تب شاگو نے مجُھ سے کہا۔

"آنکھیں کھولیے فیروز صاحب اور یہ کرشمہ دیکھئے۔"

میں نے فوراً آنکھیں کھولیں مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جکاری بالکل خاموش اور مؤدب کھڑے ہوئے تھے اور جیکسن کا قد آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ جلد ہی وہ ایک عام زہروی انسان کے برابر ہو گیا اور پھر جب اس نے ہماری طرف دیکھا تو حیرت اور خوف کی وجہ سے ہم دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ہماری کیا حالت ہوئی! ہیبت اور تعجّب کی وجہ سے ہماری زبانیں گُنگ ہو گئیں اور ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ہمارے سامنے ایک دوسرا شاکا کھڑا ہوا تھا!

"دھوکا۔۔۔ زبردست دھوکا مسٹر جان۔" شاگو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"شاکا شروع سے اب تک ہمارے ساتھ رہا ہے اور وہ کم بخت جیکسن

کے بھیس میں تھا۔"

"جیکسن کے بھیس میں؟"

"ہاں!"

"مگر پھر وہ تخت پر کون بیٹھا ہوا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ۔۔۔ وہ توشا کا کا عکس ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جیکسن اب نیچے اتر کر تخت کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

"اِس کا مطلب؟"

"وہ اِس عکس میں اِس طرح داخل ہو جائے گا جیسے پانی کی ایک لہر دوسری لہر میں مل کر پھر ایک لہر بن جاتی ہے۔"

واقعی، شاگو نے جیسا کہا تھا، وہی ہوا۔ جیکسن، جو آپ شا کا میں تبدیل ہو چکا تھا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا تخت کی طرف بڑھا اور پھر تخت پر بیٹھے ہوئے

اپنے عکس میں سما گیا۔ مُجھے اچانک اختر کی کہی ہوئی یہ بات یاد آ گئی کہ شاکا اپنے نائب کوراک کے کام سے مطمئن نہ ہونے کے بعد خود بھی ہماری زمین کی طرف گیا تھا اور اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ زمین پر واپسی پر یا وہاں جاتے ہوئے اس سبز سیّارے کی کشش میں پھنس گیا ہو گا اور یوں وہ کراما کا قیدی بن گیا تھا اور اب خود اُس کی قید میں آ پھنسا تھا۔ شاکا کے تخت پر بیٹھتے ہی لوگوں میں زبردست شور اُٹھا۔ عوام شاید بغاوت پر آمادہ تھے۔ کُچھ لوگ دوڑے ہوئے شاکا کی طرف بڑھے بھی تھے لیکن پھر بگل جیسے ہتھیاروں سے خوف کھا کر واپس بھاگ گئے۔ شاکا کے حامیوں نے بغاوت کو کُچل کر رکھ دیا تھا۔ چوں کہ جیکسن بن کہ شاکا ہمارے پاس موجود تھا۔ لہٰذا وہ ہمارے سب ارادوں سے باخبر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بغاوت کامیاب نہ ہو سکی۔

"کہئے مسٹر جان۔ کیسے حال چال ہیں؟" شاکا نے ہمارا مذاق اُڑاتے ہوئے

ہم سے پوچھا۔

”بدمعاش۔ یہ تو ہے۔“ جان کے غُصّے کے مارے مُونہہ سے کف جاری تھے۔ ”تُونے ہمارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا۔“

”یہ سب باتیں چھوڑیئے اور اپنی جان کی خیر منائیے۔“ شاکا نے ہنس کر جواب دیا۔ ”آپ نے دیکھ ہی لیا کہ میں ایک ہی وقت میں دو جگہ موجود ہو سکتا ہوں۔ میں چاہتا تو آپ لوگوں کو کسی بھی وقت ختم کر سکتا تھا لیکن انسان بن کر احسان فراموش نہیں بننا چاہتا تھا۔ مگر اب جب کہ میں اپنی اصلی حالت میں آ گیا ہوں، آپ میں سے کوئی بھی میرے عتاب سے نہیں بچ سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تُجھ سے رحم کی بھیک نہیں مانگیں گے۔“ جان نے اب اُسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر ہماری قسمتوں میں یہی لکھا ہے تو یہی سہی۔" سوامی اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

"اس کمینے شاگو سے تو میں ایسا بدلہ لوں گا کہ یہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔۔۔" شاکا نے کہنا شروع کیا۔۔۔ لیکن اُس وقت تک میں کسی سے کُچھ نہ کہوں گا جب تک میں جو چاہتا ہوں وہ پُورا نہ ہو جائے۔ مگر اِس کے ساتھ ہی ایک بات اور کہوں گا۔ میں کُچھ عرصے سے انسانوں کی شکل میں رہا ہوں اِس لیے یہ نہیں چاہتا کہ میرا انتقام فوراً شروع ہو جائے۔ انسانوں کی ایک صفت رحم بھی ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں تم پر تھوڑا سا رحم بھی کروں تا کہ تمھیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ شاکا ظالم تھا۔"

"تو اور ہم پر رحم کرے گا۔۔۔" جان نے نفرت سے ہونٹ سِکوڑ لیے۔

"یقیناً کروں گا اور وہ بھی صرف اِس لیے کہ اپنے انسان بننے کا بدلہ چکاؤں

اور اِس لیے بھی کہ میں ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تُم میرے لیے بھی ایک کام کرو۔"

"کون سا کام ہے۔۔۔؟" جان نے حیرت کے ساتھ پُوچھا۔

"تُم یہ راکٹ دیکھ رہے ہو۔ یہ راکٹ تمھارے ہی لیے بنوایا گیا ہے۔ اگر میرا کام خوش اسلوبی سے انجام پا گیا تو پھر میں تم سب کو آزاد کر دوں گا اور تُم اِس راکٹ کے ذریعے اپنی زمین پر واپس جا سکو گے۔"

"واقعی۔۔۔ تُم سچ کہہ رہے ہو۔۔۔ بولو کون سا کام ہے؟" جان کی آواز خُوشی کے باعث کپکپا رہی تھی۔

"یہ کام تُم میں سے صرف دو آدمی انجام دیں گے۔ اس مُقام سے بہت دُور ایک جزیرہ ہے جسے ہم لوگ جزیرۂ فاق کہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دو آدمی وہاں جائیں۔"

”جزیرۂ فاق!“ شاگو نے چلّا کر کہا۔ ”کیا کہتے ہو تُم شاکا۔ اِن کم زور سے انسانوں کو تُم جزیرۂ فاق بھیجنا چاہتے ہو!“

”او زہرہ کے ناکام ترین کُتّے! تُو خاموش کھڑا رہ!“ شاکا نے شاگو کو بُری طرح ڈانٹا۔

”مسٹر جان۔۔۔ یہ ظالم تُم لوگوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔۔۔“ شاگو نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”غور سے سُنو مسٹر جان۔۔۔ تُم اور تمہارے ساتھی سب غور سے سُنیں کیونکہ صرف اِسی بات پر تمہاری آزادی کا دار و مدار ہے۔“ شاکا نے کہنا شروع کیا۔ ”تمہارے دو آدمیوں کو جزیرۂ فاق تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا جائے گا اور وہاں جانے کے بعد سب سے ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ اُنہیں زندہ جھیل تک پہنچنا ہو گا۔ اِس جھیل کے قریب آفاقی چٹّانیں ہیں اور اِن چٹّانوں کے اندر دراصل وہ پتھرّ پائے جاتے ہیں جِن کی

بدولت تمہارے بچّوں نے میرے عزیز دوست اور ساتھی جیگا کو دُنیا میں ختم کر دیا تھا۔ یہ پتھر زہروی باشندے کے لیے خطرناک ہیں۔ جب جزیرے کی طرف سے ہوا اُدھر چلتی ہے تو ہمارے بہت سے شہری ہوا میں ملے ہوئے آفاقی ریزوں سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اِن آفاقی چٹّانوں کو ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا جائے۔"

"یہ کام تُم خود کیوں نہیں کر لیتے؟" میں نے پُوچھا۔

"ناممکن ہے مسٹر فیروز! آفاقی چٹّانوں میں کروڑوں کی تعداد میں آفاقی ہیرے موجود ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑے نقصان دہ ہیں۔ آفاقی ہیروں کی کرنیں ہمارے جسموں سے ٹکراتے ہی ہماری جان نکلنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زہرہ کا کوئی آدمی اُس جزیرے تک نہیں جاتا۔ اُسی جزیرے میں ایک پھل لگتا ہے جو آپ کی دُنیا کے سنگترے جیسا ہے مگر اُس سے کُچھ بڑا ہوتا ہے۔ اِس پھل کا رَس اگر چٹّانوں پر ڈال دیا جائے تو پھر وہ

چٹانیں ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گی۔ میں تُم میں سے جو دو آدمی چُنوں گا اُن کا کام صرف یہ ہو گا کہ وہ چٹانوں کو تباہ کر کے واپس آجائیں اور ثبوت کے طور ر مامبوا اپنے ساتھ لائیں۔"

"مامبو کیا؟"

"وہی سنگترے جیسا پھل۔۔۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر میں شاگو کے علاوہ تُم سب کو آزاد کر دوں گا۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ تمھیں شاگو کو بھی آزاد کرنا ہو گا۔" جان نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیرو۔۔۔ میں اپنے مُشیر کوراک سے مشورہ کر لوں۔۔۔۔"

شاکا کُچھ دیر تک والٹر سے گفتگو کرتا رہا۔ اور پھر آخر کار بولا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تمھارے ساتھ تمھارے دوست شاگو کو بھی آزاد کر دیا جائے گا۔"

"پھر ہم بھی تیّار ہیں۔" جان نے خوش ہو کر کہا۔ "اب بتاؤ کہ وہ دو آدمی کون ہیں جو وہاں جائیں گے۔"

"فیروز کا لڑکا اختر اور اُس کی بہن نجمہ۔۔۔۔" شاگو نے خُشک لہجے میں جواب دیا۔

یہ سُنتے ہی ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ امجد اور سوامی چلّا چلّا کر شاکا کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ شاگو کو شاید یہ یقین ہی نہ آ سکا تھا کہ شاکا ایسی بات کہہ سکتا ہے۔

"نہیں یہ ظُلم ہے۔۔۔ ایک لڑکا اور لڑکی بھلا یہ کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں؟" اُس نے چلّا کر کہا۔

"تُم ہم سے اِنتقام لے رہے ہو شاکا۔ خُدارا ایسا ظُلم مت کرو۔" میں نے بُلند آواز میں اُسے پکارا۔

"میں نے یہ دو نام سوچ سمجھ کر ہی لیے ہیں۔" شاکا نے کہنا شروع کیا۔

"طاقت سے وہاں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ عقل اُس جگہ کام آئے گی۔ تُم بعد میں مُجھے داد دو گے کہ میں نے یہ نام بالکل درست لیے تھے۔ جو کُچھ بھی اِن دونوں پر گزرے گی وہ تُم ہمارے وژن اسکرین پر دیکھ سکو گے۔ مُجھے افسوس ہے کہ میں اِس کے علاوہ اور کُچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ جو میں نے کہا ہے وہی ہوگا۔"

"مگر آقا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں کُچھ بھی نہ کر پائیں گے۔۔۔"
والٹر نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ غالباً اُسے اختر اور نجمہ پر رحم آ رہا تھا۔

"میں تُم سے بہتر سمجھتا ہوں کوراک۔۔۔ تُم اِن دونوں کی روانگی کا بندوبست کر کے مُجھے اِطّلاع دو اور اِن لوگوں کو اُس ہال میں لے جاؤ جہاں وژن اسکرین موجود ہے۔" شاکا اتنا کہہ کر وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ لوگوں کا شور پھر بڑھنے لگا اور پھر اِس شور کے درمیان میں کوراک نے زوکوں اور جکاریوں کو حُکم دیا کہ قیدیوں کو آزاد کر کے بڑے ہال میں پہنچا دیا جائے۔

اتنا کہہ کر وہ بھی شاکا کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد شاگو ہمیں ساتھ لے کر پلیٹ فارم سے نیچے اُترنے لگا۔ کیونکہ اب اِس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا!

وہ دراصل ایک بہت لمبا چوڑا اور بے حد اُونچا ہال تھا جس میں ہمیں لے جایا گیا تھا۔ زہرہ کے چند بڑے سائنس داں اور کُچھ خاص لوگ وہاں پہلے ہی سے جمع تھے۔ اُن کے مُقابلے میں ہماری کوئی حقیقت ہی نہیں تھی کیوں کہ اگر وہ چاہتے تو ہمیں صرف اپنی ایک اُنگلی سے مسل سکتے تھے۔ ایک بات میرے لیے بہت زیادہ حیران کر دینے والی تھی۔ نہ جانے کس لیے شاگو، خامن اور اُس کے ساتھیوں نے چھوٹے ہی قد میں رہنا پسند کیا تھا۔ خامن کے ساتھی تعداد میں کُل دس تھے اور وہ بھی ہمارے ہی جیسے نظر آ رہے تھے۔ اِس سے بھی زیادہ حیرت زدہ کر دینے والی بات یہ تھی کہ والٹر یا کوراک بھی ابھی تک اپنی چھوٹی سی جسامت میں تھا۔ اُس نے

بھی شاید اپنا قد عام زہروی باشندوں جیسا بڑا بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

زہرہ کے سائنس داں بہت اُونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال کی ایک دیوار پر شیشے کا ایک بہت ہی بڑا پردہ بنا ہوا تھا۔ ٹیلی وژن کے اسکرین کو اگر ہزار گُنا بڑا کر دیا جائے تو یقیناً وہ پردہ ویسا ہی بن جائے گا۔ کُرسیوں کا رُخ اُس اسکرین کی طرف تھا۔ ایک سائنس داں ایک خاص مشین کے کُل پرزوں کو چیک کر رہا تھا۔ مُجھے یُوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک بہت بڑے سینما ہال میں بیٹھا ہوا ہوں اور ابھی کوئی فلم دِکھائی جانے والی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اندر سے میرا دِل بُری طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اختر اور نجمہ کو کھو کر بڑی مُشکل سے پایا تھا اور اب یہ دونوں مُجھ سے پھر جُدا ہو جانے والے تھے۔ ہم نے آپس میں یہ مشورہ بھی کیا تھا کہ کسی طرح اختر اور نجمہ کا جانا رُک جائے۔ جیک اور سوامی وہاں جانے کے لیے اپنی خدمات پیش

کر رہے تھے۔ مگر شاکا کی مرضی یہی تھی کہ وہ دونوں ہی جزیرۂ فاق میں جائیں۔ پتہ نہیں ظالم کا اِرادہ کیا تھا۔ شاگو نے اپنے ایک خدشہ کا اظہار یہ بتاتے ہوئے کیا تھا کہ شاید شاکا کے اِرادے اچھّے نہیں ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اختر اور نجمہ کو جزیرۂ فاق میں بھیج کر ہماری بے بسی کا تماشہ دیکھے اور اِس طرح ہم سے اِنتقام لے۔

زرینہ کا بہت بُرا حال تھا۔ وہ بار بار اختر اور نجمہ کو اپنے گلے سے لگا کر رو رہی تھی۔ امجد بالکل خاموش تھا اور لگاتار نجمہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ رہے باقی لوگ تو جیسے اُن کو بھی سانپ سُونگھ گیا تھا۔ ہماری سمجھ میں کُچھ نہ آتا تھا کہ ہم کیا کریں۔ بس خاموش بیٹھے ہم ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ شاید ہم اِسی طرح بیٹھے رہتے اگر والٹر کی آواز ہمیں چونکا نہ دیتی۔

"آپ سب کے کپڑے پھٹ چُکے ہیں۔ براہِ کرم یہ لباس تبدیل کر لیجئے۔"

چند زوک اُس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں عجیب

سے اور بے ہنگم لباس تھے۔ موجودہ حالت میں ہمیں لباس کی ضرورت بھی تھی لہٰذا ہم نے بے تابی سے کپڑے لے لیے اور پھر والٹر نے ہمیں ایک چھوٹا سا کمرہ دکھایا جس میں جا کر ہم نے باری باری لباس تبدیل کر لیا۔ بڑا عجیب لباس تھا مگر اِس سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ چیتھڑے جو ہمارے جسموں پر جھُول رہے تھے، اب اُتر چکے تھے۔

"تُم سب کی قسمتوں کا فیصلہ اب اِن دونوں کے ہاتھ میں ہے۔" والٹر نے نجمہ اور اختر کی طرف اشارہ کر کے کہنا شروع کیا۔ "مُجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ شاکا نے اتنی رعائت برتی ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تمہارا یہیں خاتمہ کر دیا جاتا۔"

"ہم تمہارے قیدی ہیں۔ اگر آزاد ہوتے تب تمہیں بتاتے۔" جیک نے جلے بھُنے لہجے میں کہا۔

"بہر حال میں لمبی چوڑی گُفتگُو کرنے نہیں آیا۔ میں تو یہ بتانے آیا تھا ابھی

چند لمحوں کے اندر ایک خاص قسم کا جہاز نما گولا اِس ہال میں آ جائے گا۔ ہم اِسے پتار کہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کا ہوائی جہاز ہے۔ اِس گولے کے اندر بیٹھ کر نجمہ اور اختر اپنی نئی مُہم پر جائیں گے۔ جو کُچھ اِن پر بیتے گی وہ آپ لوگ اِس سامنے والے وژن سکرین پر دیکھ سکیں گے۔"

"مطلب یہ کہ میں اپنے بچّوں کی ایک ایک حرکت اس پردے پر دیکھ سکوں گی؟" زرینہ نے بے تابی سے پُوچھا۔

"ہاں۔۔۔ جب بھی ہم چاہیں گے۔ گولے کے اندر اور باہر کی ایک ایک چیز اِس پردے پر دیکھ سکیں گے۔ مگر مسٹر جان ذرا غور کیجیئے جب آپ کے بچّے جزیرۂ فاق میں کسی مُصیبت میں پھنسے ہوئے ہوں گے اور آپ اِس ہال میں بے بسی سے اپنے ہاتھ مل کر کہہ رہے ہوں گے کہ کاش کسی طرح آپ اُن کی مدد کر سکتے کیوں؟"

والٹر نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور پھر ہمیں وہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

جہاں مُجھے اختر اور نجمہ کے جُدا ہونے کی فکر بھی وہاں کم از کم اس خیال سے دِل کو ضرور ڈھارس بندھی کہ وژن سکرین پر یہیں بیٹھے بیٹھے میں اُن کی ایک ایک حرکت دیکھ سکوں گا۔ اِس کے ساتھ ہی ایک عجیب سا احساس مُجھے اور بھی تھا کہ میں اپنے بچّوں کی مدد نہیں کر سکتا، لیکن میرا خُدا تو میرے ساتھ تھا۔ کیا میرے دُکھے ہوئے دِل سے جو دُعا نکلے گی وہ اُس کی بارگاہ میں قبول نہ ہوگی۔ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ میرا دِل کہتا تھا کہ یقیناً ہوگی۔

کافی دیر تک میں اختر اور نجمہ کو ہدایات دیتا رہا اور انہیں بتاتا رہا کہ مُشکل کے وقت انہیں کیا کرنا چاہیے؟ مُجھے اِن دونوں کو نڈر اور بے پروا دیکھ کر بہت اچنبھا ہو رہا تھا۔ وہ نہ تو خوش تھے اور نہ رنجیدہ۔ البتّہ اُن کی صورتیں سہمی ہوئی ضرور لگتی تھیں۔ اختر نے اپنے پھٹے ہوئے لباس میں سے کوئی چیز نکال کر جلدی سے سب کی نظریں بچا کر اپنے اِس نئے لباس کے اندر رکھ لی تھی۔ صرف میں نے ہی دیکھا تھا کہ وہ کیا چیز تھی؟ آپ کوئی الحال

اس کے بارے میں کُچھ بتانا بے کار ہے، کیوں کہ وقت آنے پر آپ کو خود ہی عِلم ہو جائے گا۔ اختر اور نجمہ کو جو لباس دیا گیا تھا وہ ہمارے کپڑوں سے ذرا مختلف تھا کیوں کہ اُس لباس میں ایک پیٹی بھی تھی اور اِس پیٹی میں ایک دھار والا خنجر بھی لٹکا ہوا تھا۔ لیکن ایسی خطرناک مُہم میں صرف خنجر جیسے دو ہتھیار بھلا کسی کی کیا مدد کر سکتے تھے!

ہال میں رکھی ہوئی ایک اونچی سی کُرسی پر اب شاکا آ کر بیٹھ چُکا تھا۔ اُس نے سائنس دانوں کو حُکم دیا اور پھر اچانک ایک طرف کا فرش خود بخود نیچے دھنسنے لگا۔ ہم حیرت اور توجّہ سے اُس خلا کو دیکھ رہے تھے جو فرش کے اندر دھنسنے سے پیدا ہوا تھا۔ فوراً ہی ایک سرّاٹا سُنائی دیا اور پھر جب فرش دوبارہ اُوپر آیا تو اُس پر ایک عجیب شکل کا گولا رکھا ہوا تھا جس کی باہر والی سطح پر چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ گولا فرش پر چار ٹانگوں سے ٹِکا ہوا تھا۔ ہر ٹانگ کے نیچے توے جیسی ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ

دراصل وہی جہاز تھا جس کے متعلّق والٹر ہمیں پہلے سے بتا چکا تھا کہ وہ لوگ اُسے پتار کہتے ہیں۔

اب سائنس دانوں میں سے ایک آگے آیا اور اُس نے اپنی بھاری آواز میں نجمہ اور اختر کو جہاز کے اندر لگی ہوئی مشینری اور آلات کے بارے میں کُچھ باتیں بتائیں۔ اختر اور نجمہ گردنیں اُونچی کیے اُس دیوزاد سائنس داں کو دیکھ رہے تھے۔ جو باتیں اُن دونوں کو بتائی گئیں وہ دراصل پتار نامی جہاز کو اُڑانے اور زمین پر اُتارنے سے متعلّق تھیں۔ اچانک وژن اسکرین روشن ہو گیا اور اُس پر ہو بہو وہی منظر نظر آنے لگا جو اِس وقت ہال میں تھا۔ یعنی اختر اور نجمہ پتار کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور اُن سیڑھیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے جو جہاز کے ایک دروازے میں سے خود بخود کھُل کر نیچے آ پڑی تھیں۔

سچ جانیے کہ مجُھے اور جان کو یہ منظر دیکھ کر بہت اچنبھا ہوا۔ درحقیقت یہ

کسی ٹیلی وژن کیمرے کا کام تھا۔ ہال میں دِکھائے جانے والے منظر کا مطلب تو سمجھ میں آتا تھا کہ مُمکن ہے ٹیلی وژن کیمرہ ہال کی کسی دیوار میں لگا ہوا ہو اور یہیں پردے پر دِکھا رہا ہو۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جب اختر اور نجمہ جزیرۂ فاق کی طرف جائیں گے تو وہاں کا منظر ہمیں کس طرح اِس پردے پر دِکھائی دے گا۔ بہر حال کُچھ بھی ہو، زہرہ کے سائنس داں دُنیا کے سائنس دانوں سے بہت آگے تھے۔

شاکا نے اَب حُکم دے دیا تھا کہ اختر اور نجمہ پتارکے اندر چلے جائیں۔ وہ دونوں مُجھ سے لپٹ کر رونے لگے اور ساتھ ہی مُجھے تسلّی بھی دینے لگے۔ وہ منظر اتنا دردناک اور دِل ہلا دینے والا تھا کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سب زار و قطار رو رہے تھے۔ بڑی بے قراری سے اُن دونوں کو سینے سے لگا کر رو رہے تھے۔ ایک بار میں نے شاکا سے پھر التجا کی مگر اُس ظالم نے ایک نہ سُنی اور برابر قہقہے لگاتا رہا۔ جس وقت پتارا اپنی جگہ

سے بُلند ہو کر ہال کی چھت کی طرف بڑھا تو زرینہ نے اپنے سر کے بال نوچ لیے اور بُری طرح چیخنے لگی۔ والٹر بھی اب ہال میں آچُکا تھا۔ میں نے اُس سے رحم کی بھیک مانگی مگر اُس نے بھی مجُھے حقارت سے جھڑک دیا۔ اِن ظالموں کے دِل ذرا بھی نہ پسیجے۔

وہ اُسی طرح قہقہے لگاتے رہے اور پھر پتار چھت کی کسی پوشیدہ جگہ سے نکل کر زہرہ کے آسمان میں کیسی نامعلوم سِمت میں روانہ ہو گیا تھا۔ وژن اسکرین پر وہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ والٹر کے حُکم کے مطابق ایک سائنس داں نے مشین کا کوئی بٹن دبایا اور پھر وژن اسکرین پر پتار کے اندر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ اختر اور نجمہ جہاز کے اندر بنی ہوئی دو عجیب سی کُرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے آگے ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس پر مختلف قسم کے بٹن لگے ہوتے تھے۔ اختر ایک بٹن پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور کھڑکی میں سے نظر آنے والے منظر کو دیکھ رہا تھا۔
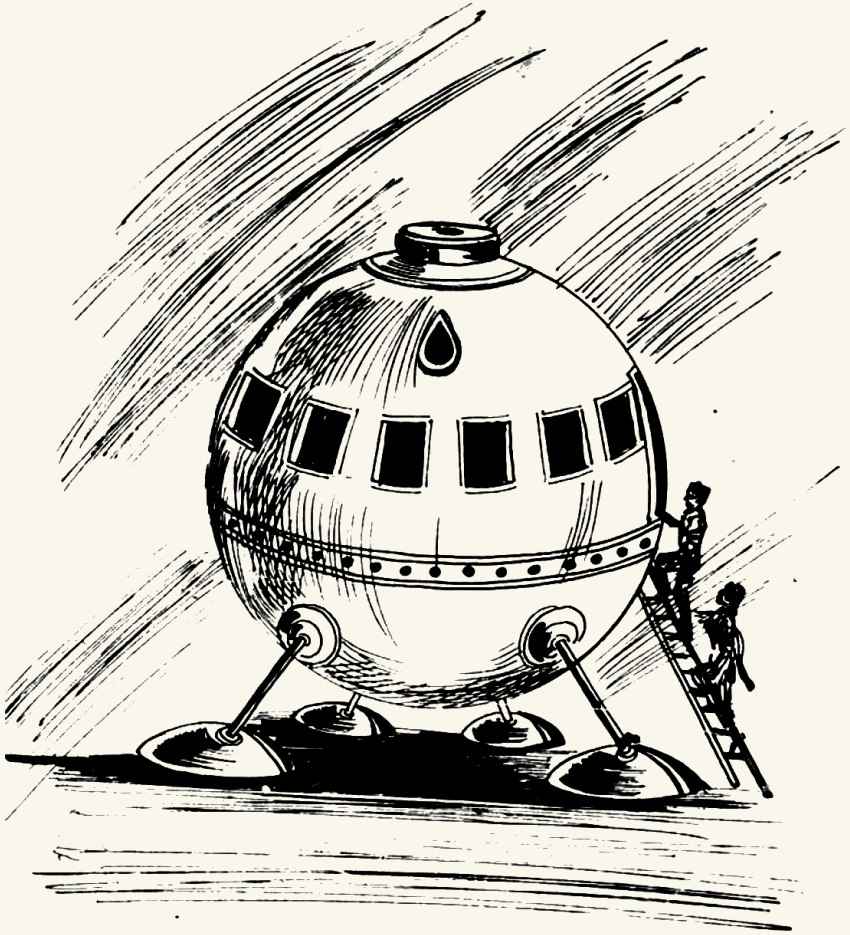
”وہ دونوں جو بھی بات کریں گے ہمیں یہاں ضرور سُنائی دے گی۔“ والٹر نے کہنا شروع کیا۔ ”اگر وہ سرگوشی بھی کریں گے تب بھی وہ ہمیں

صاف سُنائی دے گی۔ البتّہ ہماری آوازیں اُن تک نہیں پہنچ سکیں گی۔"

"انہیں کوئی خطرہ تو پیش نہیں آئے گا والٹر؟" میں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"یہ سب پہلے سے کس طرح بتا سکتا ہوں۔۔۔۔ آپ دیکھ ہی لیں گے۔" والٹر نے خُشک لہجے میں جواب دیا۔

میں خاموش ہوگیا اور پھر وژن اسکرین پر نظر آنے والے منظر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اختر نجمہ سے کہہ رہا تھا۔

"نجمہ بہن! ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم کامیاب ہوں گے۔"

"مگر بھیّا مُجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ بڑی مُشکل کے بعد تو تُم ملے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مُجھ سے پھر بچھڑ جاؤ۔"

”بچھڑیں گے کیسے۔۔۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے۔“

”پھر بھی مُجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ نجمہ سہمے ہوئے لہجہ میں بولی۔ ”میرے پاس بہت سے ایسے طریقے ہیں کہ میں آنے والے حادثات کو روک سکتا ہوں۔“

”کیا طریقے ہیں؟“

”ایک تو سوبیا سے بھرا ہوا وہ خاص ہتھیار ہے. جس کی بدولت میں نے نیلی دُنیا میں والٹر کو مغلوب کیا تھا۔ دوسرا ایک چھوٹا سا پستول ہے جسے میں نے ہر شخص کی نظروں سے آج تک چھپائے رکھا تھا اور زہرہ کی سرزمین پر آتے ہی ایک پوشیدہ مقام پر اُسے دبا دیا تھا اور تیسری چیز ایسی ہے. جس کے بارے میں ابھی کُچھ نہیں بتا سکتا۔ وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا۔“

"اگر واقعی تمہارے پاس یہ چیزیں ہیں تو پھر بھیا مُجھے کوئی فکر نہیں!" نجمہ نے خوش ہو کر کہا۔

ہال میں ایک زبردست قہقہہ سُنائی دیا اور پھر شاکا نے مُجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "دیکھا فیروز صاحب۔ اب تو تُم کو معلوم ہو گیا کہ میں نے اختر اور نجمہ کو کیوں اِس مُہم پر بھیجا ہے۔ تمہارا یہ لڑکا مُجھے بیوقوف بناتا رہا اور میں بیوقوف بن بھی گیا۔ مُجھ جیسے زہروی آدمی کو بیوقوف بنانے والا معمولی انسان نہیں ہو سکتا۔ تمہارا لڑکا بہت ہی عقل منداور بہادر ہے اور مُجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب لوٹے گا۔"

میرا دُشمن میرے لڑکے کی تعریف کر رہا تھا۔ اس سے بڑی خُوشی میرے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر سے وژن اسکرین کو دیکھنے لگا۔

اسکرین پر ابھی تک پتار کے اندر ہی کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ والٹر نے

مُجھے بتایا تھا کہ جزیرے تک کا سفر مُشکل سے ایک گھنٹے کا ضرور ہو گا اور پتار کو گئے ہوئے ابھی صرف چند ہی منٹ ہوتے تھے۔ میرے دِل میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ میں خُدا سے دُعا کر رہا تھا کہ میرے دونوں بچّے صحیح سلامت اس جزیرے میں پہنچ کر واپس آ جائیں۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح پچاس منٹ گُزر ہی گئے اور میں نے دیکھا کہ پتار کی کھڑکی میں سے ایک جزیرہ نظر آنے لگا ہے جس کی مخروطی پہاڑیاں بادلوں میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اختر پتر کی مشین کے ایک سوئچ کو دبا رہا تھا اور اب وہ نہایت تیزی کے ساتھ جزیرے میں اُتر رہا تھا۔ اچانک وژن اسکرین کا منظر بدل گیا۔ سائنس دانوں نے ہال میں رکھی ہوئی مشینوں کے بٹن دبائے تھے۔ اور اب اسکرین پر جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ مُجھے حیرت زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا میں جزیرے کی زمین پر کھڑا ہوا آسمان میں دیکھ رہا ہوں جس میں ایک سفید دھبّہ

آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہوا جزیرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ سفید دھبّہ در اصل پتار تھا جو جزیرے کی طرف آ رہا تھا۔

کچھ ہی لمحوں بعد پتار جزیرے کی زمین پر آ کر اُتر گیا اور پھر اختر اور نجمہ کھُلے ہوئے دروازے میں سے سیڑھی کے ذریعے نیچے اُترتے ہوئے دِکھائی دیے۔ اُن کے چہروں سے تھکن یا پریشانی بالکل ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا وہ کہیں تفریح کرنے آتے ہیں۔ وژن اسکرین اس وقت ہمیں جزیرے کا ایک بہت بڑا حصّہ دِکھا رہا تھا۔ بڑے بے ہنگم سے درخت اور بالکل سیدھی، اہرامِ مصر جیسی نوکیلی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ چٹّانیں، درخت اور پودے بھی بڑے عجیب تھے۔ بل کھاتے ہوتے بغیر پتّوں کے پودے کافی بُلندی تک اُگے ہوئے تھے۔ جزیرے سے بہت دُور سمندر لہریں مار رہا تھا۔ جب سے میں سیّارہ زہرہ میں آیا تھا سمندر پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس سمندر کا رنگ گہرا اُودا تھا اور اُس کی لہریں بھی بہت اُونچی

اُٹھ رہی تھیں۔

پتار کو اُسی مقام پر چھوڑ کر اختر اور نجمہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ حالانکہ وہ سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے، مگر اُن کی آوازیں ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بالکل صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ جیک اور سوامی کے ہاتھوں کی مُٹھّیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اور جان لگا تار اسکرین کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کے دانت بھنچے ہوئے تھے اور گالوں کی ہڈیاں اُبھر گئی تھیں۔ زرینہ امجد کا ہاتھ تھامے ہوئی تھی۔ اور امجد بار بار اُسے تسلّی دے رہا تھا۔ رہا میں تو یقین مانئے مُجھے وہ سب خواب سا لگ رہا تھا۔ میرے دِل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے نمایاں ہو گئے تھے۔

اختر اب نجمہ کو ایک سِمت میں لے جاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"نجمہ بہن ہمیں اپنا کام فوراً شروع کر دینا چاہیئے۔"

"مگر کام شروع کہاں سے کریں؟"

"سب سے پہلے تو ہمیں کوئی جھیل تلاش کرنی چاہیے جس کے بارے میں اُس پاگل شاکا نے کہا تھا کہ زندہ جھیل ہے۔" ہال میں ایک قہقہہ گونجا جو یقیناً شاکا کا تھا۔

"زندہ جھیل سے اُس کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ میں بھی نہیں بتا سکتا۔ دیکھتی رہو، کُچھ عرصے کے بعد معلوم ہو ہی جائے گا۔"

وہ دونوں دبے دبے پاؤں رکھتے ہوتے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ یُوں لگتا تھا گویا وژن کیمرہ بالکل اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کیوں کہ اسکرین پر ہمیں ایسا ہی لگ رہا تھا گویا کوئی اُن کو کیمرے میں فوکس کیے ہوئے اُن کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا ہے۔ مُجھے اعتراف ہے کہ در حقیقت وہ

سائنس کی حیرت انگیز دریافت تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو پھلانگتے اور راستے کے جھاڑ جھنکاڑ ہٹاتے ہوئے وہ دونوں آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کافی دیر تک ہم سانس روکے اسکرین پر نظر آنے والا یہ منظر دیکھتے رہے۔ مختصر میں اتنا کہوں گا کہ تقریباً دو گھنٹے تک میں اختر اور نجمہ کو اس جزیرے میں آگے بڑھتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس رکھنے میں دونوں کئی بار لڑکھڑااتے۔ کئی مرتبہ گرے اور پھر اٹھے اور کتنی بار ستانے کے لیے بیٹھے گئے مجھے ان پر بڑا ترس آتا رہا۔ مگر بے بسی کے عالم میں صرف ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ جیک اور سوامی نے کئی بار مجھ سے کہا کہ یہ موقع بہترین ہے۔ شاکا منظر کو دیکھنے میں محو ہے اور اس کا نائب والٹریا کوراک بھی وہاں موجود نہیں ہے لہٰذا کیوں نہ شاکا کا خاتمہ کر دیا جائے؟ ہم سب ایک ساتھ اس پر پل پڑیں اور اسے ٹھکانے لگا دیں۔ سب کی تقریباً یہی رائے تھی۔ البتہ میں اور جان اس کے مخالف تھے۔ ہمیں تو اب آزاد ہونا

تھا اور اپنی زمین پر واپس جانا تھا۔ لہٰذا شاکا کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ ایک بات پر مجھے حیرت ضرور تھی۔ والٹر، جو ہمارا سب سے بڑا دشمن تھا اس موقع پر موجود نہ تھا۔ آخر کیوں؟ مگر پھر میں نے یہ سوچ کر خُدا کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو چین سے بیٹھتا اور مجھے جلانے کے لیے کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا۔

اختر اور نجمہ اب ایسے مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں دور دور تک گھاس ہی گھاس نظر آتی تھی۔ یہ گھاس تقریباً دس انچ لمبی تھی اور اختر اس وقت جہاں کھڑا تھا اس مقام سے گھاس کافی دور تھی۔ اختر کے بالکل پاس ہی ذرا نیچے ایک نہر بہہ رہی تھی جس کا صاف شفاف اور زرد پانی ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے ایک لکڑی سی پانی کی گہرائی کا اندازہ کرنے کے لیے نہر میں ڈالی۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس نے نجمہ کا ہاتھ پکڑا کر جیسے ہی نہر میں پاؤں ڈالنے کا ارادہ کیا۔ ایک عجیب سا شور ان دونوں کو اور ساتھ ہی

ہمیں سنائی دیا۔ یہ آوازیں گھوڑے کے ٹاپوں سے ملتی جُلتی تھیں۔ شاید وہ دونوں اس حیرت انگیز جانور کو نہیں دیکھ سکے تھے جو آہستہ آہستہ اُن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن اُسے دیکھ کر میرا دِل کانپ اٹھا اور زرینہ نے گھبرا کر امجد کا سہارا لے لیا۔

وہ جانور نیچے سے تو گھوڑے جیسا تھا اور اوپر سے آدمی جیسا۔ اگر گھوڑے کی گردن کاٹ کر کوئی اُس میں انسان کو کمر تک جوڑ دے تو اس خوفناک جانور کی شکل تصوّر میں لائی جا سکتی ہے۔ اِس جانور کے چار پیر اور دو ہاتھ تھے اور وہ ہلکے ہلکے پاؤں رکھتا ہوا اختر اور نجمہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کا ارادہ شاید خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا میں سب کُچھ بھول کر بُری طرح چلّا اُٹھا۔

"اختر۔۔۔ اختر دیکھو تمہارے پیچھے کون آ رہا ہے؟"

شاکا کا ایک زبردست قہقہہ پھر ہال میں گونجا۔ اُس نے ہم سب کی بے بسی

اور مجبوری پر قہقہہ لگایا تھا۔ غُصّے کے مارے میرا خون کھولنے لگا۔ جس طرح بِلّی چوہے سے کھیلا کرتی ہے۔ یہ کم بخت شا کا بھی ہم سے وہی برتاؤ کر رہا تھا۔ مُجھے غصّہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ ہماری آوازیں اختر اور نجمہ تک نہیں پُہنچ سکتیں۔ البتّہ اُن کی آوازیں ہم تک آ سکتی ہیں۔

انسانی شکل والا وہ گھوڑا اب ان دونوں کے بہت قریب پہنچ چکا تھا کہ اچانک اختر نے اُسے دیکھ لیا اور پھر اس سے پہلے کہ اختر کُچھ کر سکتا۔ گھوڑے کا انسانی دھڑا تھوڑا سا نیچے جھُکا۔ اُس نے اپنے ہاتھ بڑھاتے اور نجمہ کو دبوچ کر فوراً پیچھے پلٹا۔ نجمہ چیخیں مار رہی تھی، اور خود کو آزاد کرانے کوشش کر رہی تھی۔ مگر اِس جانور میں طاقت بہت تھی۔ اُس نے نجمہ کو اور مضبُوطی سے پکڑ لیا۔ ابھی وہ واپسی کے لیے مُڑ ہی رہا تھا کہ یکایک اختر نے اپنے لباس میں سے وہ خاص ہتھیار نکال لیا جس کے گول چکّر میں

سو بیا بھری ہوئی تھی۔ اُس ہتھیار کا رُخ اُس جانور کی طرف کر کے جیسے ہی اختر نے بٹن دبایا، ایک گہرے سُرخ رنگ کی شعاع اُس میں سے نکلی اور گھوڑے کے اوپر پڑی۔ مگر اِس سے صرف اتنا ہی ہوا کہ وہ جانور کُچھ دیر کے لیے نڈھال ہو گیا اور اُسی مقام پر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ البتّہ نجمہ ابھی تک اُس کے بازوؤں میں مچل رہی تھی۔ اختر کو دیکھ کر اُس جانور نے خُدا جانے کون سی زبان میں کیا کُچھ کہا۔ اُس کی آواز گھوڑے کی ہنہناہٹ اور آدمی کی آواز میں ملی جُلی تھی۔ لیکن اختر نے ذرا بھی گھبراہٹ سے کام نہ لیا۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ پھر زور سے آگے کی طرف بھاگا؟ اُس نے ایک جِست لگائی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ گھوڑے کی کمر پر سوار ہو گیا۔

"واہ۔۔۔ کتنا مزیدار مُقابلہ ہے۔" شاکا نے خُوشی کے باعث تالی بجائی مگر ہم خاموش رہے۔ کیونکہ دراصل ہم سب سانس روکے ہوئے حیرت

سے وہ منظر دیکھ رہے تھے۔

اختر نے گھوڑے کی کمر پر بیٹھتے ہی زور زور سے اُس کے انسانی سر پر مُکّے مارنے شروع کر دیے۔ چونکہ آدمی نے اپنے ہاتھوں میں نجمہ کو پکڑا رکھا تھا لہٰذا وہ اِن سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ اسی پر بس نہ کر کے اختر نے جلدی سے وہ ہتھیار تو لباس کے اندر رکھ لیا اور پھر پستول نکال کر اُس کا دستہ بُری طرح آدمی کے سر پر مارنا شروع کر دیا۔ اُس کی اِس حرکت کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور آدمی کی گرفت کمزور ہونے لگی۔ اُس نے نجمہ کو زمین پر پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اختر ابھی تک اُس کی کمر پر سوار تھا۔ اچانک وہ جانور بُری طرح اُچھلنے لگا۔ دراصل وہ اختر کو نیچے گِرانا چاہتا تھا۔ نجمہ نے جب محسوس کیا کہ اختر کی زندگی خطرے میں ہے تو اُس نے جلدی سے زمین پر گِری ہوئی ایک لکڑی اُٹھا لی اور پھر پوری قوّت سے اُس نے اِس جانور نما آدمی کو پیٹنا شروع کر دیا۔ چونکہ وہ جانور بہت ہی

طاقت ور تھا لہٰذا ایک بار اُس نے اختر کو زمین پر پھینک دیا۔ تھوڑا پیچھے ہٹ کر وہ چاہتا ہی تھا کہ وہ دوڑتا ہوا جائے اور اختر کو کُچل کر رکھ دے کہ اچانک اختر نے لیٹے ہی لیٹے پستول سے ایک فائر کر دیا۔ توقّع کے خلاف گولی اُس جانور کے انسانی جسم والے حصّے پر عین دِل پر لگی۔ وہ فوراً لڑکھڑانے لگا اور اِدھر ہم سب نے شور مچا کر ہال سر پر اُٹھا لیا۔ زرینہ بہت خوش تھی اور بڑی توجّہ کے ساتھ اپنے بہادر بیٹے کے کارنامے دیکھ رہی تھی۔ البتّہ شاکا کی صورت دیکھنے کے لائق تھی۔ یُوں لگتا تھا گویا اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اُس کا مچھلی جیسا مُونہہ اِس انداز میں کھُلا ہوا تھا۔ گویا وہ غُصّے کے عالم میں دانت پیس رہا ہے۔

انسانی جسم والا وہ گھوڑا اب زمین پر گر چکا تھا اور ہاتھ پاؤں پٹخ رہا تھا۔ اختر اور نجمہ اُسے دم توڑتے دیکھ کر پھر تیزی سے نہر کی سمت بھاگے۔ بڑی بے تابی کے ساتھ وہ نہر میں کود ے اور اُسے پار کرنے کے بعد اُس کنارے پر

آ گئے جہاں سے دس انچ اونچی گھاس کا میدان شروع ہو جاتا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ میدان میں قدم رکھیں یا نہ رکھیں کہ اچانک بائیں طرف سے انہیں بہت سے ٹاپوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ خوش قسمتی سے جہاں وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے وہاں ایک عجیب اور بے ہنگم سا درخت تھا۔ میں نے اُسے بے ہنگم اِس لیے کہا کہ اُس درخت کی شاخیں ہاتھی کی سونڈ جیسی موٹی تھیں اور برگد کے درخت کی طرح زمین پر لگ رہی تھیں دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا گویا وہ ایک بہت بڑا پنجرا ہو۔ ڈرتے ڈرتے نجمہ اور اختر جلدی سے اُس درخت کے اوپر چڑھ گئے۔ جب وہ درخت پر کافی اونچائی تک پہنچ گئے تب بھی کوئی خطرہ پیش نہیں آیا۔ میرے اپنے خیال میں شاید نجمہ کو وہ وقت یاد آ گیا تھا جب کہ وہ اب اسے بہت پہلے پاتال میں گئی تھی اور وہاں اُس نے امجد کو ایک درخت کی شاخوں میں پھنستے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ درخت آدم خور تھا۔ اور اِس وقت

بھی نجمہ کو یہی فکر تھی کہ کہیں یہ درخت بھی آدم خور نہ ہو۔

اتنی دیر میں ٹاپوں کی آوازیں اور بھی قریب آ گئیں۔ اب ہم نے اسکرین پر دیکھا کہ وہ پندرہ آدمی نما گھوڑے تھے جو سرپٹ دوڑتے ہوئے درخت کے قریب آ رہے تھے۔ انھوں نے اختر اور نجمہ کو درخت پر چھُپے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مگر اب وہ اُن کا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ غُصّے کے عالم میں وہ اپنے دو اگلے پیر زمین پر مار کر اُسے کھُرچ رہے تھے اور آدمی کے دھڑ والا حصّہ بار بار ایک ہاتھ کا مُکّا بنا کر اوپر اٹھاتا تھا۔ یہ منظر بہت ہی بھیانک تھا۔ اگر آپ تصوّر کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ سب کُچھ کتنا حیرت انگیز معلوم ہوگا۔

میں یہ سوچ کر فکر مند تھا کہ آخر وہ دونوں کِس طرح اِن بلاؤں سے نجات حاصل کریں گے؟ اختر کے پاس جو پستول تھا اُس میں اتنے کارتوس یقیناً نہیں تھے کہ وہ اِن سب کو ختم کر سکتا۔ شاید وہ اِن جانوروں کی ہنہناہٹ

سے ڈر بھی رہا تھا۔ پھر اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ گھاس آپ ہی آپ بڑھنے لگی۔ خوف اور دہشت کے باعث میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ گھاس نہ صرف اونچائی میں بڑھ رہی تھی بلکہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ آگے بھی بڑھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا وہ گھاس نہیں بلکہ سبز رنگ کا گاڑھا پانی ہو۔ سب سے زیادہ تعجّب کی بات یہ تھی کہ انسان نما گھوڑے گھاس کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اچانک خوف زدہ ہو گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گھوڑے تو گھاس کو پسند کرتے ہیں مگر یہاں اُلٹا ہی معاملہ تھا۔ شاکا اور اُس کے سائنس داں بھی بڑی دلچسپی سے اِس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی گھاس نے گھوڑوں کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اِس جگہ سے بھاگ سکتے۔ نہ جانے اُس گھاس میں کیا صفت تھی، گھوڑے اُس سے اِس طرح بچ رہے تھے گویا وہ گھاس نہیں اُن کی موت ہو!

گھاس اب اِن جانوروں کے پیروں تک پہنچ گئی تھی اور برابر اُوپر کی طرف اُٹھ رہی تھی۔ اچانک چند گھوڑے گھاس پر تڑپ کر گرے اور بُری طرح مچلنے لگے۔ اور پھر ایک کے بعد دوسرا، غرض اِسی طرح وہ پندرہ کے پندرہ گھاس پر گر پڑے۔

ان کے گرتے ہی گھاس اُن پر چھا گئی۔ وژن اسکرین پر اب صرف گھاس ہی گھاس نظر آ رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد گھاس خود بخود پیچھے ہٹنے لگی اور چھوٹی بھی ہونے لگی اور پھر جب میں نے غور سے دیکھا تو میری چیخ کے ساتھ ہی ہال میں زرینہ کی خوفناک چیخ بھی گونج اُٹھی۔

اب اِس مقام پر صرف آدمی اور گھوڑے کے ملے جُلے پنجر پڑے ہوئے تھے، اِن کے جسموں سے گوشت بالکل غائب ہو چکا تھا۔ میں خوف کے مارے بُری طرح لرزنے لگا۔ زرینہ نے میرا نشانہ ہلا کر ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"فیروز! میرے بچّوں کا کیا ہو گا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔ اُن کا مددگار تو اب صرف خُدا ہے۔" میرا سانس سینے میں رُکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں فیروز! میرے خیال میں اگر اختر کسی طرح درخت میں آگ لگا دے تو گھاس اِس مقام سے دور ہٹ سکتی ہے۔" جان نے اسکرین کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"کاش۔۔۔ کاش اِس وقت میں اختر کے ساتھ ہوتا۔" جیک نے بے بسی سے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میں نے نظریں اُوپر اُٹھا کر شاکا کو دیکھا۔ وہ کم بخت اب بھی مُسکرا رہا تھا۔ یقیناً وہ اختر اور نجمہ کو اِس طرح پھنسے ہوئے دیکھ کر دِل ہی دِل میں ہنس رہا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دونوں کیا کریں گے کہ یکایک مُجھے گھاس

درخت کے اوپر چڑھتی ہوتی نظر آئی۔ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ اُس وقت میں کتنا پریشان ہوا ہوں۔ میں کیا ہم سب ہی پریشان اور خوف زدہ تھے۔ زرینہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور امجد کے ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے میرے خدا! یہ کتنا بڑا امتحان تھا! میرے بچّے موت کے مُونہہ میں تھے اور میں اُن کے لیے کُچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"بھیّا بھیّا! اب ہم کیا کریں؟" اچانک نجمہ کی سہمی ہوئی آواز سُنائی دی۔ "میری سمجھ میں بھی کُچھ نہیں آ رہا کہ کیا کرنا چاہیئے۔" اختر درخت کی اور اُونچی شاخوں پر چڑھتے ہوئے بولا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے پستول سے گھاس کی طرف ایک فائر بھی کیا مگر کُچھ نہ ہوا۔ پھر اُس نے پستول لباس کے اندر رکھ کر سوبیا دھات والا خاص ہتھیار نکالا اور اُس کی شعاع گھاس کی طرف پھینکی۔ اُس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ گھاس نے اوپر چڑھنا بند کر دیا۔ البتّہ وہ درخت کو چھوڑ کر پیچھے نہیں ہٹی۔

"آپا میں نے تو سب طریقے آزما کر دیکھ لیے۔" اختر نے کہنا شروع کیا۔
"ایسا لگتا ہے کہ اب ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔"

"ایسا مت کہو بھیّا۔ خُدا ہمیں ضرور اِس بلا سے نجات دِلائے گا۔" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

نجمہ نے اُسے تسلّی دینے کی کوشش تو کی مگر خود بھی ڈرتی رہی۔ اختر کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور زندہ گھاس کو دیکھتا رہا۔ گھاس سمندر کی لہروں کی طرح ہل رہی تھی۔ یکایک اختر کو جیسے کوئی بات یاد آئی۔ اُس نے اپنے لباس کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر ہم نے دیکھا کہ جب اُس کا وہ ہاتھ باہر آیا تو اُس میں آفاقی ہار لٹکا ہوا تھا۔ آفاقی ہار یعنی اُن کی آخری اُمّید اور آخری سہارا۔

"یہ لو آپا۔ یہ ہار پہن لو۔" اختر نے کہا۔ "میں نے اُسے اُسی وقت چھُپا لیا تھا جب کہ ہم سبز سیّارے سے روانہ ہوتے تھے اور بعد میں جب کوراک

ہمارے لیے نئے لباس بنوا کر لایا تھا۔ تب ہی میں نے ہار اُس میں چھُپا لیا تھا۔“

”مگر اِس کا فائدہ کیا ہو گا؟“ نجمہ نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

”یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ لیکن میرا دِل کہہ رہا ہے کہ کُچھ نہ کُچھ ہو گا ضرور۔“

دراصل یہی وہ ہار تھا جسے میں نے کچھ عرصہ پہلے اختر کو اپنے لباس میں چھپاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا دِل بھی گواہی دے رہا تھا کہ آفاقی ہار یقیناً اپنا کام کرے گا۔ نجمہ نے بے دِلی کے ساتھ ہار اپنے ہاتھ میں لیا۔ چند لمحوں تک اُسے غور سے دیکھا اور پھر فوراً اپنے گلے میں پہن لیا۔ یکایک ایک سرّاٹے کی آواز بُلند ہوئی اور پھر میں نے دیکھا کہ گھاس بڑی تیزی کے ساتھ درخت سے نیچے اُتر رہی ہے۔ نیچے اُترنے کے بعد وہ پیچھے بھی ہٹنے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر اختر نے خُوشی سے تالی بجائی۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ کُچھ نہ کُچھ ہو گا ضرور، آفاقی ہار اِس گھاس کے لیے بھی قاتل ثابت ہوا ہے۔"

"واقعی بھیّا میں نے تو یہ بات کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔"

"آوٌاب نیچے اُترو۔" اختر نے جوشیلی آواز میں کہا۔ "مُجھے یقین ہے کہ ابّا جی ہماری یہ سب حرکتیں دیکھ رہے ہوں گے اور میری عقل کی داد دے رہے ہوں گے اور وہ بدمعاش شاکا وہ تو جل بھُن کر کباب ہو گیا ہو گا۔" خُوشی کے باعث میں اچانک رو پڑا اور رندھی ہوئی آواز میں خود بخود بولا۔

"ہاں بیٹے۔۔۔ میں سب دیکھ رہا ہوں، ایک ایک بات دیکھ رہا ہوں۔ خُدا تمھیں کامیاب واپس لائے۔"

اچانک شاکا طیش کھا کر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور اب اُس کا سر ہال کی چھت کو چھُو رہا تھا۔ ہم بونوں کی طرح گردنیں اُٹھائے ہوئے اُسے دانتوں

سے اپنی بوٹیاں چباتے ہوتے دیکھ رہے تھے۔ وہ بولا کُچھ نہیں۔ چند منٹوں تک اسکرین کو گھور کر دیکھتا رہا اور پھر جلدی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا یہ لڑکا بہت چالاک ہے فیروز۔۔۔۔ مُجھے اس سے خطرہ پیدا ہونے لگا ہے۔"

"خُدا کرے میرا لڑکا ہی تیری موت ثابت ہو کمینے۔۔۔" زرینہ نے باقاعدہ اسے کوسنا شروع کر دیا۔ "تاکہ جیسے ہی تُو مرے، تیری قوم کو تیرے ظُلم سے نجات ملے۔ دیکھ لینا ایسا ضرور ہو گا اور میری بد دُعا ضرور اثر کرے گی۔"

"اور پھر یہ کمینہ شاگو یہاں کا ڈکٹیٹر بنے گا۔۔ کیوں؟" شاکا نے بھیانک قہقہہ لگایا۔ "مگر میں ایسا ہر گز نہ ہونے دوں گا بیوقوف عورت۔۔۔ تُو کیا جانے کہ شاکا کے دِل میں کیا ہے؟"

"اچھّا تُم خاموش رہو شاکا اور دیکھنے دو کہ اختر کیا کر رہا ہے؟" شاگو نے پہلی بار شاکا سے مُخاطب ہو کر کہا۔

اِس عرصے میں اختر اور نجمہ درخت سے نیچے اُتر چُکے تھے اور ڈرتے ڈرتے گھاس کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ زندہ گھاس برابر پیچھے ہٹ رہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے کسی دریا کے اوپر سے کائی پھٹنے لگی ہو۔ نجمہ اب اختر سے آگے تھی اور اُس کا ہاتھ پکڑے ہوتے ہلکے ہلکے قدم بڑھاتی ہوئی زندہ گھاس کا سینہ چیرتی ہوئی آگے ہی آگے جا رہی تھی۔ جس گھاس کو ہم کُچھ ہی دیر پہلے اپنی آنکھوں سے چند انسان نما گھوڑوں کو ایک پل میں ختم کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ وہی گھاس اب نجمہ سے ڈر کر لگاتار پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی یہ!

وژن اسکرین میں گھاس کا سمندر اب ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گھاس کے اِس وسیع میدان کے بعد کُچھ مخروطی چٹّانیں نظر آ رہی تھیں اور اِن چٹّانوں کے

پیچھے ایک جھیل دِکھائی دے رہی تھی۔ نجمہ اور اختر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے ہی والے تھے اور آخر کار زندہ گھاس کے جُنگل سے نکل کر وہ وہاں پہنچ ہی گئے۔ مخروطی چٹّانیں اب اُن سے بہت ہی قریب نظر آرہی تھیں اور نجمہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی کیونکہ یہی وہ چٹّانیں تھیں جِن کے سینے میں آفاقی ہیرے پوشیدہ تھے۔

ان چٹّانوں کے پاس جھیل کا پانی ہلکورے لے رہا تھا۔۔۔ اختر اور نجمہ چٹّانوں کے پاس کھڑے ہوئے جھیل کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر شاکا نے اُسے زندہ جھیل کیوں کہا تھا اور پھر اچانک انہیں اِس کی وجہ سمجھ میں آگئی کیونکہ جھیل کا پانی اب اُن دونوں کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ تو اِس سے بے خبر تھے لیکن میں نے دیکھا کہ جھیل کا وہ پانی جو چٹّانوں کے قریب تھا فوّارے کی طرح آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھ رہا ہے۔ اُونچا اور اُونچا۔ اور پھر یہ فوّارہ بجلی کی سی تیزی سے اختر کی طرف

لپکا۔ خُدا جانے جھیل کا وہ پانی کیا غضب ڈھاتا اگر اختر جلدی سے نجمہ کو گھسیٹ کر چٹّان کی اوٹ میں نہ لے جاتا۔ پانی چٹّان پر کوڑے کی طرح پڑا اور اُس کا ایک بڑا ٹکڑا توڑ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ اختر اور نجمہ گھبرا کر پیچھے کی طرف ہٹے اور اُن کے ہٹتے ہی پانی کا کوڑا پھر جھیل میں سے اُبھرا۔ مگر خُوش قسمتی سے وہ دونوں اب زندہ جھیل سے کافی فاصلے پر گھاس کے قطعے کے اندر چلے گئے تھے اور چوں کہ گھاس نجمہ کے آفاقی ہار کی بدولت بیچ میں سے پھٹ کر راستہ دے رہی تھی لہٰذا انہیں کِسی قسم کا نُقصان نہیں پہنچ سکا تھا۔

اختر کی سمجھ میں شاید اب کُچھ نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ شاکا کے حُکم کے مطابق اب اسے وہ درخت تلاش کرنا تھا جس کے پھل کو مامبو کہتے ہیں اور جس کے بارے میں انہیں بتایا گیا تھا کہ اُس کا رس چٹّانوں پر ڈالنے سے وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ اختر نے اپنا ہاتھ کا چھجّہ بنا کر

پیشانی پر رکھ لیا اور دُور دُور تک کسی پھل دار درخت کو تلاش کرنے لگا۔ مگر ایسا درخت کوشش کے باوجود اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ نااُمّیدی کے ساتھ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور نجمہ سے بولا۔

"آپا۔۔۔ آخر وہ درخت کس طرح تلاش کیا جائے؟"

"یہاں درخت ہیں تو مگر پتّوں اور پھلوں سے بالکل خالی ہیں۔" نجمہ بھی اُکتا کر بیٹھ گئی۔ "پھر کیا کِیا جائے۔ ہمیں یہ تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ درخت کہاں ملے گا؟ اِس کے لیے تو پورا جزیرہ چھاننا پڑے گا بھیّا۔"

"بڑا مُشکل کام ہے۔ شاکا نے ہمیں جان بُوجھ کر اِس جزیرے میں بھیجا ہے تاکہ نہ ہم کامیاب ہوں گے اور نہ وہ ہمیں آزاد کرے گا۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ چند آفتوں سے تو ہم بچ گئے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ پھر کِسی مُصیبت سے دوچار ہونا پڑے!"

"تمہارے گلے کا آفاقی ہار شاید پھر کُچھ کام دیکھا جائے گا آپا۔"

"یہ ضروری تو نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آفاقی ہار اپنا اثر کھو بیٹھے۔" نجمہ نے ہار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں تو کُچھ نہیں آتا۔" اختر جھنجھلا گیا۔

اِدھر میں ہال میں بیٹھا ہوا اِن دونوں کی لاچاری پر آنسو بہا رہا تھا۔ شاگو نے مُجھے بتایا تھا کہ اُسے خود بھی جزیرے کے بارے میں کُچھ واقفیت نہیں ہے۔ چونکہ زہروی لوگوں کے لیے وہ جزیرہ قاتل ہے۔ اِس لیے آج تک وہاں کوئی گیا ہی نہیں۔۔۔ البتّہ اُس کا نام سب جانتے ہیں۔ جزیرے میں کیسے حادثات اور کیسی بلائیں پوشیدہ ہیں یہ تو زہرہ کے سائنس دانوں کو آج ہی معلوم ہو رہا ہے۔ ہماری حالت اُس وقت بڑی نازک تھی۔ اختر اور نجمہ کی ایک ایک حرکت پر کبھی تو ہماری مُٹھّیاں بھنچ جاتیں اور دانتوں پر دانت جم جاتے اور جب انہیں مُصیبت سے نکلتے دیکھتے تو سینوں میں دیر

تک رُکے ہوئے سانس یک بیک آزاد ہو جاتے۔ بڑے ہی شش و پنج کا عالم تھا۔

وہ دونوں اُسی طرح حیران و پریشان بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ اچانک نجمہ نے کہا۔

"بھیّا ہوں سوچنے سے کُچھ کام نہ بنے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم یہاں سے اُٹھ کر آگے چلیں۔ یہ جزیرہ اتنا لمبا چوڑا تو ہے نہیں مُجھے یقین ہے کہ وہ پھل دار درخت ہمیں کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔"

اختر کو بھی یہ مشورہ صحیح معلوم ہوا لہٰذا وہ اُٹھ کر نجمہ کے ساتھ بائیں طرف بڑھنے لگا۔ چونکہ اُن کا تھکن کے مارے بُرا حال تھا، لہٰذا اُن کے قدم نپے تُلے نہیں پڑ رہے تھے۔ گھاس کا میدان ختم ہو چکا تھا اور اب صاف چٹیل علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ اِس علاقے میں جگہ جگہ کھُردری چٹّانیں، مٹّی کے

ٹیلے اور لاتعداد غار تھے۔ اختر نے احتیاطاً پستول ہاتھ میں لے رکھا تھا۔
انہیں کُچھ معلوم نہ تھا کہ کسی بھی وقت کیا ہو جائے لہٰذا چوکنّا رہنے کی
ضرورت تھی۔ بہت دیر تک وہ دونوں جگہ جگہ بھٹکتے رہے۔ کبھی دائیں
طرف جاتے اور کبھی بائیں طرف مگر اُس درخت کو ملنا تھا نہ ملا۔ تھک ہار کر
نجمہ پھر ایک مقام پر گر گئی اور اختر نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ کُچھ دیر کے لیے
آرام کرلیا جائے۔ پیاس کے باعث اُن کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے
اور وہ بار بار زبان باہر نکال کر سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھیرتے تھے۔

میں اُن کی یہ حالت دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ نہر تو بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اگر انہیں
معلوم ہوتا کہ اُن کی یہ دُرگت بنے گی تو یقیناً وہ ندی میں سے پانی پی کر روانہ
ہوتے۔ جھیل کا پانی اِس لیے نہیں پی سکتے تھے کہ اُس میں سے جو آبی کوڑا
بُلند ہوتا تھا انہیں قریب ہی نہ آنے دیتا۔ پھر مُجھے یہ خیال بھی آیا کہ انہیں
نہر میں سے پانی پینے کا موقع ہی کب ملا تھا؟ نہر تک پہنچنے سے پہلے انسان نما

گھوڑے نے اُن پر حملہ جو کر دیا تھا!

میں نے سُنا کہ نجمہ اب اختر سے کہہ رہی تھی۔

"بھیّا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اِس پھل کا عرق آفاقی چٹّانوں پر کس طرح چھڑکیں گے؟"

"مجھے بھی یہی فکر ہے۔ ہوائی جہاز ہوتا تو اُس سے کام لیا جا سکتا تھا۔"

"پتار جو ہے ہمارے پاس۔"

"ارے ہاں۔۔۔ واقعی، میں تو یہ بھول ہی گیا تھا۔" اختر کی باچھیں کھِل گئیں۔ "مگر وہ تو ہم سے کافی فاصلے پر ہے۔ کیا مامبو پھل حاصل کرنے کے بعد ہمیں دوبارہ وہاں تک جانا پڑے گا؟"

"جانا ہی پڑے گا۔"

اختر کُچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر گردن ہلا کر بولا۔ "ہاں ٹھیک ہے مگر سب

سے پہلے تو ہمیں پھل والا درخت تلاش کرنا ہے۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔“

اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ درخت کی تلاش میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے پھر آگے بڑھ رہے تھے۔ کافی لمبے فاصلے تک چلنے کے بعد اچانک انہیں وہ درخت نظر آ گیا۔ بڑا لمبا چوڑا درخت تھا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ بے تابی سے تقریباً بھاگتے ہوئے اُس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کئی بار گرے اور کئی مرتبہ اُٹھے اور آخر کار وہ درخت کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ اب وہ اُن سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ یہاں رُک کر وہ جلدی سے بیٹھ گئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ جب اُن کے سانس قابو میں آ گئے تو انہوں نے درخت کو غور سے دیکھا۔

وہ ایک عجیب و غریب درخت تھا۔ اُس کی شاخیں ہاتھی کی ٹانگوں جتنی موٹی اور تقریباً ایک جیسی تھیں درخت میں پتّہ کوئی نہیں تھا۔ البتّہ خربوزے جتنے سُرخ رنگ کے پھل اُس میں لٹکے ہوتے دِکھائی دے

رہے تھے۔ یہی مامبو پھل تھا۔ اور اِسی کی اختر اور نجمہ کو ضرورت تھی۔
اُن کے چہرے خُوشی سے دمکنے لگے اور یکایک اُن کے سینوں میں جوش
پیدا ہو گیا۔ وہ اُٹھے اور تیزی سے درخت کی طرف بڑھے۔ مگر اچانک
ایک عجیب واقعہ ہوا۔ درخت کا تنا اور اُس کی شاخیں آہستہ آہستہ اِس طرح
پھولنے لگیں گویا ربڑ کی بنی ہوئی ہوں۔ وہ درخت پھولتا ہی جا رہا تھا۔ ایک
خاص حد تک پھول جانے کے بعد درخت میں سے ایک سرّاٹے کی آواز
بُلند ہوئی۔ ایک بھیانک شور اور پھر یہ شور تیز ہوا کے ساتھ بڑھنے لگا، ہُوں
آندھی بن گئی اور آندھی طوفان! پھر میں نے دیکھا کہ درخت میں سے
زبردست ہوا خارج ہوتی اور اِس ہوا نے اختر اور نجمہ کو اُڑا کر درخت سے
پچاس گز دور پھینک دیا۔ ایسا کرنے کے بعد درخت کی شاخیں اور تنا پھر
پہلے ہی جیسا ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ہم بھونچکے رہ گئے۔ ہال میں شاکا کے
قہقہے گونجنے لگے اور زرینہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ جیک اور سوامی اب

برداشت نہ کر سکے اور جست لگا کر شاکا کے قدموں میں پہنچ گئے۔ اُن کا اور تو کُچھ بس چلا نہیں، بس انہوں نے شاکا کے پیروں پر مُکّے برسانے شروع کر دیے۔ لیکن بھلا دیوزاد شاکا پر اِس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اُس نے حقارت سے اپنے پیر جھٹک کر کہا۔

"میں تمہاری ہر خطا معاف کرتا رہوں گا۔ مُجھے تو اپنا کام نکالنا ہے۔"

"ظالم۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں تُجھے مار ڈالوں گا۔" اب امجد بھی سینہ تان کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

"مگر کس طرح بھولے انسان! تم ایک حقیر چیونٹی سے بھی چھوٹے ہو اور میں پہاڑوں سے بھی بُلند۔ پھر بھلا وہ کون سا طریقہ ہو گا جس سے تم مُجھے ختم کرو گے۔"

"شاکا۔۔۔ بس بہت ہو گیا۔۔۔۔ اب ان لوگوں پر رحم کرو۔" شاگو نے

اُس کے آگے گڑگڑا کر کہا۔

"میں نے صرف اِن زمین کے کیڑوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ میں انہیں آزاد کر دوں گا۔" شاکا نے اُسے گھور کر کہا۔ "مگر یاد رکھو شاگو تمہیں میں کِسی طرح زندہ نہ چھوڑوں گا۔ بس کسی نہ کسی طرح جزیرۂ فاق سے یہ دونوں بہادر واپس آجائیں۔" یہ لفظ بہادر پر وہ قہقہہ مار کر پھر ہنسا اور بولا۔ "اِس کے بعد تُم دیکھنا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔"

میں اِن باتوں کو زیادہ دیر تک نہ سُن سکا کیوں کہ میری توجّہ وژن اسکرین پر تھی جہاں اختر اور نجمہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوتے اُٹھ رہے تھے۔ وہ خوف زدہ نظروں سے درخت کو دیکھ رہے تھے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے پھونکیں مارنے والا یہ درخت پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بہت دیر تک اِس درخت کو دیکھتے رہے اور پھر اختر نے نجمہ سے کہا۔

"نجمہ بہن۔ یہ درخت تو بہت خوفناک ہے۔"

”اِس تک پہنچنے کا طریقہ کیا ہو گا بھیّا۔۔۔۔؟“

”ایک پتھرّ اِس کے قریب پھینک کر دیکھتا ہوں۔ اگر اِس تک پہنچنا مُشکل ہو گا تو شاید پتھرّ پر بھی وہ پھونکیں مارے گا۔“

پتھرّ درخت کی شاخ پر جا کر لگا مگر کُچھ بھی نہ ہوا۔ اِسی سے وہ دونوں سمجھ گئے کہ درخت آدم خور یا نقصان پہنچانے والا نہیں ہے۔ البتّہ وہ اپنے قریب کِسی جاندار کو نہیں آنے دیتا۔ ایک بات اختر نے اور کہی۔ اُس نے نجمہ کو بتایا کہ اگر ہم پیٹ کے بَل گھسٹتے ہوئے اُس کے پاس پہنچیں تو شاید ہمارے قدم ہوا میں نہ اُکھڑنے پائیں گے۔ نجمہ نے یہ بات تو مان لی۔ لیکن پھر اس نے کہا۔

”مانا کہ ہم وہاں پہنچ گئے۔ لیکن پھل توڑنے کے لیے ہمیں کھڑا تو ہونا ہی پڑے گا۔“

"اس کی ترکیب بھی میں نے سوچ لی ہے۔ زمین پر پڑی ہوئی یہ دو موٹی لکڑیاں اُٹھا لو اور پھر میرے پیچھے پیچھے پیٹ کے بل رینگتی ہوئی آگے بڑھو۔"

خُدا جانے اختر نے کیا سوچا تھا۔ بہر حال نجمہ اُس کا کہا مان کو اُس کے پیچھے رینگتی ہوئی آگے کِھسکنے لگی۔ ہم سانس روکے حیرت سے اُن کی یہ کاروائی دیکھ رہے تھے۔ چوں کہ اختر اور نجمہ کا یہ آخری معرکہ تھا اِس لیے زہرہ کے سائنس دان بھی بڑی توجّہ اور دِل چسپی سے وژن اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ درخت اب اُن سے تقریباً دس گز دور رہ گیا تھا۔ خربوزے سے بھی بڑے لال پھل انہیں کافی تعداد میں لٹکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اختر ایک ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُس نے جلدی سے وہ لباس اُتار لیا اور پھر فوراً کھسک کر درخت کے بالکل نیچے پہنچ گیا۔ اچانک درخت نے پھولنا شروع کر دیا۔ یُوں لگتا تھا گویا کوئی

اژدھا اندر کی طرف سانس کھینچ رہا ہو۔ چند منٹ تک وہ باہر کی ہوا اپنے
تنے اور شاخوں میں بھرتا رہا اور پھر اُس نے ہوا باہر نکالنی شروع کی۔
ویسا ہی بھیانک طوفان پھر اُٹھا۔ لیکن اِس طوفان سے پہلے ہی اختر ایک
عقلمندی کر چُکا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی دونوں لکڑیاں زمین میں کافی
گہرائی تک گاڑ دی تھیں اور اب جب کہ ہوا کا زور اُن دونوں کو اُٹھا کر
پھینک دینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ انہوں نے سینے کے بل لیٹے لیٹے اپنے
دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اِن لکڑیوں کو مضبُوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اور اِس کا
فائدہ یہ ہوا تھا کہ طوفان اُن کا کُچھ بھی نہ بگاڑ سکا تھا۔ وہ طوفان صرف پانچ یا
چھ منٹ تک جاری رہا۔ اور اِس کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ اختر پھر
فوراً ہی کھڑا ہو گیا اور اُس نے لپک کر تین چار پھل درخت میں سے توڑ
لیے۔ نجمہ نے بھی اُس کی تقلید کی۔ جلد ہی انہوں نے دس پھل توڑ لیے۔
ابھی اور توڑنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ درخت پھر پھولنے لگا۔ اختر

نے جلدی سے پھلوں کو اپنے لباس میں باندھ لیا اور پھر وہ دونوں زمین پر پہلے ہی کی طرح لیٹ گئے۔ طوفان پھر شروع ہوا۔ بھیانک آوازیں اور شور اچانک بڑھ گیا اور بے چاری نجمہ درخت کے نیچے اوندھے مُونہہ لیٹی ہوئی ڈر کے مارے کپکپاتی رہتی۔ اختر نے غالباً اِس عرصے میں یہ اندازہ کر لیا تھا کہ طوفان شروع اور ختم ہونے کے بعد درخت کو دوبارہ ہوا اندر لینے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ بس اِسی وقت کا اندازہ کر کے وہ پھر کھڑا ہو گیا اور اُس نے پھر بہت سارے پھل توڑے۔ نجمہ بھی اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اب تقریباً تیس کے قریب پھل ہو گئے تھے۔ اور اتنے وزن کو اُٹھا کر واپس چلنا کُچھ آسان کام نہ تھا۔ شاید اختر نے اتنے ہی پھل کافی سمجھے تھے لہٰذا وہ پھلوں کی گٹھری اُٹھانے کے بعد ڈگمگاتا ہوا جیسے ہی آگے بڑھا درخت پھر پھولنے لگا۔

"بھیّا۔۔۔ بھیّا درخت پھول رہا ہے۔" نجمہ چیخی۔

"گھبراؤ مت آپا۔ میں درخت کی طرف مُونہہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ تُم میری کمر سے کمر لگا کر کھڑی ہو جاؤ۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ زمین پر لیٹ جاؤ۔۔۔ زمین پر لیٹ جاؤ۔"

"وقت نہیں ہے آپا۔ زمین پر لیٹنے کے بعد ہم گٹھڑی کو قابو میں نہ کر سکیں گے۔ وہ اُڑ جائے گی۔"

باتوں میں وقت بہت ضائع ہو رہا تھا۔ نجمہ نے جب یہ دیکھا کہ اختر مانتا ہی نہیں تو اُس نے زبردستی اُسے زمین پر گِرا دیا۔ نجمہ چاہتی ہی تھی کہ ذرا آگے کھسک کر لکڑی کی میخ کو دبوچ لے کہ طوفان شروع ہو گیا۔ اختر نے شاید سمجھ لیا کہ بس اب وہ دونوں ہوا میں اُڑ جائیں گے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی اُس نے طوفان کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور ہوا کے زبردست تھپیڑوں سے لڑتا ہوا وہ سینے کے بل آگے بڑھا۔ ساتھ ہی اُس نے نجمہ سے پُکار کر کہا کہ وہ لیٹے ہی لیٹے اُس کی ٹانگیں مضبُوطی سے پکڑے۔ نجمہ

نے ایسا ہی کیا۔ قریب ہی تھا وہ درخت کی زبردست اور تیز ہوا اختر کو اُٹھا کر بہت دور پھینک دیتی کہ خوش قسمتی سے اختر کے ہاتھ میں لکڑی کی میخ آ گئی۔ اُس نے جلدی سے اِس میخ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑلیا۔ اور یوں اِن دونوں کی جان بچ گئی۔ پھر جیسے ہی طوفان تھما وہ دونوں جلدی سے اُٹھ کر پھلوں کی گٹھری گھسیٹتے ہوئے واپس بھاگے۔ انہیں پچاس گز فاصلہ طے کرنا تھا اور اُن کے پاس صرف چند منٹ تھے۔ انہوں نے راہ کے پتھرّوں اور نوکیلے کنکروں کی بھی پروانہ کی۔ بس بھاگتے رہے اور پھلوں کی گٹھری کو گھسیٹتے رہے۔ اور پھر خُدا خُدا کر کے وہ اُس مقام پر پہنچ ہی گئے جہاں پر وہ پہلے کھڑے ہوئے سوچ رہے تھے کہ درخت تک کیسے پہنچا جائے۔

ہال میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ جب ہم نے اطمینان کا سانس لیا ہے تو ہال میں سانسوں کی آوازیں صاف سُنائی دیں۔ زرینہ دونوں ہاتھوں سے دِل

پکڑے بیٹھی تھی اور جب اُس نے اختر اور نجمہ کو اِس خوفناک درخت کے طوفان سے نجات پاتے ہوئے دیکھا تو اُس نے خُدا کا شکر ادا کیا اور نِڈھال ہو کر امجد کے شانے سے سر لگا لیا۔

جان اور شا گو مُجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے مرے بچّوں کی بہادری پر مُجھے مبارک باد دے رہے ہوں۔ سوامی اور جیک امجد کو تسلّی دے رہے تھے کیونکہ امجد کی بہادر اور خوبصورت بیوی نجمہ ایک بہت ہی بڑے عذاب سے بال بال بچی تھی!

اختر اور نجمہ کو گٹھری کھینچنے میں اتنی محنت کرنی پڑی تھی کہ وہ دونوں بے سُدھ ہو کر زمین پر گر گئے تھے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے تھے۔ کوئی دس

منٹ بعد وہ اِس قابل ہوئے کہ اپنا سفر دوبارہ جاری رکھ سکیں۔ سفر پھر شروع ہوگیا اور پھر کُچھ عرصے بعد وہ گرتے پڑتے اُسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے زندہ گھاس کا میدان شروع ہوتا تھا۔ گھاس اختر کی بُو محسوس کر کے اُس کی طرف بڑھی ہی تھی کہ نجمہ آگے آگئی اور گھاس نجمہ کو دیکھتے ہی سُکڑنے اور سِمٹنے لگی۔ پھلوں کی گٹھری زمین پر رکھنے کے بعد وہ دونوں یہ مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ اختر کا خیال تھا کہ وہ نجمہ کو چھوڑ کر اکیلا اُس جگہ جائے جہاں اُن کا پتار کھڑا ہوا تھا۔ مگر نجمہ اُس کی مخالفت کر رہی تھی۔

"بھیّا۔۔۔ تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ اوّل تو تُم میرے بغیر زندہ گھاس کے اِس علاقے کو عبور نہیں کرسکتے۔ پھر تمہیں اکیلا پا کر ہو سکتا ہے کہ وہ انسان نما گھوڑے تمہارے پیچھے پڑ جائیں۔ تمہیں نہر بھی پار کرنی پڑے گی تب کہیں جا کر تم پتار تک پہنچو گے۔ اِس لحاظ سے تمہارا اکیلے جانا

خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔۔۔۔؟" اختر سوچ میں پڑ گیا۔

"صرف ایک طریقہ ہے۔" نجمہ نے نہر کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم اِن پھلوں کو کسی گڑھے یا غار میں چھُپا کر اوپر سے لکڑیاں ڈھک دیتے ہیں اور پھر دونوں زندہ گھاس کا میدان عبور کر کے نہر کے کنارے تک پہنچتے ہیں۔ تُم پستول لے کر نہر کے پار چلے جانا اور میں وہیں کھڑی رہوں گی۔ جب میں دیکھ لوں گی کہ تم بغیر کسی مُشکل کے پتار تک پہنچ گئے تب میں واپس اُسی جگہ آ جاؤں گی اور پھلوں کو نکال لوں گی۔ تُم پتار کو یہاں اُتار لینا۔ تب ہم پھلوں کو پتار کے اندر لے چلیں گے۔ وہاں اِن کا عرق نکالیں گے اور اپنا بقیہ کام شروع کر دیں گے۔ میرے خیال میں اِس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

نجمہ نے جو طریقہ بتایا تھا در حقیقت ہمیں بھی پسند آیا تھا۔ میرے اپنے

خیال میں اِس سے عمدہ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اختر نے نجمہ کی یہ بات مان لی اور پھر میں نے دیکھا کہ اِن دونوں نے مل کر پھلوں کی گٹھری ایک چھوٹے سے غار میں چھُپا دی اور پھر گھاس کے میدان میں چلتے ہوئے نہر کی طرف جانے لگے۔ گھاس خود بخود بیچ سے ہٹتی جاتی تھی اور

نجمہ اختر کا ہاتھ پکڑے شاہانہ انداز سے آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی۔ جب وہ نہر کے کنارے پُہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ گھوڑوں کے پنجر ابھی تک گھاس کے درمیان میں پڑے ہوئے ہیں۔ اختر نے انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر جلدی سے نہر میں اُتر گیا۔

نجمہ اب اکیلی رہ گئی تھی اور تنہائی کے احساس نے اُسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ اختر کو اُس وقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اختر کُچھ ہی دیر میں پتار تک پہنچ گیا ہو گا۔ مگر جب وہ کافی وقت گزرنے کے بعد بھی پتار کے ساتھ واپس نہیں

آیا تو نجمہ کو پریشانی ہوئی۔ غالباً وہ یہ سوچ کر کہ اختر کو آگے چل کر خود دیکھنا چاہیے جلدی سے نہر میں اُتر گئی۔ نہر پار کرنے کے بعد ابھی اس نے پانی میں سے پاؤں باہر نکالے ہی تھے کہ ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ اس نے ایک جھاڑی کی اوٹ میں سے دیکھا۔ ایک انسان نما گھوڑا دبے پاؤں اس کی طرف آرہا تھا۔ چوں کہ وہ نہر کے دوسری طرف تھا اور اُدھر زندہ گھاس بھی نہیں تھی اس لیے نجمہ کو اپنی زندگی کی فکر پڑ گئی۔

امجد گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور روژن اسکرین کو گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کی بے تابی دیکھنے کے لائق تھی۔ نجمہ کو موت کے مُونہہ میں دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ زرینہ کی دہشت زد نظریں بھی اسکرین پر لگی ہوئی تھیں۔ میری اپنی سمجھ میں بھی نہ آتا تھا کہ نجمہ کس طرح خود کو بچائے گی؟ وہ بڑا نازک وقت تھا۔ میں دِل ہی دِل میں خُدا سے دُعا مانگ رہا تھا کہ نجمہ کسی نہ کسی طرح اس بھیانک جانور سے بچ جائے۔ لیکن شاید خُدا کو کُچھ اور ہی منظور

تھا۔ نجمہ کو دیکھتے ہی وہ انسان نما گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا اور پھر اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ایک عجیب سی چیز نجمہ کی طرف پھینک دی۔ وہ اتنی دہشت زدہ تھی کہ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے یہ مگر جب انسان نما گھوڑے نے اپنی چاروں ٹانگوں پر کھڑے ہونے کے بعد ہاتھوں اور آنکھوں سے اشارے کیے تو نجمہ غالباً سمجھ گئی کہ وہ اس چیز کو اُٹھانے کے لیے کہہ رہا ہے۔

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی اور پھر اُس نے وہ چیز اُٹھا لی۔۔۔ کُچھ بھی نہیں تھا۔ بس چاندی کے روپے کے برابر ایک عجیب سی چمکیلی دھات کا گول سا ٹکڑا تھا۔ نجمہ نے وہ ٹکڑا اُٹھانے کے بعد سہمی ہوئی نظروں سے پھر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ وہ اب مُسکرا رہا تھا۔ اور ویسا ہی ایک دوسرا چمکیلا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر نجمہ کو دِکھا رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے دیکھتے گھوڑے

نے وہ ٹکڑا اپنے ماتھے پر چپکا لیا اور پھر اُسے اشارہ کیا کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔

ہال میں بالکل خاموشی تھی اور سب ٹکٹکی باندھے پردے کو دیکھ رہے تھے۔ زرینہ اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پُونچھ لیتی اور پھر فوراً ہی اسکرین کی طرف دیکھنے لگتی۔ میرے خیال میں شاکا اور اُس کے سائنس دانوں کو بھی یہ علم نہ تھا کہ جزیرۂ فاق میں کیا کیا بلائیں چھُپی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی بے حد دِل چسپی اور تعجّب کے ساتھ لگاتار اسکرین کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

نجمہ جھجک رہی تھی اور غالباً سوچ رہی تھی کہ چمکیلا گول ٹکڑا خود اپنے ماتھے پر بھی چپکائے یا نہیں۔۔۔؟ پہلے اُس نے ٹکڑے کو دیکھا اور پھر اس جانور کو۔۔۔ نجمہ کو جھجکتے پا کر اُس نے گردن اور ہاتھوں سے پھر اشارے کیے کہ فوراً وہ ٹکڑا پیشانی پر چپکا لے۔ آخر کار نجمہ نے ایسا ہی کیا۔

میرے اپنے خیال میں غالباً وہ اِس ٹکڑے کو بھی کتاک جیسی کوئی چیز سمجھ رہی تھی جس کے پیشانی پر باندھتے ہی آدمی کسی دوسری طاقت کا غُلام بن جاتا تھا۔

جیسے ہی نجمہ نے وہ چیز اپنی پیشانی پر چپکائی، ہمیں لاؤڈ اسپیکر میں سے بالکل صاف آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ میں تب سمجھا کہ دراصل وہ آپس میں گفتگو کرنے کا کوئی آلہ تھا۔ یا پھر ٹیلی پیتھی کے ذریعے ایک دوسرے کے خیال پڑھ لینے کے بعد وہ آلہ اُن خیالات کو آواز میں تبدیل کر دیتا تھا۔ بہر حال کُچھ بھی ہو، اُن دونوں کی گفتگو ہمیں بالکل صاف سُنائی دے رہی تھی۔

"مجھ سے ڈرو مت لڑکی۔۔۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" اس جانور نے نجمہ سے کہا۔

"مگر تم کون ہو۔۔۔ اور مُجھ سے کیا چاہتے ہو؟" نجمہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میں فرما ہوں اور تُم سے کُچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی باتیں؟"

"میں نے اور میری مَلِکہ نے دیکھ لیا ہے کہ تُم نے کس طرح ٹروم کو ختم کیا ہے۔ مَلِکہ تُم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"ٹروم۔۔۔۔ یہ کیا چیز ہے؟"

"وہی گھاس جس کو تُم نے ختم کر دیا ہے۔"

"مگر میں نے تو ختم نہیں کیا۔ وہ تو خود بہ خود مُجھ سے دُور بھاگتی ہے۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔۔۔۔ تُم میں کوئی ایسی بات تو ہے نا جس کی وجہ سے ٹروم تُم سے ڈرتی ہے۔" فوما گھوڑے نے مُسکرا کر کہا۔ "حالاں کہ تُم نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ اُس نے میری قوم کے کُچھ ساتھیوں کو کس بے دردی سے مار ڈالا تھا۔"

”ہاں۔۔۔وہ تو میں نے دیکھا تھا۔“

”بس تو میری مَلِکہ نے تمہیں اِسی لیے یاد کیا ہے کہ وہ تُم سے یہ راز معلوم کرے۔“

”راز تو کُچھ بھی نہیں ہے۔۔۔۔بھلا میں کیا جانوں کہ ایسا کس طرح ہوا تھا؟“ نجمہ نے گھبرا کر جواب دیا۔

”خیر یہ ہم معلوم کرلیں گے۔بس تم میری کمر پر سوار ہو کر میرے ساتھ چلی چلو۔“

”ہرگز نہیں۔۔۔میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ نجمہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔“ فوما نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ساتھ ہی اگلے دو پیر بھی بڑھائے۔

”دور رہو مُجھ سے۔ورنہ اِس کا انجام اچھّا نہیں ہو گا۔“ نجمہ اِدھر اُدھر دیکھتے

ہوئے غالباً بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔

"تمہاری دو ٹانگیں ہیں اور میری چار۔۔۔ تُم مُجھ سے بچ کر نہیں جا سکتیں۔"

اتنا کہہ کر وہ جانور نما انسان تیزی سے آگے بڑھا اور اُس نے نجمہ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ نجمہ جلدی سے اُس طرف بڑھی جدھر نہر بہہ رہی تھی۔ اُسے نہر کی طرف جاتے دیکھ کر فوما نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور پھر وہ نہر کے اندر پہنچ گیا۔ پانی اُس کے پیٹ سے لگ رہا تھا اور وہ اِس انداز سے کھڑا ہوا تھا گویا نجمہ کو پانی میں اُترتے ہی پکڑ لے گا۔

"میں تمہارا ارادہ بھانپ گیا ہوں لڑکی۔۔۔" اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف بڑھائے۔ "تُم چاہتی ہو کہ نہر پار کر کے ٹروم کے میدان میں پہنچ جاؤ تاکہ میں وہاں تمہارا تعاقب نہ کر سکوں۔ میں مانتا ہوں کہ تُم نے بہت عمدہ بات سوچی ہے، مگر تمہارا یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکتا۔ بہتر یہی

ہے کہ تُم میرا کہنا مانو اور میرے ساتھ چلو۔۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔" نجمہ چِلّائی۔ "میں تمھارے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گی۔"

"تب تو مُجھے زبردستی کرنی پڑے گی۔ دیکھتا ہوں تُم کیسے نہیں چلتی ہو۔"

اتنا کہ کر وہ نجمہ کی سیدھ میں بھاگنے کے لیے آہستہ آہستہ نہر سے باہر نکلنے لگا۔ اُس کی آنکھیں نجمہ کو گھور رہی تھیں اور ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اُدھر نجمہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ غالباً اُسے اختر پر غصّہ آ رہا تھا کہ وہ پتار لے کر واپس کیوں نہیں آیا؟ اُسے ہی کیا ہمیں بھی اختر پر طیش آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کر رہا تھا۔ اُسے پتار اُڑا کر کبھی کا اُس مقام تک آ جانا چاہیے تھا! پھر آخر کیا بات ہوئی۔ کہیں خُدا نخواستہ وہ کسی مُصیبت میں تو نہیں پھنس گیا؟ امجد مُٹھّیاں بھینچے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور جب اُس نے دیکھا کہ فوما اب نجمہ کو پکڑنے ہی والا ہے تو وہ غُصّے میں بھر کر اُٹھا

اور پھر بُری طرح چیخنے لگا۔

"مجھے بھی اس جگہ بھیج دو۔۔۔۔۔ میں نہ منظر نہیں دیکھ سکتا۔۔۔"

یقیناً وہ شاکا سے مُخاطب تھا۔ مگر شاکا نے اُس کی بات کا جواب صرف ایک بھیانک قہقہے سے دیا۔ امجد غالباً اُس کی طرف لپکنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اُس کو شانے سے پکڑ کر بِٹھا دیا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ اِس طرح بے قابو نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو یہ ہمارے حق میں بُرا ہی ہو گا۔ امجد کا غصّہ تو ٹھنڈا نہیں ہوا البتّہ وہ میرا حُکم نہیں ٹال سکتا تھا۔ لہٰذا دانت پیستا ہوا پھر اسکرین کو دیکھنے لگا۔

فوما نامی جانور اب اپنے اگلے سموں کو پانی سے باہر نکال چُکا تھا۔ نجمہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اِس خطرناک جانور سے بچ کر بھاگ جائے۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہو سکا کیوں کہ ہم نے دیکھا کہ فوما سرپٹ دوڑتا ہوا اپنے آگے آگے بھاگتی ہوئی نجمہ کا تعاقب کرنے لگا۔

نجمہ اِس طرح بھاگ رہی تھی جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ گھوڑا اپنے انسانی مُونہہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا ہوا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اُس کا انسانی جسم نیچے جھُکا ہوا تھا اور ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ جلد ہی وہ نجمہ کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے کافی نیچے جھُک کر نجمہ کو اُٹھا لیا۔ وہ تڑپ رہی تھی اور اس بھیانک جانور کے چنگل سے بچ نکلنے کے لیے بُری طرح مچل رہی تھی۔ مگر سب بے کار۔ گھوڑے نے اُس پر قابو پانے کے بعد مُونہہ اونچا کر کے ایک زبردست نعرہ لگایا اور پھر ہاتھ اُونچے کر کے اُس نے نجمہ کو اپنی کمر پر بٹھا دیا۔ ساتھ ہی اُس نے اپنے دوڑنے کی رفتار بھی تیز کر دی۔ ایک ہاتھ سے اُس نے نجمہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور چلّا رہا تھا۔

"خبردار لڑکی۔۔۔ نیچے کودنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ہر گز زندہ نہ بچو گی۔"

"میں تمھیں جان سے مار دوں گی۔۔۔ تمہاری آنکھیں پھوڑ ڈالوں گی۔"

"لڑکی۔۔۔!" فوما چیخا۔ "میں تُم سے کہہ چُکا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ صرف مَلِکہ تُم سے ملنا چاہتی ہے اور یہ کُچھ اتنی بُری بات تو نہیں جس کو سُن کر تُم ناراض ہو جاؤ اور مُجھے خواہ مخواہ نوچنے کھسوٹنے لگو۔"

"اچھّا، اگر یہی بات ہے تو میں اب کُچھ نہیں کروں گی۔ میں تمہاری مَلِکہ کے پاس چلوں گی۔ مگر وعدہ کرو کہ مُجھے واپس اِسی جگہ چھوڑ جاؤ گے۔"

"وعدہ تو نہیں کرتا، البتّہ میں اِس کی پوری کوشش کروں گا۔"

"کیا مطلب ہے۔۔۔۔؟" نجمہ جھنجھلا گئی۔

"مطلب یہی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ میری بجائے تمہیں کوئی اور فوما آ کر وہاں چھوڑ جائے۔"

"میرے لیے یہ ایک ہی بات ہے۔"

"بس تو پھر چُپ چاپ بیٹھی رہو۔۔۔۔" فوما نے کہا۔ "وہ دیکھو سامنے جو

اونچی پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں اُن کے دامن میں ہی ہم اور ہماری مَلِکہ رہتی ہے۔ تُم اُسے دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔ کیوں کہ اُس کے بال بھی تمہارے ہی جیسے ہیں۔"

ہال میں بیٹھے ہوئے ہم لوگ اب اطمینان کی سانس لے رہے تھے۔ کیوں کہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ نجمہ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔ بس کوئی خاص بات ہے جسے معلوم کرنے کے لیے جانور نما انسانوں کی مَلِکہ نے اُسے بُلایا ہے۔ ہمیں اب یہ گھبراہٹ تھی کہ دیکھیں نجمہ کے ساتھ اب کیا واقعات پیش آتے ہیں۔ شاکا کو بھی غالباً یہ اُمّید نہیں تھی کہ نجمہ اختر سے اِس طرح جُدا کر دی جائے گی۔ لہٰذا اُس نے اپنے سائنس دانوں کو حُکم دیا کہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کبھی اختر کو دِکھائیں اور کبھی نجمہ کو۔ آسمان بالکل صاف دکھائی دیتا تھا اور اُس میں پتار کہیں بھی نظر نہ آتا تھا۔ اِس لیے وژن اسکرین پر وہی منظر نظر آ رہا تھا جس میں نجمہ فوما کی ننگی کمر پر بیٹھی

ہوئی، تیزی سے پہاڑیوں کے قریب ہوتی جارہی تھی۔

پہاڑیوں کے دامن میں پہنچنے کے لیے فوما اب ایک ڈھلان اُتر رہا تھا۔ ہمیں ایک بہت ہی لمبی چوڑی وادی نظر آ رہی تھی جس میں ویسے ہی لاتعداد انسان نما گھوڑے دور دور تک کھڑے ہوئے دِکھائی دے رہے تھے۔ یُوں لگتا تھا گویا اِس قوم کو سوائے ایک ہی مقام پر کھڑے رہنے کے اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ فوما اب اِن جانوروں کے قریب پہنچ چکا تھا اور گھوڑے اپنے انسانی سر اُچکا کر آنے والوں کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔

"تُم اِن کے چیخنے چلّانے کی پرواہ مت کرنا۔۔۔ میں تمھیں سیدھا اُس غار میں لے چلوں گا جہاں مَلِکہ رہتی ہے۔" فوما نے کہا۔

"مگر خُدا کے لیے جو کُچھ بھی کرنا ہے جلد کرو۔ مُجھے واپس بھی پہنچنا ہے۔ میرا بھیّا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"بس۔۔۔لو ہم آ ہی گئے۔"

فوما اتنا کہہ کر غار کے اندر داخل ہونے لگا اور اُدھر شاکا کے سائنس دانوں نے مشین کے کُچھ بٹن دبا دیے۔ اچانک ہمیں غار کے اندر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ ایک بہت ہی خوب صورت اور عالی شان چھتری تھی جس کے عین نیچے سونے کا تاج پہنے ہوئے ایک گھوڑی نما عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا انسانی جسم اوپر سے بالکل ننگا تھا اور اُس جسم کو اُس کے لمبے اور سنہری بالوں نے ڈھک رکھا تھا۔ گھوڑی کے جسم والا حصّہ دُبلا پتلا اور سنہری تھا اور عورت کے جسم والا حصّہ بالکل سُبک اور نازک۔ وہ بہت ہی خوب صورت اور دِل کش عورت تھی۔ وہ نجمہ کو بہت ہی غور اور تعجّب سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے آس پاس چند گھوڑے کھڑے ہوئے تھے لیکن اُن کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ غالباً وہ مَلِکہ کے مصاحب یا وزیر تھے۔ نجمہ کے دیکھتے دیکھتے مُشکی رنگ کا ایک گھوڑا آ گے

بڑھا اور اُس نے مَلِکہ کو ویسا ہی گول اور چمکیلا ٹکڑا دیا جیسا کہ نجمہ اور فوما کی پیشانی پر چپکا ہوا تھا۔ مَلِکہ نے وہ ٹکڑا اپنے ماتھے پر لگا لیا اور پھر مُسکرا کر نجمہ کو دیکھنے لگی۔

"خوب صورت لڑکی تُم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟" مَلِکہ نے پوچھا۔ اس کی مُسکراہٹ اور لہجے کی نرمی سے نجمہ کا حوصلہ بڑھ گیا اور اُس نے اپنے بارے میں سب کُچھ بتا دیا۔

"اوہ۔۔۔ تُو تم اُس نیلے سیّارے کی رہنے والی ہو۔۔۔۔ بس اب مُجھے یقین ہو گیا ہے کہ تُم وہی ہو جس کے بارے میں ہمارے بزرگوں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ ہمیں ٹروم سے نجات دِلائے گی اور ایک نیلے سیّارے سے یہاں آئے گی"

"میں نہیں کہہ سکتی کہ اِس پیش گوئی میں کتنی صداقت ہے۔" نجمہ نے کہا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں زمین سے آئی ہوں اور یہاں زہرہ میں آ کر عجیب

مُصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ خُدا کے لیے آپ کو مُجھ سے جو بھی کام لینا ہے وہ بتا ئیے۔ اگر میرے کرنے کا ہوا تو میں ضرور کروں گا اور پھر مُجھے جلد سے جلد یہاں سے رُخصت کر دیجئے۔"

"کام تمہیں بتا تو دیا ہے کہ تمہیں ٹروم کو ختم کرنا ہے۔" مَلِکہ نے نرمی سے اپنی بات کہی۔

"لیکن یہ کام میں کس طرح کر سکوں گی؟"

"اتنی بھولی نہ بنو لڑکی۔" مَلِکہ نے خلافِ توقّع آنکھیں نکال کر کہا۔ "میرے مصاحب فوما نے مُجھے بتایا ہے کہ تُم نے اپنے پیروں میں کوئی ایسی خاص چیز لگا رکھی تھی جس کی بدولت اُس گھاس پر چلتے ہی ٹروم خود بہ خود راستہ چھوڑ دیتی تھی۔ حالاں کہ یہی گھاس ہمارے لیے اتنی خطرناک ہے کہ میری قوم کے چند گھوڑوں کو منٹوں میں صاف کر جاتی ہے۔"

"مگر یقین کیجئے میں نے اپنے پیروں میں ایسی کوئی چیز نہیں لگا رکھی۔۔۔"
نجمہ نے گڑگڑا کر کہا۔

"مجھے وہ چیز درکار ہے لڑکی۔۔۔۔" مَلِکہ نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر
کے خوفناک "مگر۔۔۔ میں کہتی ہوں کہ۔۔۔۔"

"سوچ لو۔۔۔ تمہیں تھوڑی دیر کی مہلت دی جاتی ہے لیکن اتنا بتا دیتی
ہوں کہ تُم انکار ہرگز نہیں کرو گی۔"

مَلِکہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور نجمہ کو لگاتا گھورنے لگی۔ اِدھر نجمہ غالباً کُچھ
سوچ رہی تھی۔ میرے اپنے دِل نے گواہی دی کہ نجمہ اُس وقت کیا سوچ
رہی تھی اور جیسا کہ مُجھے بعد میں معلوم ہوا نجمہ سچ مچ وہی بات سوچ رہی تھی
جو میں چاہتا تھا۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ اگر نجمہ نے مَلِکہ کے دباؤ میں آ کر
آفاقی ہار اُسے اُتار کر دے دیا تو پھر وہ خود کیا کرے گی۔ خُدا نخواستہ اختر سے
دوبارہ مل جانے کے بعد پتار میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی اور اُسے زندہ گھاس

والے میدان میں اُتارنا پڑ گیا تو؟ تب اِس ہار کے نہ ہونے سے زندہ گھاس تو اُن کا مِنٹوں میں صفایا کر دے گی۔

لہٰذا بہتر طریقہ یہی تھا کہ نجمہ اِس ہار کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرے اور مَلِکہ کو وہ ہار ہرگز ہرگز نہ دے۔ میں خاموش دُعا مانگ رہا تھا کہ جو کُچھ میں نے سوچا ہے خُدا کرے نجمہ بھی وہی سوچے۔ اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ میری دُعا خُدا نے ضرور سُن لی تب ہی نجمہ نے اپنا سر اُٹھا کر گھوڑوں کی مَلِکہ سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کس طرح یقین دِلاؤں۔ میرے پیروں میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"تُم جھوٹ بول رہی ہو۔" مَلِکہ نے چلّا کر کہا۔

"آپ دیکھ لیجئے کہ میرے پیر بالکل ننگے ہیں۔۔۔"

"تو پھر آخر کِس طرح ٹروم تُم سے ڈرتی ہے اور تمہارے قریب آتے ہوئے گھبراتی ہے؟"

"یقین کیجیے کہ مجھے اس کا علم نہیں۔"

"تو پھر ضرور تمہارے کپڑوں میں کوئی ایسی بات ہو گی۔۔۔۔ تُم اپنے سب کپڑے اُتار دو۔"

مَلِکہ کی یہ بات سُن کر نجمہ کے ساتھ ہی اچانک ہم بھی گھبرا گئے۔ وژن اسکرین کو سب ہی غور سے دیکھ رہے تھے اور نجمہ اگر کپڑے اُتار دیتی ہے تو پھر سب ہی اُسے ننگی حالت میں دیکھیں گے۔ یہ خیال بڑا تکلیف دہ تھا۔ امجد بار بار مُجھے کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ نجمہ نے کُچھ دیر جھجکنے کے بعد کہا۔

"کپڑے اُتارنے میں تو مُجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہماری زمین پر

اِسے بُرا خیال کرتے ہیں۔ آپ کے سامنے میں ضرور کپڑے اُتار سکتی ہوں مگر یہاں دوسرے بھی موجود ہیں۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو میرے کپڑوں کی تلاشی لے سکتی ہیں۔"

"اچھّا! اگر ایسا ہے تو۔۔۔۔" مَلِکہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر کوئی بات نہیں۔ میں خود تمہاری تلاشی لے لیتی ہوں۔"
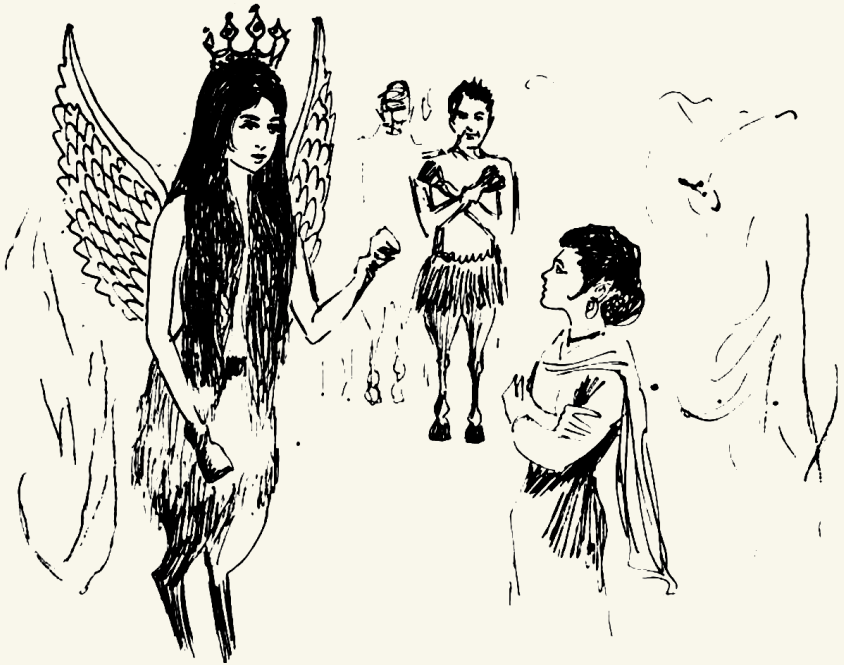
"مگراِس کی کیا ضرورت ہے مَلِکہ۔۔۔۔" فوما نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ہم اِس لڑکی کو اِسی حالت میں اپنے ایک ساتھی کی کمر پر سوار کر کے ٹروم کے علاقے میں بھیج دیں گے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اِس کے جسم میں کوئی خاص بات یا قوّت موجود ہو۔ ہمیں تو اُسی قوّت کی ضرورت ہے۔"

"تمہارا خیال ہے تو ٹھیک، مگر آخر اِس سے فائدہ کیا ہو گا؟" مَلِکہ نے فوما سے دریافت کیا۔

"میرا اندازہ ہے کہ اگر یہ لڑکی کسی بھی ایک فوما کی کمر پر سوار ہو کر ٹروم کے قریب پُہنچے گی تو یقیناً وہ قاتل گھاس اِس لڑکی کی وجہ سے دور ہٹ جائے گی۔" فوما نے کہنا شروع کیا۔ "اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمیں اور کیا چاہیے۔ اِس لڑکی کو ہم ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیں گے۔"

"نہیں نہیں۔۔۔۔ یہ ظُلم ہے۔۔۔ تُم لوگ ظالم ہو۔ مُجھے چھوڑ دو۔ خُدا کے لیے مُجھے جانے دو۔۔۔" نجمہ بُری طرح چلّانے لگی۔

"خاموش رہو لڑکی اور مُجھے سوچنے دو۔ ۔ ۔" مَلِکہ نے ڈانٹ کر کہا۔

"مَلِکہ تُم بہت نرم دِل معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہیں یقین دِلاتی ہوں کہ مُجھ میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔" نجمہ اِلتجا کرنے لگی۔

"میں کہتی ہوں خاموش رہو۔" مَلِکہ نے اُسے پھر ڈانٹا۔

اِدھر ہم سوچ رہے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں خود بھی نہیں معلوم تھا کہ نجمہ اگر کسی انسان نما گھوڑے پر سوار ہو کر زندہ گھاس کے علاقے میں جائے گی تو کیا ہو گا۔ ہم تو بس اُس وقت کے منتظر تھے جب کہ نجمہ وہاں جائے گی اور اس راز پر سے پردہ اُٹھے گا۔ مَلِکہ نے غالباً کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ اِس لیے جب اُس نے اپنی نگاہیں اُٹھائیں تو اُن میں فاتحانہ چمک تھی۔

سنو لڑکی۔ ۔ ۔ جو میرے مصاحب نے کہا ہے، ٹھیک ہے۔" اُس نے کہنا

شروع کیا۔ "تمھیں اُس علاقے میں ضرور جانا ہوگا۔"

"ہاں۔۔۔" فوما خوش ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے ہنہنایا۔ "تمھیں وہاں ضرور جانا ہوگا۔ پہلے ہم تمھارے ساتھ ایک فوما بھیجیں گے۔ اگر اُسے ٹروم نے کُچھ نہ کہا تو پھر دو فوما اور اِسی طرح ہم اپنی پوری قوم کو تمھارے ساتھ وہاں لے جائیں گے۔ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو جانتی ہو لڑکی پھر کیا ہوگا۔ پھر ہم اُن دیوؤں کو اپنا غُلام بنالیں گے جو یہاں سے بہت دُور رہتے ہیں۔ جِن کا قد بہت لمبا ہے اور جِن کے ہاتھوں میں تین اُنگلیاں ہیں۔ ہم اُن پر راج کریں گے۔ اُن کی خوراک استعمال کریں گے اور اِس طرح اُن کے آقا بن جائیں گے۔ ہماری مَلِکہ پھر اُن کی حاکم ہو گی۔"

فوما اتنا کہہ کر بُری طرح اُچھلنے کُودنے لگا اور مُونہہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالنے لگا۔ شاید وہ اپنی خُوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ تو ہوائی قلعے بنا کر خوش

تھا۔ مگر مَیں نے دیکھا کہ شاکا اور اُس کے سائنسدانوں کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ کیوں کہ اگر نجمہ فوما قوم کی بات مان لیتی تو خود شاکا اور اُس کی قوم کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ جیسا کہ شاکا نے ہمیں بتایا، فوما قوم کے اِس طرف آنے سے زبردست خطرہ اِس لیے پیدا ہو سکتا تھا کہ آفاقی چٹّانوں کی تھوڑی بہت رمق اُن کے سِموں یا جسموں پر ضرور موجود ہوتی اور یوں زہروی لوگوں کے لیے وہ بے حد خطرناک اور جان لیوا ثابت ہوتی مگر مُشکل یہ تھی کہ شاکا نہ تو خود نجمہ کو منع کر سکتا تھا اور نہ ہی ہم اُسے اِس کام سے باز رکھ سکتے تھے۔ ہمارا آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ ہی کب قائم تھا؟

نجمہ سہمی ہوئی کھڑی تھی مگر اب تن کو کھڑی ہو گئی اور پھر مَلِکہ سے بولی۔

"اچھّا میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔"

"کون سی شرط۔۔۔؟" مَلِکہ خوش ہو کر بولی۔

"اگر میری وجہ سے ٹروم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے تو پھر آپ مُجھے آزاد کردیں گی اور مُجھے اپنے ساتھیوں تک جانے دیں گی۔"

"اگر ہمیشہ کے لیے ٹروم تباہ ہو جائے تو پھر میں تمہیں ہرگز نہ روکوں گی۔"

"بس تو پھر میں بھی فوراً ہی اپنا کام انجام دینے کے لیے تیّار ہوں۔"

نجمہ کی زبان سے یہ سُن کر فوماؤں کہ مَلِکہ بہت خوش ہوئی اور پھر اُس نے آگے بڑھ کر نجمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبّت سے تھپتھپایا۔ اِس کے بعد فوما سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا۔ "یہ لڑکی تمہارے ہی ساتھ ٹروم کے میدان تک جائے گی۔ ہم بھی پیچھے پیچھے چلیں گے۔ جب تم ٹروم کے اندر داخل ہو جاؤ گے تو ہم دور ہی کھڑے رہیں گے۔ میرا دِل کہ رہا ہے کہ ہم اِس لڑکی کی وجہ سے ضرور کامیاب ہوں گے۔ بس تُم ابھی روانہ ہو جاؤ۔"

نجمہ فوما کی کمر پر سوار ہو گئی اور سہارے کے لیے اُس نے اپنے دونوں

ہاتھوں سے فوما کا انسانی جسم پکڑ لیا۔ اِس کے ساتھ ہی مَلِکہ اور اُس کے بیس مصاحب بھی چلنے کے لیے تیّار ہو گئے۔ میں یہ سوچ کر حیرت زدہ تھا کہ نہ جانے نجمہ کے دِل میں کیا ہے اور وہ کس طرح اِن بلاؤں سے چھٹکارا حاصل کرے گی۔ جان اور زرینہ اپنی تھکی تھکی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔ کیوں کہ نجمہ کے اقدام پر ہی اُن کی زندگیوں کا دارومدار تھا۔

فوما نجمہ کو اپنی کمر پر سوار کر کے اب سرپٹ دوڑتا ہوا ٹروم کے میدان کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کے پیچھے مَلِکہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ عجیب منظر تھا۔ انسانی جسم والے گھوڑے جب چاروں ٹانگوں پر بھاگتے تھے تو اُن کا جسم لہراتا تھا اور نجمہ بار بار اُس جسم کے ساتھ آگے کی طرف جھول جاتی تھی۔ جلد ہی وہ اُس مقام پر آ گئے جہاں سے زندہ گھاس کا میدان شروع ہوتا تھا۔ گھاس اُن کی بُو پا کر ہلنے لگی اور آہستہ آہستہ اُن کی

سمت بڑھنے لگی۔

فوما کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ آگے بڑھتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ نجمہ اُسے تسلّی دے رہی تھی اور بار بار اُسے آگے بڑھنے کے لیے اُکسا رہی تھی۔ مَلِکہ، فوما سے تقریباً بیس گز دور کھڑی ہوئی یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور ہم بھی سانس روکے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ٹروم گھاس اب فوما کے قدموں سے بہت قریب رہ گئی تھی۔ فوما نے اب گھاس کی طرف اپنے اگلے پر بڑھائے اور پھر یہ دیکھ کر تو خُوشی کے مارے اُس کی چیخ نکل گئی کہ گھاس اُس سے دور ہٹ رہی ہے!

فوما آگے بڑھ رہا تھا اور گھاس اُسے راستہ دے رہی تھی۔ مَلِکہ اور اُس کے ساتھی مُونہہ اونچا کیے ہوئے خُوشی کے باعث ہنہنا رہے تھے اور اُچھل کود رہے تھے۔ ہال میں بیٹھا ہوا شاکا یکایک غُصّے کے باعث کھڑا ہو گیا اور سائنسدانوں کو ڈانٹنے لگا کہ وہ کسی بھی طرح نجمہ کو منع کریں کہ وہ گھاس

کے اندر دُور تک نہ جائے مگر افسوس نجمہ تک ہم میں سے کسی کی بھی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ فوما صرف چند گز تک ہی گھاس کے اندر گیا تھا کہ اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔ نجمہ یکایک زور سے اُچھلی اور بجلی کی سی تیزی سے زندہ گھاس میں کود گئی۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے اُس مقام کی طرف بھاگنا شروع کر دیا جہاں کُچھ عرصے پہلے اختر اُسے اکیلا چھوڑ کر نہر کو پار کرنے کے بعد پتار لینے گیا تھا، خُوشی کے باعث میرے گالوں پر آنسو بہنے لگے کیوں کہ میری جان سے پیاری بیٹی نے بڑی ہی عقلمندی سے کام لیا تھا۔ اس موقع پر اس کی جتنی تعریف کی جاتی۔۔۔کم تھا۔ گھاس نے نجمہ کو تو راستہ دے دیا تھا مگر وہ اب فوما کے پیروں میں لپٹنے لگی اور فوما ایک بھیانک چیخ مار کر اُلٹے پیروں پیچھے ہٹا۔ اُسے چیختے پا کر مَلِکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جلدی سے پلٹی اور فوما کو اُس مُصیبت میں چھوڑ کر سرپٹ دوڑتی ہوئی پہاڑیوں کی طرف بھاگ گئی۔ اتّفاق سے فوما گھاس کے

اندر دور تک نہیں آیا تھا لہٰذا وہ بچ کر واپس میدان میں پہنچ گیا۔ کُچھ دیر تک تو وہ کھڑا ہوا ہانپتا رہا اور آخر کار یہ دیکھ کر نجمہ اُسے دھوکا دے کر نکل گئی ہے، غُصّے میں بُری طرح چلّانے لگا۔ شاید مَلِکہ کے اچانک بھاگ جانے پر بھی وہ ناراض تھا، لہٰذا نجمہ سے بدلا لینے کے خیال سے وہ دوڑتا ہوا نہر کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

نجمہ نے غالباً اُس کی آہٹ سن لی اور وہ اُس وقت نہر پار کرنے کے لیے پانی میں اُتر چکی تھی۔ فوما کو قریب آتے دیکھ کر اُس نے جلدی سے نہر کے کنارے پر اُگی ہوئی جھاڑیوں میں سے سرکنڈے جیسی ایک کھوکھلی نلکی توڑ لی اور پھر فوراً نہر کے اندر لیٹ گئی۔ کھوکھلی نلکی کا ایک سرا اپنے مُونہہ میں لے کر دوسرا اُس نے پانی سے باہر نکلا رہنے دیا۔ اب پانی میں چھُپ جانے کے باوجود وہ آسانی سے سانس لے سکتی تھی۔ فوما بڑی بھیانک ہنہناہٹ کے ساتھ وہاں آیا اور پھر اُس نے کنارے ہی پر سے نجمہ کو دُور

دُور تک تلاش کیا۔ اپنا سر وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹتا جاتا تھا اور اگلے سموں کو لگاتار زمین پر مار رہا تھا۔ اُس کی بیتابی دیکھنے کے لائق تھی۔ بار بار مُونہہ اونچا کر کے وہ ایک چیخ مارتا اور پھر زمین روندنے لگتا۔ اُس کی خوفناک آنکھیں کبھی اِس طرف نجمہ کو ڈھونڈتیں اور کبھی اُس طرف۔ آخر کار نا اُمّید ہو کر وہ واپس لوٹ گیا اور پھر چونک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ نجمہ تو پانی میں تھی اِس لیے نہ تو وہ اُس چیز کو دیکھ سکی اور نہ ہی اُس کی آواز سُن سکی۔ گھوڑا اُس چیز کو دیکھ کر دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتا ہوا اپنی چار ٹانگوں سے سرپٹ دوڑتا ہوا بہت دُور چلا گیا۔ تب نجمہ نے ڈرتے ڈرتے سر باہر نکالا اور پھر یہ دیکھ کر اُس کی خُوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ پتنار اُس کے سر پر منڈلا رہا ہے اور اختر کھلی ہوئی کھڑکی سے جھانک کر اُسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

نجمہ نے نہر کے پہلے کنارے پر آ کر زور زور سے اپنا ہاتھ لہرایا اور تب اختر

نے آہستہ آہستہ پٹار کو نیچے گھاس کے میدان میں اُتار لیا۔ نجمہ نے جب اُسے فوما اور اُس کی مَلِکہ کے بارے بتلایا تو اختر کو بہت تعجّب ہوا اور وہ خُدا کا شُکر بجا لایا کہ اُس کی بہن ایک بہت بڑی مُصیبت سے بچ گئی۔ نجمہ کو اپنے ساتھ لے کر اختر نے پھر پٹار کو ہوا میں بُلند کیا اور پھر وہ جلد ہی اُس مقام پر آ گئے جہاں انہوں نے مامبو پھل چھپا دیے تھے۔ خوش قسمتی سے پھل محفوظ تھے۔ لہٰذا اُن دونوں نے مل کر پھلوں کی گٹھری پٹار کے اندر رکھی۔ اختر نے اپنا لباس پھر پہن لیا اور پھر وہ دونوں سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے؟

"اب تو کوئی مُشکل کام باقی نہیں ہے۔" نجمہ نے دور آفاقی چٹّانوں اور جھیل کے پانی پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "اللہ کی مدد سے ہم سبھی مُشکلوں پر غالب آ چکے ہیں۔"

"لیکن آپا۔۔۔ابھی اِن پھلوں کا عرق چٹّانوں پر چھڑکنا باقی ہے۔"

"پٹارمیں بیٹھ کر ہم یہ کام آسانی سے کرسکتے ہیں۔"

"مگر تم اُس آبی کوڑے کو بھول گئیں۔۔۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ اِن چٹّانوں کی حفاظت کرتا ہے۔"

"لیکن عرق تو ہم کافی اُونچائی سے چھڑکیں گے۔۔۔ وہاں تک وہ فوّارہ کیسے پُہنچے گا؟"

"کُچھ بھی ہو۔۔۔ مگر میرا دِل کہہ رہا ہے کہ یہ کام مُشکل ضرور ہے۔۔۔"

"آؤ تو پھر دیر کیوں کرتے ہو۔۔۔۔ تجربہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

اختر نجمہ کی بات مان کر دوبارہ پٹار میں بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک خاص بٹن دبایا اور جہاز دوبارہ اُس جزیرے کے اوپر پرواز کرنے لگا۔ نجمہ نے لباس میں لگی ہوئی پیٹی میں سے خنجر نکالا اور خربوزے جیسے اُس سُرخ پھل میں گھونپ دیا۔ شاید اُس پھل میں گودے کے بجائے صرف عرق ہی بھرا ہوا

تھا۔ یہی وجہ تھی جو اُس میں سے عرق کی ایک پچکاری نکلی۔ کھڑکی کھول کر نجمہ پھل کا عرق ٹپکانے کے تیّار ہو گئی۔ پتار اب آفاقی چٹّانوں کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ ہم نے وژن اسکرین پر دیکھا کہ پتار کو قریب پا کر جھیل کے پانی میں زبردست لہریں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ بار بار اُوپر اُچھل رہا تھا۔ اچانک اُس میں ایک بھنور پیدا ہوا اور پانی کا فوّارہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ جیسے ہی نجمہ نے پھل کا عرق چٹّانوں پر چھڑکا۔ پانی کا فوّارہ تیزی سے بُلند ہوا اور عرق کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گیا۔

چوں کہ وژن اسکرین پر اِس وقت پتار کا اندرونی منظر دِکھائی دے رہا تھا۔ اِس لیے ہم نجمہ اور اختر کے چہروں پر چھائی ہوئی نا اُمّیدی کو دیکھ سکتے تھے۔ اختر بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر شاید اُس کی سمجھ میں ایک ترکیب آ گئی۔ پتار کو چٹّانوں سے بہت دور زمین پر اُتار کر اُس نے نجمہ سے کہا کہ وہ زمین پر سے بڑے بڑے پتھّر اُٹھا کر پتار کے اندر رکھ دے۔ لیکن جب

بھاری بھاری پتھرّ اُس سے نہ اُٹھ سکے تو پتار سے اُتر کر اختر بھی اُس کی مدد کرنے لگا۔ جلد ہی دونوں نے بیس تیس پتھرّ جمع کر لیے اور پھر انھوں نے دوبارہ پتار کو اُڑایا۔

"نجمہ بہن۔۔۔" اختر نے کہا۔ "یہ ہمارا آخری حربہ ہے۔ چٹّانوں کے اور پہنچنے کے بعد میں تمہارے پاس کھڑکی کے قریب آ جاؤں گا۔ جیسے ہی وہ آبی کوڑا بُلند ہو گا تو میرا کام یہ ہو گا کہ میں پتھرّ پوری قوّت سے جھیل کی طرف پھینکوں گا اور تمھیں فوراً ہی یہ کرنا ہو گا کہ عرق چٹّانوں پر چھڑک دو۔ مجھے یقین ہے کہ آبی کوڑا پتھرّ کی طرف لپکے گا۔"

"ہاں ضرور لپکے گا۔۔۔"

"تو پھر؟" اختر نے پُوچھا۔

"بالکل ٹھیک بھیّا۔ مگر ہمارے اِس کام میں تھوڑا سا وقفہ ہونا چاہتے۔" یہ

نجمہ اچانک خوش ہو گئی۔

"کیسا وقفہ؟"

"یعنی جب آبی کوڑا پتھرّ کی طرف لپکے۔ اُسی وقت میں عرق چھِڑکوں۔"

"بالکل۔ بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

میرے بہادر بچّوں نے در حقیقت بہت ہی عمدہ بات سوچی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہال میں بیٹھا ہوا شاکا غُصّے کے باعث اپنے دانت پیس رہا تھا اور اُس کے سائنس دان حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ رہے ہم۔ تو ہم اپنے بارے میں کیا بتائیں۔ بس ہماری شکلیں دیکھنے کے لائق تھیں۔ کبھی اُمّید کی کرن سے ہمارے چہرے دمکنے لگتے اور کبھی اُن پر مایوسی چھا جاتی۔ زرینہ اور امجد بہت غور سے یہ آخری معرکہ دیکھ رہے تھے اور جان میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "فیروز کاش

بچّے کامیاب ہوجائیں۔ میرے خُدا کیا تُو میری خاموش دُعا سُن رہا ہے؟"

اچانک مُجھے ایک شور سُنائی دیا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا کہ نجمہ چٹّانوں پر عرق چھڑک رہی ہے اور اختر تاک تاک کر پتھرّ جھیل میں پھینک رہا ہے۔ آبی کوڑے کی عجیب حالت تھی۔ جیسے ہی وہ ایک پتھرّ کو پکڑنے کے لیے جھیل کی طرف لپکتا۔ فوراً ہی نجمہ عرق چھڑک دیتی اور آبی فوّارہ تیزی سے چٹّان کی سمت بڑھتا۔ مگر اُس کے چٹّان تک آنے سے پہلے ہی اختر دوسرا پتھرّ جھیل کی طرف پھینک دیتا۔ اختر نے پتار کا غالباً کوئی ایسا بٹن دبا دیا تھا جس کے باعث وہ ہیلی کاپٹر کی طرح فضا میں ایک ہی مقام پر ساکت کھڑا رہا تھا۔ عرق میں نہا جانے کے بعد چٹّانوں میں سے باپ جیسا دھواں نکلنے لگا۔ یہ دھواں بڑھتا ہی گیا اور اوپر اُٹھنے کے بعد بھاپ کی طرح ہوا میں تحلیل ہوتا رہا۔ ہم نے دیکھا کہ چٹّانیں اِس طرح کِھل رہی تھیں جیسے چونے پر پانی ڈالنے سے چونا پھٹنے لگتا ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک اختر نے پتار کو ہر

چٹّان پر ٹھہرا کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ سو فٹ اونچی کئی چٹانیں اب پگھل رہی تھیں۔ اور اُن کا پگھلا ہوا لاوا جھیل کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

خُدا جانے کیا بات تھی کہ لاوے کے جھیل میں ملتے ہی آبی کوڑا خود بخود نیچے ہونے لگا اور پھر جلد ہی وہ پانی کی سطح کے برابر ہو گیا۔ اختر اور نجمہ کی خُوشی کوئی اُس وقت دیکھتا! دونوں بھائی بہن ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور نجمہ خُوشی کے باعث رونے لگی۔ اختر نے ایک مامبو پھل بچا لیا تھا۔ کیونکہ شاکا کی یہی شرط تھی کہ چٹانوں کو ختم کرنے کے بعد وہ پھل ضرور واپس لے کر آئے۔ نجمہ کہہ رہی تھی کہ یہ سب آفاقی ہار کا کرشمہ ہے۔ اگر وہ ہار اُس کے گلے میں نہ ہوتا تو وہ دونوں کسی بھی طرح کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ اِتنا کہہ کر جیسے ہی اُس نے ہار کو ہاتھ لگایا۔ یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئی کہ ہار کے دانے پگھل کر اُس کے لباس میں جذب ہو چکے ہیں۔

اتنا قیمتی ہار بھی اب ختم ہو چکا تھا۔ نجمہ کو افسوس تو ہوا مگر پھر یہ سوچ کر

مطمئن ہو گئی کہ ہار کی اب ضرورت بھی کیا ہے۔ اِس جزیرے سے واپس
جانے کے بعد تو وہ سب آزاد ہو ہی جائیں گے۔ اختر نے پتار کی کھڑکی بند
کرلی اور پھر پتار اُس خاص سمت میں پرواز کرنے لگا جو سائنس دانوں نے
اختر کو پہلے ہی سے بتا دی تھی اور جس پر چلنے کے بعد پتار اب کُچھ ہی دیر بعد
واپس ہال میں آنے والا تھا۔ ایک گھنٹے تک ہم وژن اسکرین پر نظریں
جمائے بیٹھے رہے۔ کبھی اسکرین پر صرف پتار دکھائی دیتا ہے۔ اور کبھی
اُس کے اندر کا منظر۔ اختر اور نجمہ کے چہرے پھول کی طرح کھلے ہوئے
تھے اور انہیں یقین تھا کہ اب کچھ ہی دیر بعد وہ اس خاص راکٹ میں بیٹھے
ہوئے زہرہ سے اپنی حسین و جمیل دُنیا کی طرف واپسی کا سفر شروع کر
چکے ہوں۔"

ہال کی چھت میں اب ایک خلاء پیدا ہو رہا تھا اور پتار کا شور مُجھے صاف سُنائی
دے رہا تھا۔ پھر چند منٹوں بعد میں نے پتار کو ایک پلیٹ فارم کے ذریعے

آہستہ آہستہ نیچے اُترتے ہوئے دیکھا۔ جب اختر اور نجمہ اُس میں سے نکل کر اپنی ماں سے لپٹے ہیں تو وہ منظر بڑا موثر اور درد انگیز تھا۔ وہ دونوں تو امجد زرینہ اور جیک وغیرہ سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اِدھر جان نے اختر کے ہاتھ سے مامبو پھل لے کر شاگو کو دے دیا۔ شاگو کی آنکھوں سے ممنونیت کا ایک آنسو ٹپکا اور وہ پھل شاکا کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

"لو یہ ہے مامبو۔ اِن دونوں نے تُم پر ہی نہیں بلکہ تمہاری قوم پر احسان کیا ہے۔"

"مانتا ہوں۔ مُجھے اِس کا اعتراف ہے۔" شاکا نے خُشک لہجے میں جواب دیا۔

"تُم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ انھوں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب سورج کی کرنوں کے ساتھ آفاقی لہریں اِس طرف نہیں آیا کریں گی۔ زہرہ کا ایک ایک بچّہ اب اطمینان کا سانس لے سکے گا۔ اُن کے سانسوں

میں جو آفاقی لہروں کا زہر گھُل رہا تھا، اب انہیں اُس سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی اور اُن کے نجات دہندہ یہ دونوں بھائی بہن ہیں جو ایک بے حد شریف اور بہادر انسان کی اولاد ہیں۔"

"تم سے تقریر کرنے کے لیے کس نے کہا ہے؟" اچانک والٹر ہال میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"تُم بھی سُن لو کوراک۔ اختر اور نجمہ نے تمہاری پوری قوم کو بچا لیا ہے۔ آؤ اور اِن بچّوں کے قدموں میں سر رکھ دو۔"

"میں مانتا ہوں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ احسان کیا ہے۔" کوراک نے کہا۔ "مگر ہم بھی احسان فراموش نہیں۔۔۔ ہم احسان کا بدلہ اِس طرح اُتار رہے ہیں کہ انہیں ان کی دُنیا میں بھیج رہے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر انہیں ابھی اور اِسی وقت روانہ کر دو۔" شاگو نے بے

یابی سے کہا۔

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" شاکا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا تُم ہمیں اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کا کوئی موقع بھی نہیں دینا چاہتے شاگو؟"

شاگو کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اُسے ہی کیا ہم میں سے کسی کو بھی یقین نہ آیا کہ شاکا اتنے نرم لہجے میں بات کر سکتا ہے۔ شاگو نے حیرت سے کہا۔ "یہ تُم بول رہے ہو شاکا۔"

"ہاں۔۔ یہ میں بول رہا ہوں۔ جب میں جیکسن بنا ہوا تھا تو اِن دونوں کی بہادری اچھّی طرح دیکھ چکا تھا۔ فیروز خود کتنا عقل مند اور ہوشیار انسان ہے اِس کا تجربہ بھی مُجھے ہو چکا ہے۔ جان جیسے معاملہ فہم اور اَن تھک انسان کی بھی میں قدر کرتا ہوں کیونکہ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ لوگ زہرہ کی طرف نہیں آسکتے تھے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آقا۔" کوراک جو ابھی تک ہمارے ہی قد کے برابر تھا آگے بڑھ کر بولا۔ "یہ لوگ بڑے خطرناک ہیں۔ میں گزارش کروں گا کہ انہیں ہرگز معاف نہ کیا جائے۔"

"مُجھے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے، یہ میں خوب سمجھتا ہوں۔ تُم خاموش رہو۔"

"تو اِس کا مطلب یہ کہ ہے کہ یہ لوگ اب آزاد ہیں؟" شاگو نے مسرّت سے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"بے شک آزاد ہیں۔" شاکا بولا۔ "لیکن میں اِن کو یہ رائے نہیں دوں گا کہ وہ شہر میں جائیں۔ یہ بہت چھوٹے ہیں یقیناً کسی زہروی آدمی کے پاؤں تلے آکر کُچلے جائیں گئے۔ تُم انہیں پتار پر بٹھا کر زہرہ کی سیر کراؤ اور پھر کل اسٹیڈیم میں اِن کا استقبال ہو گا۔ عوام یہاں جمع ہوں گے۔ اِن کی بہادری اُن کے سامنے بیان کی جائے گی۔ پھر سرکاری طور پر ان کی

دعوت ہوگی جس میں مَیں خود بھی جیکسن کی شکل میں موجود ہوں گا۔"

بولو، کیا اِن کے لیے یہ اعزاز کم ہے؟"

"نہیں۔۔۔ کسی بھی طرح نہیں!" شاگو خُوشی کے باعث چیخ کر بولا۔

"تُم کہو مسٹر جان۔ کیا تمہیں اب مُجھ سے کوئی شکایت ہے؟"

"مُجھے اور میرے ساتھیوں کو کوئی شکایت نہیں ہے شاکا۔ ہم لوگ تو امن کا پیغام لے کر یہاں آتے تھے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ نظامِ شمسی کے اِن دونوں سیّاروں، یعنی زمین اور زہرہ کے درمیان تعلقات بڑھیں۔ دونوں جگہ سے بُرائی کا خاتمہ ہو اور بھائی چارہ بڑھے۔ ہم خُدا کی مخلوق ہیں اور خُدا نے ہمیں کسی سے نفرت کرنا نہیں سکھایا۔ لہٰذا میں تمہاری دعوت قبول کرتا ہوں۔"

"شکریہ۔۔۔ بس تو اب کل اسٹیڈیم میں ہماری ملاقات ہوگی۔"

شاکا اتنا کہہ کر چلا گیا اور اُس کے جاتے ہی کوراک بھی پیر پٹختا ہوا ایک دروازے سے باہر نکل گیا۔ سائنس داں بھی کُچھ دیر بعد اُنہیں وہاں اکیلا چھوڑ گئے۔ اختر بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ آخر کار اُس نے آگے بڑھ کر جان سے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ چھوٹا مُونہہ اور بڑی بات ہے۔ مگر مُجھے یہ سب کُچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"کیا عجیب سا لگ رہا ہے؟"

"شاکا اِس قدر جلد کیسے بدل گیا؟"

"یہاں تعجّب تو مُجھے بھی ہے۔" جان کی بجائے شاگو نے کہا۔ "لیکن ہو سکتا ہے کہ اُس کا دِل پسیج گیا ہو اور اب وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو۔ تُم نے اُس پر ہی کیا اُس کی پوری قوم پر احسان کیا ہے۔ لہٰذا اب وہ اِس احسان کا

بدلہ اُتارنا چاہتا ہے۔"

"ہاں ممکن ہے کہ یہی بات ہو۔ انسان کو بدلتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ انسان نہیں ہے فیروز صاحب۔ جیک کے تیور اچھے نہیں تھے۔"

"بہرحال اگر ہمیں اُس پر اعتماد نہیں ہے تو ظاہر یہی کرنا پڑے گا کہ اُس کی باتوں پر ہم نے یقین کر لیا ہے۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "صرف کل تک کی بات تو ہے۔ کل دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

"میری حقیر رائے بھی یہی ہے مالک کہ ہمیں اپنی حفاظت کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے۔" سوامی نے آہستہ سے مشورہ دیا۔

شاگو نے سوامی کی بات کی تائید کی اور پھر یہ وعدہ کیا کہ وہ رات ہی رات

میں ہمیں خاص قسم کے ہتھیاروں سے لیس کر دے گا۔ اور اُس ہتھیار میں سوبیا دھات ہوگی جسے پاور ہاؤس میں سے تھوڑی سی مقدار میں نکال لیا جائے گا۔ جس قسم کا ہتھیار اختر کے پاس موجود ہے۔ ایسے ہی ہتھیار سب کو دے دیئے جائیں گے تاکہ ہم اُس میں سوبیا خود بھر لیں۔ کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سوبیا ہم انسانوں کے لیے تو خطرناک نہیں تھی، البتّہ زہروی لوگوں اور اُن کے جکاریوں اور زوکوں کے لیے زہر سے کم نہیں تھی۔ شاگو کی اِس بات سے ہم مطمئن ہو گئے اور پھر اُس کے ساتھ ہال سے باہر آ گئے۔ بازاروں میں بڑی چہل پہل تھی۔ ہم نے صرف دُور سے یہ چہل پہل دیکھی اور بعد میں ایک خاص پتار میں بیٹھ کر زہرہ کی سیر کی۔

غیر ضروری باتوں سے اب میں یہ کہانی لمبی نہیں کرنا چاہتا۔ بس یوں سمجھئے کہ راتوں رات ہم ہتھیاروں سے لیس ہو گئے۔ سوامی اور جیک نے

شاگو کے ساتھ جا کر پا ور ہاؤس سے سوبیا نکالی تھی، اور پھر اُسے اُن خاص ہتھیاروں میں بھرا۔ بعد میں یہ ہتھیار ایک سفید اور چمکیلے غلاف کے اندر رکھ دیے گئے تاکہ وہ شاگو کو نقصان نہ پہنچائیں۔ پھر ہم لوگ گھوڑے بیچ کر سو گئے اور دوسرے دِن ہی ہماری آنکھ کھُلی۔

شاید ہمارے اِس انوکھے سفر کا وہ پہلا دِن تھا جب کہ ہم نے سکون کے ساتھ آنکھیں کھولی تھیں۔ ہمارے لیے جو لباس مہیّا کیا گیا تھا وہ دراصل ان لوگوں نے بنایا تھا جو گڑیوں کے کپڑے تیّار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم اُن دیوزادوں کے مُقابلے میں گڑیوں جیسے ہی تھے۔ یہ نیا لباس پہن کر ہم آٹھوں بڑے عجیب سے لگنے لگے۔ اِس لباس میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو اُسے زرینہ اور نجمہ نے مل کر پورا کر لیا تھا۔ زمین کے وقت کے لحاظ سے آٹھ بجے صُبح شاگو ہمارے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ اب کُچھ ہی دیر میں ہمیں اسٹیڈیم کی طرف روانہ ہونا پڑے گا۔ زہرہ کے لوگوں میں بڑا

جوش ہے اور وہ ہمیں دیکھنے کے لیے بہت بے تاب ہیں۔

وقت مقرّرہ پر ہم ایک ویسی ہی گاڑی میں جو زہرہ میں آنے کے بعد ہم دیکھ چکے تھے، اسٹیڈیم کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ شاگو اور خامن بھی تھا۔ گول گول عمارتیں جِن کے دروازے پُلوں کے ذریعے آپس میں ملے ہوتے تھے، اِس سِرے سے اُس سِرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہمیں اپنے قد کے لحاظ سے ہر چیز بڑی نظر آرہی تھی۔ جس طرف سے بھی ہماری گاڑی گزرتی، خوفناک صورت والے زہرہ کے باسی اپنے ہاتھ ہلاتے اور مُونہہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکالتے۔ ہمیں یہ اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ وہ ناراض ہورہے ہیں یا خوش؟ اُن کے نعرے ہماری سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر ہمیں اِس کی پروا نہیں تھی۔ ہمیں تو اب جلد سے جلد اسٹیڈیم پہنچنے کی خواہش تھی۔

یہ وہی اسٹیڈیم تھا جہاں ایک روز پہلے ہمیں قیدی بنا کر لایا گیا تھا۔ آج

اِسے رنگ برنگے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اور بیٹھنے کا انتظام بھی بہت اچھّا کیا گیا تھا۔ ہمیں شاکا کے تخت کے قریب لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ حسبِ توقّع شاکا کا تخت چھوٹا بنایا گیا تھا اور ہمارے اندازے کے مطابق اُتنا ہی بڑا تھا جتنا کہ زمین پر راجوں مہاراجوں کے تخت ہوتے ہیں۔ ہمارے آگے ایک لمبی میز بچھی ہوئی تھی جس پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ اچانک ایک خوفناک آواز والا بگل بجا اور پھر شاکا جیکسن کی صورت میں ایک طرف سے نمودار ہوا اور مُسکراتا ہوا ہماری طرف بڑھنے لگا۔ جلد ہی دعوت شروع ہو گئی۔ ہم نے پہلی بار بڑے عجیب اور لذیذ کھانے کھائے۔ حیرت انگیز اور نرالے مزے والے پھل چکھّے۔ زرینہ اور نجمہ بہت خوش تھیں۔ زرینہ بار بار مُجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں راکٹ میں کُچھ پھل ضرور رکھوا دوں۔ اِن کا بیج دُنیا میں لے جا کر بُو دیں گے اور پھر وہاں بھی ایسے ہی پھل اُگ آئیں گے۔ ابھی میں اُسے کوئی جواب دینے

ہی والا تھا کہ شاکا کھڑا ہو گیا اور اپنی جیب میں سے ایک چھوٹا سا چوکور ڈبّہ نکال کر اُس میں مُونہہ لگا کر بولا۔

"لوگو! آج ہمارے لیے بہت بڑی خُوشی کا دِن ہے کہ زمین کے کُچھ سیّاح ہماری دُنیا میں موجود ہیں۔ ابھی کُچھ دیر بعد وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آج اُن کے شایانِ شان استقبال کیا جائے۔ تُم لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

اُس کی یہ بات سُنتے ہی زبر دست شور بلند ہوا۔ زہرہ کے لوگ ہماری حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔ اور پھر اِن نعروں کے درمیان میں مُجھے والٹر یا کوراک کی آواز سُنائی دی جو ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوتے میری طرف آ رہا تھا۔

"یقیناً اپنے مہمانوں کا استقبال کرنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ اِس استقبال کے بعد میں اپنی قوم کی طرف سے انہیں الوداع کہتا ہوں۔"

"الوداع دوستو!" شاکا نے اچانک بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب اپنے آخری سفر کے لیے تیّار ہو جاؤ۔"

میرے ساتھ ہی جان نے بھی اُسے حیرت سے دیکھا۔ شاکا کے تیور اچھّے نہیں تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر حقارت کا تبسّم تھا اور آنکھوں میں نفرت ہی نفرت دِکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے ہمیں طنزیہ انداز میں دیکھ کر تالی بجائی اور پھر اچانک جکاریوں کا ایک غول کہیں سے نمودار ہو کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔ ہم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ سوامی اور جیک نے جلدی سے ہمارے آگے آ کر اِن کا راستہ روک لیا۔ پورے اسٹیڈیم میں لوگ بُری طرح شور مچا رہے تھے۔ شاید انہیں شاکا کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا شاکا۔" شاگو نے غُصّے کے مارے مُٹھّیاں بھینچ لیں۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" شاکا نے جواب دیا "اور سنو، تُم میرے قیدی ہو لہٰذا اِس بے تکلّفی سے گفتگو کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"تُم اِن لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہتے ہو؟" شاگو نے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"انہیں آخری سفر پر روانہ کر رہا ہوں۔ اِن کے آخری سفر پر۔" شاکا نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔

"نہیں تُم ایسا نہیں کر سکتے۔" اِس بار خامن نے چلّا کر کہا۔

"تُم غدّار ہو اور غدّاروں سے نپٹنے کا طریقہ میں اچھّی طرح جانتا ہوں۔"

"شاکا۔۔۔" جان نے بارُعب آواز میں کہا۔ "کیا تمہارے عوام کو معلوم ہے کہ تُم ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"اِس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ عوام تو بھیڑیں ہوتی ہیں۔ جِدھر چاہو ہانک

لو۔"

جکاری اب بالکل قریب کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو اُن کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہنٹر ہِل رہے تھے۔ اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ ہمیں کچّا چبا جائیں۔ اب آہستہ آہستہ وہ اور قریب آ رہے تھے۔ جب شاگو نے دیکھا کہ جکاری سچ مُچ ہمیں گرفتار کرلیں گے تو اُس نے چلّا کر کہا۔

"میں اپنے مُلک کی سر زمین پر یہ وعدہ خلافی نہ ہونے دوں گا۔ بے شک یہاں خُون کی ندیاں بہہ جائیں۔ مگر ہمارے یہ مہمان صحیح سلامت یہاں سے واپس ضرور جائیں گے۔ مسٹر جان اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنے ہتھیاروں سے کام لیں۔"

شاکا یہ بات سُن کر اتنا ہنسا کہ کم بخت دُہرا ہو گیا اور پھر ہنستے ہنستے بولا۔

"ہتھیار کیسے ہتھیار! کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے ہتھیاروں میں سو بیا ابھی تک موجود ہو گی۔"

ہم نے جلدی سے اپنے لباسوں میں سے وہ خاص ہتھیار نکالے جن کے گول چکّر میں سوبیا بھری ہوئی تھی مگر یہ دیکھ کر ہم اچنبھے میں رہ گئے کہ اب وہ سوبیا سے خالی ہیں۔

"کیوں دیکھ لیا نا۔" شاکا دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بولا۔ "کیا تُم لوگ مُجھے اتنا ہی اناڑی سمجھتے ہو کہ میں تُم سے غافل رہتا۔ جب رات کو یہ لوگ آرام کر رہے تھے تو میرے سائنس دانوں نے سوبیا سے بچنے والا لباس پہن کر اِسے ہتھیاروں میں سے نکال لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جکاری تمہارے قریب آسکے ہیں۔"

شاگو اور خامن یہ سُن کر بھونچکے رہ گئے اور بڑی دیر تک شاکا کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ خون تو ہمارا بھی کھول رہا تھا مگر کیا کرتے مجبور تھے۔ جکاریوں کے ہنٹر اُن کے ہاتھوں میں لہرا رہے تھے اور ہم اچھّی طرح جانتے تھے کہ اِن ہنٹروں کی مار کیسی ہوتی ہے! اسٹیڈیم میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔

وہ لوگ دیوزاد ہونے کے باوجود چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ اِسی سے اسٹیڈیم کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہماری جسامت اور قد کے برابر صرف شاکا، والٹر، شاگو، خامن اور اُس کے چند جانثار تھے جو اِس وقت ہمارے پاس ہی کھڑے ہوئے تھے۔ شاکا بڑا مطمئن تھا اور بے فکری سے ہمیں دیکھ رہا تھا، گالیاں کھانے کے باوجود وہ مُسکراتا ہی رہا اور پھر جکاریوں سے بولا۔

"لے جاؤ اِن بدبختوں کو اور قربانی کے چبوترے پر لے جا کر گردنیں اُڑا دو۔"

اُس کی یہ بات سُن کر کُچھ لوگ جوشیلے نعرے لگانے لگے اور ہاتھ ہلا کر شاکا کے اِس اقدام کی تعریف کرنے لگے۔ جکاری جیسے ہی ہمیں پکڑنے کے لیے آگے بڑھے اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔ والٹر جلدی سے اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور شاکا کے سامنے پہنچ کر بولا۔

"نہیں آقا۔ عوام میں سے بہت سے لوگ شاگو کے حامی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ

لینے کے دینے پڑ جائیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ اِن قیدیوں کو رہا ہونا ہی چاہیے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تُم؟" شاکا حیرت زدہ انداز میں اچانک پیچھے ہٹ کر بولا۔

"ہاں۔۔۔ ہمارا وعدہ یہی تھا کہ ہم انہیں آزاد کر دیں گے۔"

"یہ تُم کہہ رہے ہو۔ تم، جس نے اِن احمقوں کو پکڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور پھر انہیں گرفتار کرنے کے لیے اِن کی دُنیا میں گئے! یہ تُم کہہ رہے ہو جس نے انہیں اپنی نیلی دُنیا میں کافی دنوں تک قید رکھا۔"

"ہاں۔۔۔ یہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں اِن پر اتنا ظُلم گوارا نہیں کر سکتا۔" والٹر نے غُصّیلی آواز میں جواب دیا۔

"اوہ تو تُم اِن کمینوں سے مل گئے ہو۔" شاکا نے غُصّے سے پیر پٹخے۔ "جکاریو! گرفتار کر لو اِسے بھی۔"

”نہیں میرے آقا آپ ایسا نہیں کرسکتے۔“ والٹر نے جلدی سے اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس اُتار ڈالا۔ اور پھر ہم نے دیکھا کہ وہ ایک چُست اور چمکیلے سفید رنگ کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں دستانے تھے اور ایک ہاتھ میں وہی ہتھیار تھا جس کے چکّر میں سوبیا موجود تھی۔ اپنے پہلو سے لٹکی ہوئی ایک اسٹین گن اُس نے جلدی سے نکال کر جیک کی طرف اُچھال دی جسے جیک نے فوراً پکڑ کر پوزیشن لے لی۔ اِس کے بعد والٹر ہنس کر بولا۔

”کیوں آقا، میں نے کہا تھا نا کہ تُم ایسا نہیں کرسکتے۔ میں نے تو سوبیا کی زہریلی کرنوں سے بچنے والا اپنا ہی ایجاد کردہ لباس پہن رکھا ہے مگر تُم نے اپنے بچاؤ کے لیے کیا کِیا ہے۔“

”ذلیل۔۔۔ غدّار۔۔۔“ شاکا اِس کے علاوہ اور کُچھ نہ کہہ سکا۔ وہ پیچھے ہٹنے لگا اور پیچھے بیٹھے ہٹتے بھی اُس نے ایک غبارے نما کوئی چیز زمین پر زور سے

پیچ دی۔ ایک زبردست دھماکا ہوااور دھماکے سے پیدا ہونے والا دھواں پھیلنے لگا۔ والٹر نے آگے کی سمت بھاگتے ہوئے جیک سے کہا۔

"جیک تُم سب کو دیکھتے رہو۔ اگر کوئی آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو گولی چلا دینا۔"

ہم اب چوکنّے ہو گئے تھے اور والٹر کو غور سے دیکھ رہے تھے جو اب تیزی سے شاکا کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اُس نے دوڑتے ہی دوڑتے اُس ہتھیار کے بٹن کو دبا دیا تھا اور پھر شاکا ہمیں زمین پر گرتا ہوا دِکھائی دیا تھا۔ اُسے گِرتے دیکھ کر والٹر نے وہیں سے اپنا ہتھیار جان کی طرف اچھّال دیا اور اُس کا ایسا کرنا ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا کیونکہ جکاری اب ہمیں پکڑنے ہی والے تھے۔ جیسے ہی جان نے اُس ہتھیار پر قبضہ کیا شاگو اور خامن اپنے ساتھیوں کے ساتھ زمین پر لیٹ گئے اور پھر شاگو نے زمین پر لیٹے ہی لیٹے کہا۔

"مسٹر جان ۔ ۔ ۔ براہِ کرم اِس ہتھیار کا رُخ نیچے مت کیجیئے گا۔ اِسے جکاریوں کی طرف تانے رکھیئے۔ سوبیا کی کرنیں ہمیں بھی کمزور کردیں گی۔ اِس کے ساتھ ہی خیال رکھئے گا میرے حامی بغاوت شروع ہی کرنے والے ہیں۔"

جان نے پھر ایسا ہی کیا۔ جکاری سوبیا والے ہتھیار کو دیکھتے ہی پسپا ہونے لگے اُن میں سے کُچھ تو وہیں گِر کر تڑپنے لگے۔ کیونکہ سوبیا کی کرنیں اُن کے لیے قاتل ثابت ہوتی تھیں اور باقی لڑکھڑا کر جلدی جلدی پیچھے ہٹنے لگے۔ راکٹ ہم سے کُچھ ہی فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی سیڑھی بھی نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ شاگو نے لیٹے ہی لیٹے ہمیں ہدایت کی کہ جلد سے جلد ہمیں راکٹ کے پاس پُہنچ جانا چاہیئے۔ جیک کے پاس جو اسٹین گن تھی اُس نے اُسے اُوپر کر کے یونہی ڈرانے کے لیے ہوا میں فائر کر دیے۔ فائر کی آواز اِتنی تیز تھی کہ لوگوں میں بھگڈر مچ گئی۔ راکٹ کے قریب پہنچتے ہی شاگو نے (جواب سوبیا

والے ہتھیار سے بچنے کے لیے ہمارے پیچھے آ رہا تھا) ہمیں پھر ہدایت کی کہ ہم جلد سے جلد راکٹ کی سیڑھی پر چڑھ جائیں۔

میں نے سب سے پہلے زرینہ، نجمہ اور اختر کو راکٹ پر چڑھایا۔ شاگو کے بار بار کہنے پر جان، سوامی اور پھر میں بھی راکٹ پر چڑھ گیا۔ اب صرف امجد اور جیک نیچے رہ گئے تھے۔ امجد نے جان سے سوبیا والا ہتھیار لے لیا تھا اور پھر سیڑھی کے پاس می کھڑا ہو کر پہرہ دینے لگا۔ شاگو اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ والٹر اور شاکا کی لڑائی کا انجام دیکھنے جاتا ہے اور والٹر کی مدد کرتا ہے۔ اِس عرصے میں جان راکٹ کے کُل پُرزوں کو چیک کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

دراصل وہ بڑی بھیانک جنگ تھی جو اِس واقعہ کے بعد لڑی گئی۔ میں راکٹ کے بُلند دروازے پر کھڑا ہوا لڑائی کا خوفناک منظر دیکھ رہا تھا۔ والٹر اور شاکا اب بُری طرح ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھ

میں لہر دار خنجر تھے اور دونوں ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔ بغاوت شروع ہو گئی تھی۔ شاکا اور والٹر کے حامیوں میں بھی اب جنگ چھڑ گئی تھی۔ صرف شاکا اور والٹر عام انسانوں جیسے قد کے تھے۔ لیکن اُن کے حامی اُسی دیوزاد قد کے تھے۔ مُجھے ہر لمحہ یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ دیوزاد راکٹ کی طرف نہ آ جائیں؟ راکٹ اُن کے لیے ایک کھلونے جیسا تھا اور وہ اُسے اپنے ایک ہاتھ کی جُنبش ہی سے ٹکرے ٹکرے کر سکتے تھے۔ شاگو بھی اب چند لوگوں سے لڑنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ہمارے راکٹ کو بچانے کی خاطر اب اُس نے، خامن اور اُس کے ساتھیوں نے بھی اپنے قد بڑے کر لیے تھے اور لڑتے لڑتے وہ ہمارے راکٹ کی حفاظت کی خاطر اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک زبردست شور سُنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ شاکا اور والٹر ایک دوسرے سے گتھّے ہوئے تھے اور جب وہ الگ ہوئے تو میں نے شاکا کو لڑکھڑاتے ہوتے اپنا سینہ پکڑ کر نیچے

گِرتے دیکھا۔ شاید وہ دونوں آپس میں کافی دیر سے لڑ رہے تھے اور اس لڑائی کا انجام یہ تھا کہ شاکا اپنے کیے کی سزا کو پہنچا تھا۔ والٹر کے خنجر سے خُون ٹپک رہا تھا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین سے اُٹھ رہا تھا۔ شاکا سے اُس نے اتنی زور آزمائی کی تھی کہ غالباً وہ تھک گیا تھا۔ اِس تھکن کے باعث وہ فوراً ہی پھر لڑکھڑایا اور بے ہوش ہو کر نیچے گِر گیا۔ اسٹیڈیم کے اب سب ہی لوگ کود پڑے تھے اور لڑائی میں حصّہ لینے لگے تھے۔ شاگو نے جب یہ نازک صورتِ حال دیکھی تو اُس نے والٹر کو چٹکی سے اُٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پھر راکٹ کی طرف بڑھا۔ چوں کہ اُس کا قد اِس وقت چھوٹا نہیں تھا لٰہذا وہ جلد ہی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ شاکا کے حامیوں نے یہ دیکھ کر راکٹ پر حملہ کرنا چاہا اور جیسے ہی وہ آگے بڑھے جیک نے اسٹین گن چلانی شروع کر دی۔ پھر تو یُوں لگا گویا بڑے بڑے پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر گِر رہے ہیں۔ چیخ و پکار سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ شاگو اب راکٹ کے پاس آ گیا

تھا۔ سیڑھی کے اوپر بنے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچ کر اُس نے اپنی ہتھیلی پھیلادی اور پھر میں نے سوامی کی مدد سے بے ہوش والٹر کو اندر کھینچ لیا۔ زبردست شور و غُل کے درمیان شاگو نے جلدی جلدی جان سے کہا۔

"میری مبارکباد قبول کیجئے مسٹر جان۔ مُجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ آپ کو یہاں پر مُصیبت اور تکلیفیں ہی اُٹھانی پڑیں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ اب میں آپ سے جُدا ہو رہا ہوں۔ شاکا مر چُکا ہے اور اِس کے بعد میں ہی یہاں کی حکومت سنبھالوں گا۔ آپ کو سُن کر خُوشی ہوگی کہ بغاوت کامیاب ہو چُکی ہے۔"

"میری مبارکباد بھی قبول کرو شاگو۔" جان نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

شاگو اِس وقت بہت خوفناک اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ ہم لوگوں نے کافی

عرصے کے بعد اُسے اُس کے صحیح قد اور صورت میں دیکھا تھا۔ نجمہ اور زرینہ تو گھبرا کر دور ہٹ گئیں تھیں، البتّہ جان اس سے کافی دیر تک گفت گو کرتا رہا تھا۔ جان اِس بات کے حق میں نہیں تھا کہ شاگو کو اِس مُشکل میں چھوڑ کر ہم دُنیا کی طرف پرواز کریں۔ لیکن شاگو کا اصرار تھا کہ ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ اُس نے جلدی سے جیک اور امجد کو بھی چٹکی میں پکڑ کر راکٹ کے اندر چھوڑ دیا اور اختر سے کہا کہ وہ انجن اسٹارٹ کر دے۔ میں نے کُچھ کہنا چاہا بھی مگر اُس نے ایک نہ سُنی۔ سیڑھی اوپر اٹھا کر اُس نے دروازہ بھی خود ہی بند کر دیا۔

راکٹ کے انجن اسٹارٹ ہو چکے تھے۔ اختر اور سوامی کنٹرول روم میں بیٹھے ہوتے تھے۔ چند ہی لمحے بعد راکٹ بُلند ہونا شروع ہوا۔ کھڑکیوں میں سے ہم نے دیکھا کہ کُچھ زہروی لوگ غُصّے میں بپھرے ہوتے ہمارے راکٹ کو مُکّے دکھا رہے تھے اور شاگو گردن اوپر کیے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں

الوداع کہہ رہا تھا۔ زہرہ کی کشش کے باعث ہمارے جسم کی رگیں بھنچ رہی تھیں۔ راکٹ زبردست رفتار سے اوپر اُٹھ رہا تھا اوپر اور اوپر اور اوپر اور پھر آخر کار وہ خلا میں پہنچ گیا۔

وژن اسکرین پر ہمیں سیّارہ زہرہ آہستہ آہستہ دور ہوتا ہوا دِکھائی دے رہا تھا۔ میں خُدا سے دُعا مانگ رہا تھا کہ وہ اب ہمیں صحیح سلامت زمین پر پہنچا دے۔ جیک مُجھ سے کہہ رہا تھا کہ والٹر نے عین موقع پر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ خلائی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

اچانک والٹر کا نام ذہن میں آتے ہی میں چونک گیا۔ "اُفوہ! کتنی زبردست بھول ہوئی۔ والٹر تو یہیں ہمارے راکٹ میں موجود ہے اور ہم اِسے پرواز سے پہلے نیچے اُتارنا ہی بھول گئے۔" میں نے چلّا کر جان کو یہ بات بتائی اور وہ بھی گھبرا کر اُس جگہ پہنچا جہاں والٹر لیٹا ہوا تھا اور نجمہ و زرینہ اُس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ اب اُسے آہستہ آہستہ ہوش آتا جا رہا تھا۔ اور

آنکھیں کھول کر وہ ہمیں حیرت اور تعجّب سے دیکھ رہا تھا۔ "میں۔۔۔ میں کہاں ہوں؟"

"تُم راکٹ میں ہو والٹر اور راکٹ اب زمین کی طرف جا رہا ہے۔" جان نے کہا۔ "مُجھے افسوس ہے کہ تمہیں عین وقت پر ہم تمہیں نیچے اُتارنا بھول گیئے۔"

"خُدا کا شکر ہے۔" والٹر کرّاہا۔ "میں اِس سرزمین پر نہیں مرنا چاہتا تھا۔"

"کیا کہتے ہو۔ تُم بھلا کس طرح مر سکتے ہو۔ تُم نے شا کا کو مار ڈالا ہے۔ والٹر تُم ہمارے محسن ہو۔"

والٹر پھیکی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "ہاں میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔ مگر مگر میں کبھی۔۔۔"

اس نے اتنا کہہ کر اپنے پہلو پر رکھا ہوا ہاتھ ہٹایا۔ اف میرے خُدا۔ والٹر خود

بھی زخمی تھا۔ شاید شاکا کا خنجر اُس کے پہلو میں بھی پیوست ہو چکا تھا!

"یہ کیا ہوا والٹر۔ ٹھہرو میں ابھی تمہاری پٹّی کرتا ہوں۔"

جان اُٹھنے لگا۔ لیکن والٹر نے اُس کو ہاتھ پکڑ کر بِٹھا لیا اور پھر کمزور سی آواز میں بولا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ تُم مت جاؤ۔ مُجھے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے دو۔ جان میں نے تُم سب کو بہت دُکھ پہنچایا ہے۔ مُجھے کہنے دو کہ مُجھے تُم سے بڑی نفرت تھی۔ اتنی زبردست نفرت کہ میں تمہیں اور تمہاری دُنیا کو تباہ کر دینا چاہتا تھا۔"

"ہاں، ہاں میں جانتا ہوں۔ مگر تُم اِن باتوں کو بھول جاؤ۔" جان نے جلدی سے کہا۔

"کیسے بھول سکتا ہوں؟ میرا ضمیر مُجھے ملامت کر رہا ہے۔ تُم نے مُجھ پر

بڑے احسان کیے ہیں۔ کئی مرتبہ مُجھے مرتے مرتے بچایا ہے۔ میں۔۔۔ میں یہ احسان اتارنا چاہتا تھی مسٹر جان۔ میں نے یہ ارادہ اسی وقت کرلیا تھا جب کہ ہم سب نیلی دُنیا میں پہاڑ کی چوٹی پر تھے۔ اِسی لیے میں نے اپنی قوم اور اپنی دُنیا سے غدّاری کی ہے۔ اور مُجھے اِس پر ذرا سی بھی شرمندگی نہیں ہے۔"

"تم زیادہ مت بولو۔ پہلے ہی خون کافی نکل چکا ہے۔" میں نے اُس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"مُجھے بالکل شرمندگی نہیں ہے۔" اُس نے میری بات پر توجّہ نہ دیتے ہوئے پھر کہا۔ "میں نے یہ غدّاری اِس لیے کی ہے کہ میری قوم خود انسان بننا چاہتی تھی اور انسانوں کے بڑے حربے استعمال کرنے لگی تھی۔ میں اِس لیے غدّار بن گیا ہوں کہ میری دُنیا میں امن و محبّت اور صلح و وفاداری کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہاں اِن جذبوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔ طاقت ور

کمزوروں کو دبا لیتے ہیں اور اور کم زور پِس کر رہ جاتے ہیں۔۔۔۔ نہیں مُجھے روکو مت، بولنے دو۔۔۔ وہاں طاقت کا راج ہے اور ظُلم کی حکومت۔ میں ایسی دُنیا اور ایسی قوم پر لعنت بھیجتا ہوں جو دوسروں سے نفرت کرنا سکھاتے اور محبّت کا جواب محبّت سے نہ دے۔۔۔۔"

اُس کی سانس اُکھڑنے لگی تھی اور وہ بار بار روژن اسکرین کو دیکھ رہا تھا جہاں سیّارہ زہرہ اب ایک بڑی گیند کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ نجمہ اور زرینہ کے چہرے ستے ہوئے تھے اور اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ والٹر نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"خود مُجھے بھی یہ علم نہیں تھا کہ محبّت کِسے کہتے ہیں۔ میں تو صرف نفرت کرنا جانتا تھا۔ میں آپ سب کا مخالف تھا۔ آپ کے خون کا پیاسا تھا۔ اِسی لیے میں آپ کی زمین پر گیا تھا کہ وہاں جا کہ آپ سے بدلا لوں۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ آپ کی زمین بھی اُسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے جو زہرہ کی

دُنیا میں ہے۔ وہاں بھی انسان انسان کے دُشمن ہیں۔ اپنے ہی جیسے بھائیوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ روزانہ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ طاقت ور مُلک بموں کی بوچھاڑ سے زمین کا سینہ چھلنی کرتے رہتے ہیں وہ۔۔۔ وہ انسان نہیں بلکہ شیطان کے چیلے ہیں۔ میں نے سوچا کہ پھر زمین کے رہنے والوں اور زہرہ کے باسیوں میں کیا فرق ہے؟ کیوں نہ زمین پر بھی زہرہ کی حکومت قائم کردی جائے؟"

"والٹر۔۔۔ خُدا کے لیے خاموش رہو اور مُجھے زخم کو دیکھنے دو۔" جان نے بِلبِلا کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ اب بہت دیر ہو گئی ہے۔" والٹر کراہنے لگا۔ "میں نے اِسی خیال سے آپ کی دُنیا کو تباہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ میں اِس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر عین وقت پر مُجھے یعنی کوراک کو محبّت نے مغلوب کر دیا۔ مُجھے سب انسانوں سے نفرت تھی۔ مگر میں نے آپ جیسے شریف اور

بہادر انسان بھی دیکھے۔ آپ جیسی اچھّی طبیعت کے لوگ بھی دیکھے۔ آپ نے میرا دِل جیت لیا۔ آپ کی محبّت اور شرافت نے میرے ظُلم کو دبا دیا مسٹر جان۔ میری کایا پلٹ ہو گئی۔ مُجھے اپنی قوم سے نفرت ہو گئی اور اور فیروز کے لڑکے اختر سے اُنس ہو گیا۔۔۔"

والٹر کی باتیں سُننے کے لیے اختر بھی کنٹرول روم سے اُٹھ کر ہمارے ہی پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"ایسا بہادر۔۔۔" والٹر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسا بہادر اور نڈر لڑکا جو اپنی دُنیا کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جائے صرف دُنیا کے شریف انسانوں میں ہی مل سکتا ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں ایسے لڑکے کو سلام کرتا ہوں اور گزارش کرتا ہوں کہ مُجھے۔۔۔ مُجھے اپنی دُنیا کی مٹّی ہی میں دبا دیجیئے گا تاکہ۔۔۔ تاکہ مرنے کے بعد بھی میں اِسی مٹّی کے سینے سے لگا رہوں جس میں وفا اور محبّت کی خوشبو

رچی ہوئی ہے۔۔۔۔“

اتنا کہنے کے بعد والٹر کی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے دُور ہو گیا۔۔۔۔ دو ہفتے گزر گئے۔

ہمارا راکٹ زمین کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے ہوتے تھے۔ جان مُونہہ ہی مُونہہ میں والٹر کی لاش کو دیکھ کر بڑبڑا رہا تھا۔ اُس کی یہ بڑبڑاہٹ ہمیں صاف سُنائی دے رہی تھی۔

”میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا والٹر۔۔۔ میں تمہیں اپنی دُنیا کی مٹّی میں دفن کروں گا۔ اُس خاک میں جس سے تُم محبّت کرتے ہو۔ تمہارے سینے پر رکھی ہوئی خاک میں سے پھر ایک پودا اُبھرے گا۔ تمہاری محبّت ووفا کا پودا۔۔۔ تمہاری قربانی اور خلوص کا پودا۔ اُس پودے میں پھول کھلیں گے۔ امن و محبّت کے پھول۔ کاش! اِن پھولوں کی خوشبو دُنیا کے ایک ایک گوشے میں پھیل جائے اور پھر فضاؤں میں اُڑتی اُڑتی زہرہ کے لوگوں

تک بھی پہنچ جائے تاکہ وہ لوگ بھی محبّت کے نام سے واقف ہو سکیں۔"

اچانک جیک نے چلّا کر یہ خوش خبری سُنائی کہ راکٹ زمین کی فضا میں داخل ہو چُکا ہے۔ یہ سُن کر جان نے اپنے آنسوؤں کے ہار والٹر کے مُردہ جسم پر چڑھاتے ہوئے اُس کا چہرہ وژن اسکرین کی طرف موڑ دیا۔

وژن اسکرین پر ایک نیلی اور سبز گیند آہستہ آہستہ بڑی ہوتی ہوئی دِکھائی دے رہی تھی! بلاشُبہ یہ ہماری زمین تھی!

اور مُردہ والٹر کی ساکت اور بے نور آنکھیں زمین کو حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

ختم شد